خطباتِ حکیم الامّت

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۳۱

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارہ تالیفات اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

رحمتِ دو عالم
صلی اللہ علیہ وسلم

تاریخ اشاعت.................ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

ناشر...........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ رشیدیہ.......راجہ بازار.......راولپنڈی

ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار.......پشاور

مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.......لاہور — ادارۃ الانور.........نیو ٹاؤن.......کراچی نمبر 5

مکتبہ رحمانیہ.......اردو بازار .... لاہور — مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ..........بلاک زیڈ........مدینہ ٹاؤن.......جھنگ موڑ........فیصل آباد

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۳۱ ”رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم“
جدید اشاعت سے مزین آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی
عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج
ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد
محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا
اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا
کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
آخر میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے تین نایاب مواعظ
جو اس سے پہلے طبع نہیں ہوئے شامل کر دیئے گئے ہیں۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق اپریل 2008ء

اجمالی فہرست

الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

وعظ.... فضائل العلم والخشية.... ۲۸۶

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

وعظ.... ملت ابراهيم عليه السلام.... ۳۴۶

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

پہلا وعظ..... ۴۱۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾

دوسرا وعظ..... ۴۱۷

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿۷﴾ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ﴿۸﴾ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾

تیسرا وعظ..... ۴۲۲

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱﴾

فہرست عنوانات

اَلرَّحْمَۃ علیٰ الامۃ

مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں ۹ ربیع الاول ۱۳۳۵
ہجری کو بیٹھ کر اور کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو کل ۳ گھنٹے جاری رہا۔ وعظ تقریباً
ایک سو افراد نے سنا جبکہ مولوی عبدالکریم صاحبؒ متھلی نے اسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

فبما رحمة من اللّٰہ لنت لھم ولو کنت فظاغلیظ القلب لا نفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفرلھم وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ ان اللّٰہ یحب المتوکلین ○

(آل عمران' آیت:۱۹۵.....۱۹۰؛)

ترجمہ: ''یعنی بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے تو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔''

حضرات صحابہ کرامؓ سے خصوصی برتاؤ کا حکم

اس آیت مقدسہ میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو امر کیا گیا ہے اپنے خادموں یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ بعض معاملات میں خاص برتاؤ کا۔ یہ تو خلاصہ آیت کا ہے اور وجہ اس مضمون کے اختیار کرنے کی یہ ہے کہ بعض مہمانوں نے درخواست کی تھی وعظ کی اور خیال تھا کہ اس سے قبل وعظ میں جس آیت کا بیان ہوا تھا یعنی ''قد جاء کم من اللّٰہ

نور و کتاب مبین یهدی به اللّٰہ من اتبع رضوانه سبل السلام ویخرجهم من الظلمت الی النور "(یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشنی آئی ہے اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں)۔ اسی کا اس وقت بھی بیان کرنا جس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہادی کامل ہونا بیان کیا گیا ہے کیونکہ پہلے بیان میں تمہید ہی اتنی طویل ہوگئی تھی کہ اصل مقصود مختصراً بیان ہوا اور خیال تھا کہ کسی موقع پر اس کو دوبارہ بیان کردوں گا کیونکہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بیان کرنے کو خود ہی جی چاہتا ہے۔

حقیقت ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہم لوگوں پر مخالفین کی ایک نہایت سخت درجہ کی تہمت یہ ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کرتے بلکہ غضب یہ ہے کہ وہ لوگ ہم کو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر اور مخالف کہتے ہیں مگر وہ معترضین دراصل ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نہیں جانتے اس لیے اول میں ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بتلاتا ہوں اس کے بعد معلوم ہوجاوے گا کہ یہ تہمت کس درجہ کی ہے اور جو شخص حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد بھی اس بیجا اعتراض سے باز نہ آوے تو اس کا تو ذکر ہی نہیں کیونکہ وہ معاند ہے جس کا کچھ علاج نہیں۔ باقی اہل فہم و انصاف بخوبی واقف ہوجاویں گے۔ یہ اعتراض محض عناد کی وجہ سے بدنام کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترکیب یعنی ذکر کی اضافت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خود صراحۃً بتلا رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپ کے رسول ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیے جیسا کہ بادشاہ کی سوانح میں دو قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسے حالات جو بادشاہی سے تعلق رکھتے ہوں دوسرے وہ حالات جو سب انسانوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً اس کا تذکرہ کہ فلاں اقلیم میں فلاں شہر میں فلاں جگہ پیدا ہوا اور پیدائش کے وقت یہ واقعات پیش آئے اور اس کا جسم ایسا تھا' رنگ ایسا تھا یا اس کا طویل القامت وغیرہ ہونا میں یہ نہیں کہتا کہ یہ باتیں قابل بیان کے نہیں ہیں لیکن اتنا دراز قد ضرور ہے کہ ان کا بیان فی

نفسہ سوانح شاہی کا مقصود نہیں۔ لہٰذا اس قسم کے واقعات کا بیان استطراداً کیا جاوے گا
کیونکہ سراپا بیان کرنے سے ظاہری حسن تو معلوم ہو جاوے گا لیکن اس سے اس کا بادشاہ ہونا
اور یہ کہ کس درجہ کا بادشاہ تھا ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ نفس پیدائش اور حسن وغیرہ بادشاہ ہی کے
ساتھ مخصوص نہیں۔ بادشاہی کے لائق تو یہ باتیں تھیں کہ اس نے اس طریق سے انتظام کیا
ایسے منصف تھا' بڑا رحم دل تھا' رعایا کی خبرگیری کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ حالات اصل ہیں
سوانح شاہی کے اگر کسی سوانح میں یہ حالات نہ ہوں تو وہ شاہی سوانح نہیں۔ اس مقام پر
میں خواص کو خصوصیت سے متنبہ کرتا ہوں کہ آج کل سوانح عمریاں لکھنے کا لوگوں کو بہت شوق
ہو گیا ہے اور جو سوانح عمریاں آج کل لکھی گئی ہیں ان کے سامنے پرانی سوانح عمریاں ہیچ سمجھی
جاتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل لوگوں کا مذاق خراب ہو گیا ہے اور اپنے اسی فاسد
مذاق کے مطابق انتخاب کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پیشتر تو انتخاب میں
شگفتہ کلامی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اول تو ہم کو یہی تسلیم نہیں کہ متقدمین کا کلام شگفتہ نہیں۔

نئے رنگ کے مصنفین کی تصانیف

دوسرے یہ معیار ہی کیا ہے۔ اصل معیار معنی اور مضامین کی خوبی ہے مگر اس کو اہل فہم ہی
سمجھ سکتے ہیں۔ نادان تو فقط الفاظ کو دیکھ کر واہ واہ کرنے لگتے ہیں اسی لیے میں نے خواص کو
خطاب میں خصوصیت سے متنبہ کیا ہے کیونکہ وہ فیصلہ کے معیار کو سمجھ سکتے ہیں اور عوام اس
معیار کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے اگر وہ ایسی سوانح عمری کو جو شگفتہ عبارت میں لکھی گئی ہو پسند
کر لیں تو زیادہ تعجب نہیں مگر حیرت یہ ہے کہ خواص بھی آج کل ایسی ہی سوانح عمریوں کی
تعریف کرتے ہیں حالانکہ بدون حسن معنوی کے تعریف کرنا اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو
خمیرہ مرواریدی ہو جو نہایت عمدہ بنا ہوا ہو اور اعلیٰ درجہ کے نفیس نفیس اجزاء رکھتا ہو مگر اس کو سیاہ
ڈبہ میں رکھ دیا جاوے اور دوسرا خمیرہ جو بچوں کے بہلانے کے لیے گڑ گھول کر بنا لیا ہے اور
اس کا بھی خمیرہ نام رکھ دیا ہے سفید اور شفاف بوتل میں رکھ دیا جاوے تو اب دو قسم کے لوگ
ہیں عاقل اور جاہل۔ عاقل دو دونوں کو کھول کر دیکھے گا اور جانچ پڑتال کے بعد خمیرہ مرواریدی
کو لے گا اور جاہل جھٹ پٹ چمکتی ہوئی بوتل کو پسند کر لے گا۔ بس اسی طرح اس نئے رنگ
کے مصنفین کی کتابوں میں عبارتیں تو چٹ پٹی ہیں مگر اندر سے خالی ڈھول کہ مضامین خاک

بھی نہیں اور متقدمین کی کتابوں میں مغز ہے روح ہے اس لیے باوجود حال کی سوانح عمریوں کو شگفتہ تسلیم کر لینے کے بھی وہ حقیقت میں قابل ترجیح نہیں اور لفظ پرستوں کی رائے اس باب میں معتبر نہیں اور نیز یہ بات بھی ہے کہ متقدمین کی کتابیں پہلے زمانہ میں اس وقت کے محاورہ کے اعتبار سے شگفتہ بھی تھیں جس کو آج کل معیار ترجیح قرار دیا گیا ہے لیکن محاورہ بدل جانے کے باعث اس وقت اس کی شگفتگی میں فرق آ گیا ہے اور اس میں ان کی ہی کیا خصوصیت ہے اب سے پچاس سال کے بعد یہ موجودہ سوانح عمریاں بھی شگفتہ نہ رہیں گی اور جس طرح اہل فہم ان کو بوجہ حقیقی خوبی کے مفقود ہونے کے پسند نہیں کرتے اسی طرح اس وقت ظاہر بینوں کی نظر سے بھی شگفتگی فوت ہو جانے کے سبب سے یہ کتابیں گر جاویں گی کیونکہ آج کل ہر چیز کو ترقی ہے تو زبان کو بھی ترقی ہے ہر سال اس کی شگفتگی میں نیا اضافہ ہوتا ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ عبارت آرائی کوئی حسن نہیں جو اس معیار کو ترجیح قرار دیا جاوے وہ حسن ہی کیا حسن ہے جو کہ مرور دہور سے بدل جاوے بلکہ اصل چیز معنوی خوبی ہے جس کی شان یہ ہوتی ہے:

خود قوی ترمیشود خمر کہن　　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئی ہو)

قدیم ہونا کوئی عیب نہیں

کمالات معنویہ مرور دہور سے اور زیادہ قوت اور تاثیر آ جاتی ہے وہ جس قدر بھی پرانے ہوں اسی قدر لطافت بڑھتی جاتی ہے کیونکہ روز بروز اس کی خوبیوں پر اطلاع میں ترقی ہوتی رہتی ہے مگر آج کل جدت پسندی کا مذاق ایسا غالب ہوا ہے کہ کسی چیز کا پرانا اور قدیم ہونا ہی اب مستقل عیب شمار کیا جاتا ہے گو اور کوئی عیب بھی نہ ہو لیکن اگر قدیم ہونا ہی عیب ہے تو پھر اس پرانے زمین و آسمان کو چھوڑ دو کسی نئی زمین پر نئے آسمان کے نیچے جا کر آباد ہو۔ ہمارے ایک استاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سب سے قدیم ہیں کہ اصلی قدیم وہی ہیں تو جو لوگ جدت کو کمال اور قدیم کو نقص کہتے ہیں ایسے بیہودہ مذاق والوں کو چاہیے کہ (نعوذ باللہ منہ) میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں) اللہ تعالیٰ کو بھی چھوڑ دیں۔ خدا کی پناہ دیکھئے اس جدت پسندی سے کیا

نتیجہ لازم آتا ہے بلکہ صحیح نظر سے دیکھا جاوے تو قدیم ہونا زیادہ مقبول ہونے کا سبب ہے کیونکہ ایک زمانہ تک اس سے انتفاع کا تجربہ ہو چکا ہے۔ دیکھو آسمان کتنا پرانا ہو گیا ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "فارجع البصر هل ترىٰ من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا وهو حسير" (یعنی نگاہ پلٹا کر دیکھو کیا تم کو کچھ سوراخ نظر آتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ کو پلٹو بالآخر وہ عاجز و درماندہ ہو کر لوٹے گی اور کوئی تم کو نظر نہ آئے گا)

اسی طرح جس مکان میں ابھی تازہ ڈاٹ لگائی گئی ہو اس میں شروع شروع میں خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ڈاٹ کمزور نہ ہو اوپر سے نہ آپڑے اور جب عرصہ تک اس کے اوپر آدمی چل پھر لیے ہوں اور زمانہ دراز تک مکان آباد رہ چکا ہو پھر خطرہ نہیں رہتا کیونکہ تجربہ سے اس کا استحکام معلوم ہو چکا ہے اور کوئی عارضی آفت پیش آجائے اور بات ہے پر قدیم ہونا تو نہایت مستحکم ہونے کی دلیل ہے اس لیے لازم ہے کہ متقدمین کی کتابوں کو دیکھا جائے اور محاورہ بدل جانے کی طرف بالکل التفات نہ کریں بلکہ معانی کو دیکھیں۔ گو خود اہل کمال کی کتابوں میں بھی فرق ہوتا ہے کہ معنوی خوبی کے باعث ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے اگر باہم اہل کمال کی کتابوں میں ایک کا دوسرے سے مقابلہ کیا جاوے تو مضائقہ نہ تھا مگر جہلاء کی تصنیف سے اہل کمال کی تصنیف کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حیرت ہے افسوس آج کل کس قدر مذاق بگڑ گیا ہے۔

شان ملکیت شان نبوت کے تابع ہے

آج کل جدید سوانح عمریوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شان ملکیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ یعنی آپ بادشاہ اعلیٰ درجہ کے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح وہ ہے جس میں شان رسالت کا بیان ہو اور گو آپ میں دونوں شانیں تھیں، نبوت کی بھی، سلطنت کی بھی مگر شان رسالت اصل ہے اور شان سلطنت تابع اور منصب نبوت کی تکمیل ہے کیونکہ اصلاح خلق میں جو کہ منصب نبوت ہے لوگوں کے مزاحم ہونے کی بھی نوبت آجاتی ہے ایسے لوگوں کو زیر کرنے کے لیے سلطنت بھی ضروری ہے۔ پس سلطنت تابع ہوئی مگر یہ لوگ اصل چیز یعنی نبوت کے بیان کو چھوڑ کر سلطنت کے بیان کو لے بیٹھتے ہیں جو کہ تابع ہے آج کل کی سوانح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بادشاہی تو ملے گی مگر کمالات نبوت کے

ذکر کے اہتمام سے خالی ملیں گی۔ حتیٰ کہ ان سوانح عمریوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک نہ ہو تو دیکھنے سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کسی نبی کی سوانح ہے۔ بھلا یہ سوانح نبویہ کس طرح کہلانے کی مستحق ہوسکتی ہیں جبکہ اصل کمالات کے ذکر ہی سے عاری ہیں (بلکہ غور کیا جاوے تو یہ سوانح تو تابع کے بیان سے بھی کوری ہیں کیونکہ درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کا بیان تو اس کو کہا جاوے گا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو جبھی تو وہ سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ہوگی مگر جب ان میں اس حیثیت کی رعایت نہیں کی گئی تو محض ایک بادشاہ کی بادشاہی کا بیان ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سلطنت کا تذکرہ نہ ہوا۔ (۱۲ جامع)

الفاروق علامہ شبلی کے بارے میں

اسی طرح الفاروق وغیرہ کتابیں بھی اصلی معنی میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح نہیں کیونکہ اصل میں خلافت فرع ہے نبوت کی۔ پس یہاں بھی دین اصل اور سلطنت تابع ہونا چاہیے لیکن الفاروق وغیرہ جو لکھی گئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنی فتوحات کیں اس طرح لشکر کا ملک کا انتظام کیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان حضرات کے ہاتھ سے یہ امور سرانجام نہ ہوتے تو وہ حضرات صاحب کمال کہلانے کے مستحق نہ تھے حالانکہ شجاعت و انتظام و فتوحات ملکی وغیرہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اصلی کمالات نہیں تھے۔

حضرات خلفائے راشدینؓ کے اصل کمالات

اصل کمال وہ ہے جس کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "لو کان بعدی نبی لکان عمرؓ"[1] اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ اصل کمال وہ ہے جس کے باعث فرمایا "ابوبکر فی الجنۃ و عمر فی الجنۃ"[2] (ابوبکر جنت میں ہیں اور عمرؓ جنت میں ہیں) اور یہ کمالات ان حضرات میں خلافت سے پہلے موجود تھے۔ خلیفہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئے۔ غرض اصل کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شان نبوت

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۶۸۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۰۳۵)
[2] (سنن ابی داؤد: ۴۶۵۰، سنن الترمذی: ۳۷۴۷)

ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جو مقصود اصلی ہے وہ ہے جو من حیث الرسول (رسول ہونے کے اعتبار سے) ہو۔ البتہ چونکہ محبوب کا ہر ذکر محبوب ہوتا ہے اس لیے آپ کے تمام حالات وکمالات کا ذکر بھی محبوب ہے مگر درجہ بدرجہ مثلاً رضاع وولادت وشق صدر وغیرہ واقعات کا ذکر بھی فی نفسہ محبوب ہے لیکن عطائے نبوت ونزول قرآن وغیرہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی جو اصلاح فرمائی ہے ان امور کا بیان زیادہ اہم اور زیادہ محبوب ہے کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ سے بھی اصل مقصود یہی ہے۔ پس جب ہم ان ذکروں کو برابر کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل شان کے مناسب ہیں تو پھر ہم کو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالی کس طرح کہا جاتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ ہم کو منکر ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے۔ (استغفر اللہ)

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

(جب حقیقت کا پتہ نہ چلا' ڈھکوسلوں پر اُتر آئے)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شان

حقیقت میں ان لوگوں نے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شان اصلاح ہے ان معاملات کی جو حق تعالیٰ اور اس کے بندوں میں ہیں اور ہم لوگ ان ہی کی توفیق سے رات دن قرآن وحدیث وفقہ کے چرچے میں رہتے ہیں جن میں اسی شان کا زیادہ ذکر ہے اور ہم ان ہی احکام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ سب ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ہے گو اس میں کبھی آپ کا نام مبارک بھی زبان پر نہ آوے کیونکہ ذکر کے واسطے نام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اس نام نہ لینے میں بھی ایک خاص شان ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف کی بابت حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: "انا انزلنه في ليلة القدر" (کہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے) یہاں قرآن کا نام نہیں لیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب بدون نام لیے ادھر ہی ذہن جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی بہت بڑی شان ہے۔ چنانچہ جب قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت مردہ سے سوال ہوگا کہ "ماكنت تقول في هذا الرجل...... رواه البخاري" (اس مرد کے بارے میں

کیا کہتا ہے اس کو بخاری نے روایت کیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لیا جاوے گا بلکہ اس طرح دریافت کریں گے کہ یہ شخص کون ہیں مسلمان جواب دے گا کہ "هو عبدالله و رسول الله" (وہ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں) (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ دیکھئے "فی هذا الرجل" (یہ شخص) کہنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذہن چلا جاوے گا اور بعض روایات میں جو اس کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آیا ہے وہ راوی کا قول ہے بیان کے لیے شراح نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ لام بیانیہ ہے۔ غرض ذکر صرف نام لینے ہی کو نہیں کہتے بلکہ بدون نام کے بھی ذکر ہوتا ہے۔ ہاں اس کا پتہ ہر شخص کو نہیں چلتا بلکہ اس کا پتہ عاشق کو لگتا ہے وہ خوب پہچانتا ہے۔ یہ عاشق ہی کی شان ہوتی ہے کہ اس کے علم کے لیے ہر وقت محبوب کا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر طرح پہچان لیتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے:

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست | یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(کہ ہر چیز کی طرف نظر کر کے دیکھا تو آپ ہی کی طرف نظر پہنچتی ہے)۔

اسی کو عارف جامیؒ فرماتے ہیں:

بس کہ جان فگار و چشم بیدارم توئی | ہر چہ پیدا میشود از دور پندارم توئی

(میری جان فگار اور چشم بیدار میں تو ہی بسا ہوا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں)

اور کسی نے اس مضمون کو اردو میں کہا ہے: ع جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی۔

کسی منکر نے حضرت عارف جامیؒ پر جب وہ ایک خاص حالت میں اس شعر کا تکرار فرما رہے تھے بطور اعتراض کے کہا کہ اگر خر پیدا شود فوراً اس کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا: پندارم توئی۔

ایک شعر کسی صاحب حال کا ہے:

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا | نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

کسی عاشق نے اس کو اس طرح بدلا:

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا | تیری ہی سی رنگت تیری ہی سے بو ہے

یہ بھی وہی مضمون ہے:

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست | یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے' غیر وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

ذکر کی دو قسمیں

خلاصہ یہ ہے کہ نصوص فضائل میں تو آپ کا ذکر ہی بیع وشرا کی آیات واحادیث و مسائل میں بھی آپ کا ذکر ہے کیونکہ ان سب کا تعلق وحی سے ہے اور وحی کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور وحی کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو یقیناً مستلزم ہے۔ گو صراحۃً نہ ہو اور یہ استلزام ایسا ہے جیسا کسی نے امام محمد سے کہا کہ تصوف میں آپ کی کوئی تصنیف نہیں۔ امام محمد کی نوسونناوے تصنیفات ہیں' ہزار میں ایک ہی کی کسر رہ گئی مگر مستقل طور پر معروف طریق سے تصوف میں کوئی تصنیف نہیں۔ اس سوال پر آپ نے فرمایا کہ جامع صغیر تصوف ہی تو ہے اس پر سوال کیا گیا کہ اس میں تو بیع وشرا وغیرہ معاملات کے مسائل ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ جب یہ معاملات درست نہ ہوں گے نفس میں وہ چیزیں پیدا ہوں گی جو تصوف میں مقصود ہیں۔ دیکھئے ان معاملات کو تصوف کہا گیا بوجہ استلزام کے احکام شرعیہ کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیوں نہ کہلائے گا اور مولانا رومیؒ تو اس سے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک زبان سے ایک بغیر زبان کے یعنی حال سے فرماتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشن تر است ۔۔۔۔ لیک عشق بے زباں روشن است

(اگرچہ زبان کا بیان روشن تر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ امور ذوقیہ ہے جس کو زبان سے اچھی طرح نہیں کیا جاسکتا)

جب خاموشی بھی دال ہے عشق پر تو نطق کیوں نہ دال ہوگا مگر آج کل لوگوں نے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طریقہ کے نطق میں منحصر کر رکھا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔

ہمیشہ ذکر میلاد

مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ ذکر میلاد نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں پھر کلمہ شریف پڑھ دیا اور فرمایا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے تو آپ کا کلمہ کون پڑھتا۔ یہ لوگ حقیقت شناس ہیں مگر لوگ

بے سوچے سمجھے اعتراض کر بیٹھتے ہیں اس نے پھر کہا کہ بلا واسطہ بھی تو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونا چاہیے' فرمایا لو وہ بھی ابھی کرتے ہیں اور یہ شعر پڑھ دیا:

تر ہوئی باران سے سوکھی زمیں   یعنی آئے رحمۃ للعالمین ﷺ

مطلب یہ کہ مولانا نے بلا قید رسوم کے ذکر کر کے دکھلا دیا۔ غرض ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حقیقت ہم الحمدللہ اس سے کسی وقت بھی خالی نہیں اور کبھی کبھی بلا واسطہ بھی رسوم و منکرات سے احتراز کر کے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر لیتے ہیں کیونکہ یہ بھی اعظم مستحبات سے ہے یہ گفتگو تو ان لوگوں سے تھی جو ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مطلقاً اس ذکر کا انکار کرے' گو منکرات سے خالی بھی ہو تو اس سے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی طرح محاجہ کیا جاوے گا۔

حکمت ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اس کا بھی واقعہ ہے کسی نے آپ سے کہا کہ ہم نے مانا کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچھا ہے مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جی ہاں نہ معلوم اللہ تعالیٰ کو مریم و ابن مریم علیہما السلام کے ذکر کی کیا ضرورت تھی اور موسیٰ علیہ السلام و ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کی کیا ضرورت تھی کہ قرآن شریف میں جا بجا نہایت تاکید و تکرار سے آیا ہے' ارشاد ہے:

"واذکر فی الکتب مریم واذکر فی الکتاب موسیٰ واذکر فی الکتب ابراھیم" (اور اس کتاب میں مریم علیہا السلام کا ذکر کیجئے اور اس کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجئے اور اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیجئے) کہ خود بھی ذکر فرماتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ذکر کا امر فرماتے ہیں۔ بتلاؤ اس کی کیا ضرورت تھی۔ بزرگوں کے کلام میں حکمتیں ہوتی ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح مصلحت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام و ابراہیم و موسیٰ علیہم السلام کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے اسی طرح بعض مصالح کی وجہ سے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کی بھی ضرورت ہے اور اس میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدا ہونا' بچہ ہونا' بڑھنا وغیرہ معلوم ہوگا تو اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الوہیت کا احتمال و وسوسہ پیدا نہ ہوگا۔ یہی

مصلحت قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کے ذکر میں بھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ سے اس طرح پیدا ہوئے تو ان کی الوہیت کا دعویٰ جو نصاریٰ کرتے ہیں وہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا بھی ذکر کرو تو ان حکمتوں کی وجہ سے کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے دودھ پیا پھر بڑے ہوئے کھاتے پیتے بھی تھے اور وفات بھی پائی۔ یہ سب حالات بتلا رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم الٰہ نہیں بلکہ بشر ہیں بس ان حالات ولادت وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اس سے نتائج نکالے جاویں۔ اس بناء پر اس کا مرجع بھی وہی شان نبوت ہوئی کیونکہ اصلاح عقیدہ کا تعلق منصب نبوت سے ہے۔ پس ایک مصلحت تو یہ ہے اور دوسری مصلحت عشاق کی ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بڑھے کیونکہ کمالات کے بیان سے محبت بڑھتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بچپن ہی سے عجیب عجیب کمالات تھے۔ چنانچہ آپ ایک چھاتی کا دودھ پیتے تھے اور دوسری کا اپنے رضاعی بھائی کے واسطے چھوڑ دیتے اس کو منہ نہ لگاتے تھے۔ اسی طرح ہر واقعہ میں ایک کمال ظاہر ہوتا ہے۔ غرض ان واقعات سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور محبت کی غرض اتباع ہے اس لیے اس کا مرجع بھی پھر وہی نبوت ہوا اور بدون اتباع کے نری محبت من حیث الذات نہ مطلوب نہ نافع۔ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابو طالب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنی محبت تھی اور گو ان کا ایمان دلائل سے ثابت نہیں مگر جب ان کا نام آتا ہے تو نام کے ساتھ حضرت کا لفظ منہ سے نکل ہی جاتا ہے کیونکہ وہ تو جاں نثار خادم تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانوروں کی بھی تعظیم کرتے ہیں وہ تو چچا ہیں اللہ معاف کرے اگر ان کو حضرت کہنے میں کوئی خرابی ہو۔ بہر حال جتنی محبت ان کو تھی اتنی محبت شاید بعض مسلمانوں میں بھی مشکل سے پائی جاتی ہو کیونکہ آج کل اکثر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے:

تو بیک زخمے گریزانی زعشق　　　تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

(تو ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتا ہے بجز نام کے عشق کی حقیقت سے ناواقف ہے)

گو ہم مومن ہیں لیکن ذرا سا امتحان آتا ہے تو نکل بھاگتے ہیں اور انہوں نے تو بڑے بڑے شدائد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور تکلیفیں اٹھائیں۔

حقوق العباد کی اہمیت

ہم لوگوں کے نکل بھاگنے کے متعلق ابھی کا تازہ واقعہ ہے جس کا قلق ساری عمر دل سے نہ اُترے گا کہ ایک شخص بیمار تھے' بیماری میں کبھی وہ خود مجھ کو بلاتے تھے کبھی میں خود جاتا تھا کیونکہ ان سے محبت تھی اور وہی محبت مقتضی ہوئی کہ جن حقوق العباد میں وہ مبتلا ہیں۔ ان سے ان کو نکالا جاوے اس لیے اول تو خود تحریراً کہا کیونکہ مجھ کو بالمواجہ نصیحت کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مخاطب کو اس سے طبعاً شرم آتی ہے اس کی شرم کے خیال سے مجھ کو بھی شرم آجاتی ہے۔ جیسا کہ صائب نے کہا ہے کہ بندش عجیب ہوتی ہے کسی نے امتحاناً ایک مصرعہ دیا کہ اس پر بند لگادو۔ مصرعہ یہ تھا:

بے زری کرد بمن انچہ بقاروں زر کرد

یعنی زرداری اور مالداری نے جو قارون کے ساتھ کیا تھا وہ میرے ساتھ بے زری اور فقیری نے کیا' واقعی بہت سخت بندش تھی کیونکہ زرداری تو قارون کے لیے سبب خسف ہوئی۔ اس وجہ سے کہ اس نے زکوٰۃ سے انکار کردیا تھا مگر بے زری وجہ خسف کیونکر ہوسکتی ہے کیونکہ بندش بہت دشوار تھی اس واسطے کسی صائب کے پاس پیش کیا کیونکہ وہ اس فن میں کامل تھا اس نے اس پر نہایت ہی عمدہ مصرعہ لگادیا:

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد　　بے زری کرد بمن آنچہ بقاروں زر کرد

یعنی ایک شریف سائل نے مجبوری میں مجھ سے سوال کیا اور میرے پاس کچھ دینے کو نہ تھا اس لیے جواب دیدیا جس سے وہ شرمندہ ہوا کہ مانگ کر ذلت بھی اٹھائی اور کام بھی نہ بنا تو اس کی شرمندگی سے میں شرمندہ ہو کر زمین میں دھنس گیا' بےنظیر مصرعہ ہے۔ غرض مجھ کو بھی بعض دفعہ مخاطب کی خجلت بالمواجہ سامنے شرمندہ ہونا خطاب کرنے سے مانع ہوجاتی ہے اور یہ حالت دواماً نہیں ہوتی بلکہ اختلاف احوال کی وجہ سے طبیعت کا رنگ مختلف ہوتا ہے کسی وقت تو مجھ پر یہ اثر ہوتا ہے اور کسی وقت کوئی خاص اثر غالب ہوتا ہے تو اس وقت بالمواجہ بھی نصیحت کرنا پڑتی ہے۔

بہرحال اس موقعہ پر اثر مانع ہی غالب تھا اس لیے میں نے تحریراً نصیحت کی اور رقعہ بھیج دیا پھر احتمال ہوا کہ شاید پڑھا نہ ہو اس لیے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ جا کر وہ رقعہ پڑھ

دؤ انہوں نے جا کر رقعہ پڑھا تو جواب یہ ملا کہ یہ تو سچ مگر اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑوں' اس معتمد نے کہا کہ یہ حقوق العباد ہیں ان کا کیا ہوگا' جواب دیا کہ خدا تعالیٰ معاف کر دے گا۔ اس پر اس معتمد نے کہا کہ حقوق العبد کے معاف کرنے کا وعدہ نہیں ہے بلکہ مواخذہ کی وعید آئی ہے پھر کیسے اطمینان معافی کا ہوسکتا ہے۔ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اہل حقوق سے معاف کرادیں گے اس پر جلسہ ختم ہوا۔ (جامع کہتا ہے کہ ان معتمد نے مجھ سے یہ بھی بیان کیا تھا کہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا تھا کہ واپسی حقوق کے لیے جس خرچ کی ضرورت ہو کیونکہ وہ حقوق موروثی زمین تھی اس سے استعفاء دینے میں کچھ خرچ ہوتا ہے۔ بشرط ضرورت میں وہ بھی دیدوں گا اس سے اس شخص کے ساتھ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں صاحبو! کیا خدا کا یہی ڈر ہے کہ یقینی معلوم ہے کہ مرنے والا ہوں مگر اہل وعیال کے لیے جائیداد چھوڑنے کی فکر اور وہ بھی غیروں کے حقوق سے دل سے نہیں نکلی اور عین اس حالت میں بھی خدا کا حکم سن کر خوف خدا نہ آیا اور میں رحمت کے بھروسہ پر معافی کی امید سے منع نہیں کرتا مگر سوال یہ ہے کہ بلا عذاب کے معافی کی کیا دلیل ہے اور اگر معاف ہوا بھی تو قیامت میں ارضاء خصم کے بعد ہوگا۔ برزخ میں تو محبوس اور معذب ہی رہے گا' آخر ان کا انتقال ہوگیا اور مجھ سے جنازہ کی نماز پڑھوائی گئی۔ مروت کی وجہ سے پڑھ تو دی مگر نماز پڑھنا مشکل ہوگیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں تشریف رکھتے تو اس شخص کی نماز ہرگز نہ پڑھتے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جس میت کے ذمہ قرض ہوتا اس کے بارے میں صحابہؓ سے فرما دیتے "صلوا علیٰ صاحبکم" یعنی اپنے ساتھی کی نماز تم ہی پڑھ لو۔ اس لیے دل تو نہ چاہتا تھا مگر زندوں کی خاطر سے نماز پڑھائی لیکن کیا عرض کروں باوجودیکہ مجھ کو عموماً ہر مؤمن کے واسطے جانب رجاء ومغفرت غالب ہوتی ہے مگر اس کے متعلق غالب گمان عذاب کا ہوتا تھا۔

ایک پاجی کی حکایت

اور مرتے ہوئے جو اس شخص نے رجاء عفو ومغفرت کا اظہار کیا ہے یہ رجاء ایسی تھی جیسے ایک شرابی کی حکایت ہے کہ اس نے عین نزع کی حالت میں شراب پی کر کہا تھا کہ لوگ مجھ کو

عذاب سے ڈراتے ہیں مگر مجھ کو تیری ذات سے اتنی امید ہے کہ شراب پی کر مرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ تو معاف کر دے گا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص رجاء اور امید کا اعلیٰ درجہ رکھتا تھا مگر دراصل وہ راجی نہ تھا بلکہ پاجی تھا۔ شیطان نے غلبہ رجاء کے پردہ میں جرأت اور گستاخی سکھا کر اس کی راہ ماردی۔ اللہ تعالیٰ سب آفات اور ہر قسم کے شیطانی ونفسانی دھوکوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین ثم آمین) رجاء تو حسب تصریح اکابر اس کو کہتے ہیں کہ جس طرح کسان کھیت میں دانہ ڈال کر اُمید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بارآور کرے گا اور خود ہی برابر ہر قسم کی خدمت کرتا رہتا ہے' کچھ تو کرو جس کی بناء پر امید کرتے ہو۔ اگر حتیٰ المقدور کوشش کی اور پھر بھی نہ ہو سکا یا کچھ کوتاہی ہوگئی تو امید عفو ہے۔ جیسا کہ باوجود عزم کے فوت شدہ نمازوں کی قضا کا وقت نہ ملا تو استغفار واعتذار معافی کی امید ہو سکتی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ ظالم کو وقت ملا اور نیت تک بھی نہ کی۔ جب میں اس شخص کے جوابوں کا جس سے اس کی کمال جرأت ثابت ہوتی ہے تصور کرتا ہوں تو مجھے سخت وحشت ہوتی ہے کسی طرح جی نہیں گواہی دیتا کہ بدون مواخذہ اس کی مغفرت ہوگئی ہو۔ "الامر بید اللّٰہ" (معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے)۔ بس دیکھ لیا آپ نے کہ چار بیگھہ زمین کے واسطے سارا عشق ختم ہوگیا۔ یہ محبت کس کام کی کہ زبانی باتیں بنانے کو سب سے آگے مگر اتباع سے جان چراتے ہیں' ان کا کیا منہ ہے کہ اپنے کو محبین میں شمار کریں یہ تو مدعیان محبت کی حالت کا بیان تھا جو صرف بیان سوانح نبویہ کو ادائے حق محبت کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور اتباع کے نام سے صفر۔

اسی طرح ایک درجہ میں ایسے لوگ بھی خطا پر ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوری طرح محبت نہیں کرتے' نری ضابطہ کے اتباع کو کافی سمجھتے ہیں مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ اہل اتباع ناجی تو ہیں اور جو اتباع نہ کرے ویسے ہی محبت کا دم بھرے وہ ناجی بھی نہیں یعنی جتنی کمی اتباع میں ہے اتنی ہی کمی نجات میں۔ جیسا کہ ابوطالب کی بابت سب کو معلوم ہے کہ کس قدر جاں نثار تھے۔ جب تمام قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مقاطعت کی یا آج کل کی اصطلاح میں بائیکاٹ کیا آج کل کے بائیکاٹ کو تو جو اس وقت ملک میں پھیل رہا ہے میں بھائیکاٹ کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ "رحماء علی الکفار اشداء بینھم"

(کافروں پر رحم دل ہیں آپس میں سنگدل) کا مصداق ہوتا ہے یعنی اس کی حقیقت یہ ہے کہ غیروں سے تو اتحاد کرو اور اپنے بھائیوں سے بغض وفساد کرو۔ قریش کے بائیکاٹ کا قصہ یہ ہوا تھا کہ قریش نے اتفاق کرلیا اور خانہ کعبہ پر عہد نامہ لٹکا دیا تھا جس پر عمائد کے دستخط تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ دینے والوں کے ساتھ کوئی معاملہ بیاہ شادی یا بیع وشرا کا نہ کیا جاوے اس موقع پر ابوطالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا' قریش کی کچھ پرواہ نہ کی وہ ایمان تو نہ لائے مگر ساتھ دیا پورا گو سخت پریشانی ہوئی مگر جاں نثاری میں مستقل رہے۔ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے چچا وہ عہد نامہ دیمک نے کھالیا' سوا اللہ کے نام کے اس میں کچھ نہیں رہا۔ ابوطالب نے قریش سے کہا میرا بھتیجا ایک خبر دیتا ہے وہ سن لو اور واقعہ کی تصدیق' تحقیق کرلو' سو اگر وہ صحیح نکلے تو کم از کم مقاطعت موقوف کردو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کیا۔

جب قریش نے اس عہد نامہ کو دیکھا تو واقعی دیمک نے کھالیا تھا اس پر مقاطعت ختم ہوگئی۔ دیکھئے ابوطالب کو کتنی محبت تھی' بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا ساتھ فی ہزار ایک مسلمان تو دے دے۔ بات یہ تھی کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص عشق تھا اور بے انتہا محبت تھی مگر باوجود اس کے ایمان نہیں لائے اور اتباع نہیں کیا اس لیے نجات کے لیے وہ محبت کافی نہ ہوئی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ابوطالب کو سب سے زیادہ ہلکا عذاب ہوگا جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ پاؤں میں آگ کی جوتیاں پہنائی جاویں گی اس کے باعث سر کھولتا ہوگا۔ ''اوکما قال'' (یا مثل اس کے کہا) اور وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ سب سے زیادہ میں ہی عذاب میں ہوں خیالی انتفاع بھی نہ ہوگا کیونکہ یہ معلوم کرکے بھی کہ مجھ کو اوروں سے کم عذاب ہے عذاب کے الم میں تخفیف ہوجاتی ہے مگر وہاں تو سب دوزخی یہی سمجھیں گے کہ ہم سب سے زیادہ تکلیف میں ہیں' تکلیف وراحت میں خیال کو بڑا دخل ہے۔ اگر کسی کی ہزار روپیہ تنخواہ ہو اور دوسرے کی 2 ہزار تنخواہ سن لے تو خوشی میں کمی آجاتی ہے اسی طرح اگر یہ سن لے کہ مجھ سے زیادہ کسی کی تنخواہ نہیں تو خوشی بڑھ جاتی ہے۔ گو اس کی تنخواہ ہزار روپیہ سے بھی کم ہو مگر وہاں ہر جنتی و دوزخی یہی سمجھے گا کہ سب سے زیادہ راحت یا عذاب مجھی کو ہے۔ ایک معقولی صاحب

نے درس حدیث میں اس پر کہا کہ کیا جنت میں جہل مرکب ہوگا کہ اپنے کو سب سے بڑا سمجھا
کہ حالانکہ ہے بہتوں سے کم مگر واقع میں وہاں جہل نہ ہوگا نہ مرکب نہ بسیط بلکہ سب کو صحیح
انکشاف ہوگا جہل مرکب تو جب لازم آئے کہ یوں نہ سمجھے کہ میں درجہ میں سب سے بڑا
ہوں باقی اپنے کو سب سے زیادہ راحت میں سمجھنا اس اعتقاد کو مستلزم نہیں کیونکہ یہ بھی تو ممکن
ہے کہ اپنے کو دوسروں سے درجہ میں کم سمجھے اور راحت میں زیادہ سمجھے۔

جنت میں ہر شخص کے مذاق واستقاد کے مطابق سامان دیا جائیگا

کیونکہ ہر شخص کو عیش اس کی حیثیت اور طبیعت واستعداد کے مناسب ہوتا ہے' کسی کو
ادنیٰ ہی چیز سے رغبت ہوتی ہے اعلیٰ سے نہیں ہوتی گو یہ بھی جانتا ہے کہ یہ ادنیٰ ہے یہ اعلیٰ
ہے مثلاً مجھ جیسے مذاق والے کو دال مرغوب ہے بہ نسبت قورمہ کے گو قورمہ کو اعتقاداً سب
سے اعلیٰ جانتا ہوں مگر بوجہ اپنے مذاق خاص کے دال سے رغبت زیادہ ہے کیونکہ ہماری
طبیعت کے موافق وہی ہے یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہمیں قورمہ کی حقیقت معلوم نہیں۔ بس اسی
طرح جنت میں ہر شخص کو اس کے مذاق واستعداد کے موافق سامان دیا جاوے گا۔ ادنیٰ درجہ
والوں کا مذاق بھی ادنیٰ ہوگا ان کو اس مذاق کی وجہ سے رغبت ہی ادنیٰ سامان کی طرف ہوگی۔
اس سے اعلیٰ کی طرف رغبت ہی نہ ہوگی۔ گو اس کے اعلیٰ ہونے کا علم بھی ہوگا۔ اس طرح
سے جنت میں ہر شخص اپنے کو سب سے زیادہ راحت میں سمجھے گا بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ
عجب نہیں جو لوگ جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں گے ان کو جنت میں جانے کے بعد خود
عذاب جہنم بھی شرط راحت معلوم ہو۔ وجہ یہ کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ راحت کی شرط مذاق و
استعداد خاص ہے تو ممکن ہے کہ یہ معذب گناہوں کے سبب ایسا فاسد الاستعداد ہو گیا ہو کہ
جو راحت اس کو اب جنت میں عطا ہوئی ہے اس کی استعداد اس شخص میں نہ رہی ہو اور
عذاب اسی فساد استعداد سے تطہیر کا موجب ہو کر یہ شخص کامل الاستعداد ہو گیا ہو اور اس کو وہی
استعداد عطا ہو گئی ہو جو شرط تھی اس راحت کے ادراک اور انتفاع کی۔

خوب سمجھ لو عجیب تحقیق ہے اس کی مثال میں مجھے ایک حکایت یاد آئی۔ ایک انگریز کے
سائیس نے لاٹری میں ایک چٹھی ڈالی تھی' دو لاکھ روپیہ کے لیے یعنی ایک ایک روپیہ دو لاکھ

آدمیوں نے جمع کیا کہ جس کا نام نکل آوے سب رقم اس کو مل جاوے گی اس میں یہ سائیس بھی شامل ہوگیا۔ آج کل اس قسم کے معاملات بکثرت پھیلے ہوئے ہیں اور حرام وحلال کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی یہ صریح جوا ہے۔ القصہ اس کا نام نکل آیا اس انگریز کی معرفت خط آیا جس کا وہ نوکر تھا اس نے کھولا تو دیکھا دولا کھ روپیہ کی چٹھی سائیس کے نام ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تو نے لاٹری میں چٹھی ڈالی ہے اس نے کہا جی ہاں' پوچھا کہ بدون ہماری اجازت کے کیوں ڈالی اس نے جواب دیا کہ اس میں تو آپ کی اجازت کی ضرورت نہ تھی' قانو نا مجھ کو اجازت ہے۔ انگریز نے کہا کیسا قانون اور بید لے کر اس کو خوب مارا اور توبہ کرائی کہ پھر کبھی چٹھی نہ ڈالے۔ بیچارا جب زخمی ہوگیا اور سخت پریشان ہوا کہ یہ ناگہانی آفت کہاں سے آپڑی اس وقت انگریز نے کہا کہ لو تمہارے نام دولا کھ روپے نکل آئے ہیں اور کہا کہ اگر پہلے ہی یکدم تم کو یہ خط سنایا جاتا تو تم خوشی سے مرجاتے اس لیے تم کو یہ تکلیف دی گئی۔ اس وقت اس سائیس کو یہ سزا بھی موجب مسرت معلوم ہوئی ہوگی وہ انگریز کو دعا دیتا ہوگا کہ اچھا ہوا اس نے دفعۃً مجھے دولا کھ کی خبر نہ سنائی۔ تو آپ نے دیکھا کہ دنیا میں بھی سزا کبھی شرط راحت ہوتی ہے تو آخرت میں بھی اگر ایسا ہو تو کیا تعجب ہے۔ بہرحال جنت میں ہر شخص اعلیٰ درجہ کی راحت میں ہوگا کیونکہ ہر چیز اس کی رغبت اور مذاق کے موافق ہوگی۔

یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص اپنی راحت کے متعلق فی نفسہ اعلیٰ ہونے کا اعتقاد بھی رکھے گا تا کہ معقولی صاحب کا اعتراض وارد ہو۔ غرض وہاں کوئی جہل میں نہ ہوگا اسی طرح دوزخ میں شدت غم کی وجہ سے ہر شخص اپنے کو سب سے زیادہ معذب سمجھے گا خواہ اتنا علم اجمالاً ہو کہ میں فلاں شخص سے درجہ میں کم ہوں مگر چونکہ ہر شخص کو اس کے تحمل سے زیادہ عذاب ہوگا اس لیے وہ اپنے عذاب کو تفصیلاً دوسرے کے عذاب سے کم نہ سمجھے گا اور خواہ اہل جہنم کو تفاوت درجات کا بھی علم نہ ہو کیونکہ اگر جہنم میں جہل مرکب میں ابتلاء ہو تو اس سے کوئی محذور لازم نہیں آتا وہ دار العذاب ہے۔ ممکن ہے کہ حسی عذاب کے ساتھ معنوی عذاب جہل مرکب کا بھی مجتمع ہو کیونکہ دنیا میں ایک طریق صبر کا یہ بھی ہے کہ اپنے سے زیادہ مصیبت زدہ کو دیکھ لیا جاوے اس سے بھی کلفت کم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک

مرتبہ میرے پاس جوتا نہ تھا اس وجہ سے رنجیدہ تھا۔ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پاؤں ہی ندارد ہے تو میں نے شکر کیا کہ میرے پاس پاؤں تو ہے تو جہنم میں خیالی راحت بھی نہ ہوگی کہ یہی سمجھ کر دل کو بہلالیا جائے کہ ہم فلاں سے کم عذاب میں ہیں وہاں چین کا کیا کام اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے دور رکھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ذات من حیث ہی ذات بدون لحاظ شان نبوت کے مطلوب نہیں کیونکہ ایسی محبت تو ابوطالب کو بھی تھی مگر وہ نجات کے لیے کافی نہ ہوئی بلکہ مطلوب وہ محبت ہے جو شان نبوت کی وجہ سے ہو جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا اتباع علمی و عملی لازم ہے۔

نافرمانی کیساتھ محبت نبویؐ باعث نجات نہیں

اب میں پوچھتا ہوں ان لوگوں سے جن کے ہاں رات دن اس قسم کے وعظ ہوا کرتے ہیں کہ اے زنا کار بھائیو! اے شرابی بھائیو! جو چاہو کرو' تقویٰ کی کچھ ضرورت نہیں۔بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھو اسی سے نجات ہو جاوے گی اور ان وہابڑوں کو نجات نصیب نہ ہوگی۔ارے ظالمو! تم مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھانے کی ترغیب دو اس سے ہم منع نہیں کرتے بلکہ ہم خود ترغیب میں شامل ہیں مگر نافرمانی میں دلیری کیوں کرتے ہو۔ بھلا نافرمانی کے ساتھ جو محبت ہو اگر وہ محبت نجات کے لیے کافی ہے تو پھر یہ لوگ ابوطالب کی محبت کو کافی کیوں نہیں کہتے ان کو تو ایسی محبت ان لوگوں سے بھی زیادہ تھی مگر جب ان کی اتنی محبت بھی بوجہ اتباع نہ کرنے کے کافی نہیں ہوئی تو پھر ان مدعیوں کی تھوڑی سی محبت باوجود نافرمانی کے کیسے کافی ہو جاوے گی' رہا تفاوت ایمان وکفر کا یعنی ابوطالب ایمان نہ لائے تھے اور یہ لوگ مؤمن ہیں۔سو اس تفاوت کا انکار نہیں لیکن اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ سب معاصی بدون عقوبت کے بخش دیئے جاویں گے۔البتہ ایمان سے اتنی توقع ضرور ہے کہ کبھی نہ کبھی بخشش ہو جاوے گی مگر یہ تو نہیں کہ دوزخ میں بالکل ہی نہ جاویں اور بعض گنہگاروں کو جو بالکل معاف کر دیا جاوے گا اول تو وہ کسی حسنہ یعنی نیکی کی برکت سے ہوگا اور جب گناہوں پر دلیری ہے تو نیکی کا وجود ہی دشوار ہے۔ چہ جائیکہ ایسے درجہ کی نیکی ہو جس سے گناہ معاف کر دیئے جاویں۔ دوسری یہ بات یعنی بالکل معاف

ہو جانا موعود تو نہیں جس کی بناء پر یقین ہو سکے، بہت سے بہت محتمل ہے اب خود ہی انصاف کرو کہ احتمال مغفرت کی بناء پر معاصی کی اجازت دینا کیسا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ لصوص (رہزن) ہیں اور یہ نری محبت جس کے ساتھ اتباع نہ ہو شرعی محبت نہیں بلکہ لغوی محبت ہے۔ اصل میں محبت وہی ہے جو اتباع کے ساتھ ہو جیسا کہ ارشاد خداوندی "قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ" سے ثابت ہوتا ہے۔ یعنی اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اور ابن المبارکؒ فرماتے ہیں:

تعصی الا لہ وانت تظھر حبہ ھذا لعمری فی الفعال بدیع

لو کان حبک صادقا لا طعتہ ان المحب لمن یحب مطیع

(تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے اگر تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں صادق ہوتا تو اس کی اطاعت کرتا اس لیے کہ محب محبوب کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے)

یعنی محب تو محبوب کا مطیع ہوتا ہے جب اطاعت نہیں تو محبت کی کیا دلیل ہے۔ البتہ ایک ضعیف درجہ محبت کا معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے جس کے لیے شرط یہ ہے کہ معصیت کر کے شرمادے نادم ہو اور اپنے کو قصوروار خطا وار سمجھے مگر جو نافرمانی کرتا ہوا شرمادے گا وہ التزام تو کرے گا اتباع کا اور اس کو ضروری تو سمجھے گا۔

استخفاف معصیت کفر ہے

نہ یہ کہ گناہ پر دلیری کرنے لگے اور دوسروں کو جرأت دلا دے اور معاصی کو ان کی نظر میں خفیف ظاہر کرے۔ خدا کی پناہ ان لوگوں کو تو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیے کیونکہ فقہاء نے فرمایا ہے۔ استخفاف معصیت (گناہ کو ہلکا سمجھنا) کفر ہے۔

معاصی کے باوجود محبت نبوی کا ایک درجہ

اور میں نے جو بھی کہا ہے کہ محبت کا ایک درجہ معاصی کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے یہ بھی ایک حدیث شریف سے ثابت ہے کہ ایک شخص کو چند مرتبہ شراب نوشی میں دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے سزا ملتی رہی مگر باز نہ آیا۔ تیسری یا چوتھی بار گرفتار ہو کر آیا تو کسی نے اس پر

لعنت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت مت کرو "انه یحب الله و رسوله"
یعنی یہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے اور اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ وہ
باوجود گناہ ہو جانے کے حکم شریعت کو مانتا تو تھا اور اپنے کو گنہگار مجرم سمجھتا اور معصیت پر نادم
بھی تھا اور اب تو نصیحت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ احکام شرعیہ کا نام سن کر چڑتے ہیں۔ شریعت
کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور پھر اچھے خاصے شاہ صاحب ہیں اگر ان کو محبت ہوتی تو کم از کم دل
میں دین کی وقعت تو ہوتی اور اس کے سامنے کچھ لچتے۔

ایک غریب آدمی کی صاحب جاہ کو نصیحت

کالپی کی ایک حکایت ہے جس میں ایک غریب کی نصیحت پر ایک صاحب جاہ نے برا
مانا۔ وہ حکایت یہ ہے کہ وہاں قنوج کا ایک عطر فروش گیا اور جمعہ کی نماز میں شریک ہوا' نماز
کے بعد اس نے ایک داروغہ صاحب کو دیکھا کہ فرض تو انہوں نے کسی طرح مجبور ہو کر امام کے
ساتھ اطمینان سے پڑھے کیونکہ امام نے اطمینان سے نماز پڑھی تھی اور یہ اقتداء کی وجہ سے
اس کی اتباع میں مجبور تھے مگر سنتوں میں آپ نے ڈاک گاڑی ہی چھوڑ دی کہ جھٹ پٹ
برائے نام سجدہ رکوع کے فارغ ہو کر چلنے لگے۔ اس گندھی نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ مجھ کو آپ پر
بہت رحم آتا ہے کہ آپ اپنا کام حرج کر کے تو اتنی دور تکلیف کر کے آئے مگر غرض حاصل نہ
ہوئی۔ آپ سنتیں اطمینان کے ساتھ دوبارہ پڑھ لیجئے' داروغہ صاحب نے یہ سنتے ہی غریب کو
دھمکا دیا کہ تیری یہ مجال جو ہم پر خوردہ گیری کرے' ہٹ دور ہو تو ہوتا کون ہے؟ آج کل یہ
حالت ہے اور یہ برتاؤ ہے احکام کے ساتھ مجھ کو مقصود تو یہی جزو ہے مگر آگے تتمیم بھی کرتا ہوں
کہ گو داروغہ جی نے...... اسے دھمکا دیا مگر اس نے پھر کہا کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں آپ
کے بھلے کی کہتا ہوں مجھ کو جو چاہو کہہ لو مگر نماز دوبارہ پڑھ لو۔ داروغہ صاحب نے سپاہی سے کہا
کہ اس کو ہٹا دو' سپاہی نے مارا' دھمکایا مگر وہ یہی کہتا رہا کہ جو چاہو کرو مگر نماز دوبارہ پڑھ لو' میں
بدون نماز پڑھے ہرگز نہ جانے دوں گا اور ٹانگوں میں لپٹ گیا' اس پر مجمع اکٹھا ہو گیا' آخر
دوسروں نے بھی داروغہ صاحب سے کہا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے جو اپنے نفع کی بات بھی نہیں
مانتے آپ دوبارہ نماز پڑھ لیں اس میں آپ کا حرج ہی کیا ہے ثواب کی بات ہے۔ مجبوراً

داروغہ صاحب نے سنتیں دہرائیں اور گندھی کے سامنے اچھی طرح اطمینان سے پڑھیں۔ آخر برائی کیا ہوئی' اگر پہلے ہی اچھی طرح پڑھ لیتا تو کیا بگڑ جاتا۔ اس واقعہ کی تمام شہر میں شہرت ہوگئی حالانکہ ظاہر میں وہ گندھی بیچارا پٹا تھا ذلیل ہوا تھا مگر بڑی نیک نامی ہوئی کیونکہ مظلوم ہونا رسوائی نہیں' گو ظاہر میں ذلت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قصہ میں اس کا مشاہدہ ہوا' چنانچہ وہ گندھی صاحب جدھر جاتے ہیں ہر شخص ان کو بلاتا ہے کہ میر صاحب یہاں تشریف لائیے کیونکہ اکثر لوگ گندھیوں کو میر صاحب کہتے ہیں نہ معلوم کس بناء پر کہتے ہیں سب سید تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ غرض کوئی ان کی دعوت کرتا' کوئی نذرانہ دیتا۔ اس نے کہا صاحبو! مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تو تاجر ہوں میرے ساتھ تو آپ کا یہی احسان بہت ہے کہ میرا عطر خرید لیا جاوے۔ چنانچہ بہت جلد وہ عطر بک گیا پھر اور لائے وہ بھی جلدی ختم ہوگیا وہ صاحب پیر ہی بن بیٹھے۔ خیر ان داروغہ صاحب نے لوگوں کے کہنے سے نماز تو پڑھ لی' یہ بھی غنیمت ہے بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ نصیحت سے کبھی نہ پڑھیں۔

وعظ و نصیحت کا ہر شخص اہل نہیں

چنانچہ کان پور میں ایک صدر منصرم تھے' نمازی تھے مگر بغیر جماعت کی نماز پڑھا کرتے تھے' مسجد میں نہ آتے تھے۔ ایک مولوی صاحب نے ان کو جماعت کی تاکید کی۔ انہوں نے کہا مجھ کو دق نہ کرو مگر مولوی صاحب اصرار کرتے رہے۔ ایک دن شیطان سوار ہوا کہ جاؤ ہم نماز ہی نہیں پڑھتے' کرلو ہمارا کیا کرتے ہو' غرض پھر عمر بھر نماز پڑھی ہی نہیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وعظ و نصیحت ہر ایک آدمی کا کام نہیں ہے اسی لیے میں اپنے اہل علم دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ ابتدائے سلوک میں وعظ و نصیحت نہ کیا کریں کیونکہ علاوہ بعض باطنی مقاصد کے کہ اس کو اہل طریق جانتے ہیں۔ ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ قبل تکمیل تربیت کے نہ فہم درست ہوتا ہے نہ نیت اس لیے احتمال ہے ان کی نصیحت کے بے محل اور بے اثر ہونے کا اور بعض جگہ مضر ہونے کا مگر بعض جگہ لوگ اس ممانعت سے متوحش ہوتے ہیں کہ طاعت سے کیوں ممانعت کی جائے۔ اس کے متعلق مجھ کو اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ یہاں ایک ذاکر نے دوسرے ذاکر کو ترفع اور تحقیر کے لہجہ میں کچھ نصیحت کی' مجھ کو اطلاع ہوئی' میں

نے بلا کر پوچھا کہ آپ اپنا کام کرنے آئے ہیں یا دوسرے کا۔ انہوں نے جو جواب دیا اس سے یہ مفہوم ہوا کہ امر بالمعروف تو عبادت ہے تو یہ بھی اپنا ہی کام ہے۔ مولوی سے جیتنا بڑا مشکل ہے مگر میں نے کہا کہ عبادت میں کچھ شرطیں بھی ہوتی ہیں یا نہیں؟ کہا ہاں! میں نے کہا امر بالمعروف (نیک باتوں کا حکم کرنا) شرطیں آپ کو معلوم ہیں جواب دیا کہ اس کی شرطیں تو معلوم نہیں' میں نے کہا سنئے ان شرائط میں سے ادنیٰ شرط یہ ہے کہ عین امر بالمعروف کے وقت اپنے کو اس سے حقیر سمجھے ورنہ وہ نصیحت اللہ کے لیے نہ ہوگی نفس کے لیے ہوگی اور جس عبادت میں خلوص نہ ہو وہ عبادت ہی نہیں ہے۔

کلید در دوزخ ست آں نماز   کہ در پیش مردم گزاری دراز

(وہ نماز دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے جو لوگوں کے دکھانے کو لمبی اور دراز کی جائے)

یہ مقدمات منوانے کے بعد ان سے کہا کہ آپ نے جو دوسروں کو نصیحت کی تھی اس نصیحت کی حالت میں تم نے اپنے کو افضل اور دوسرے کو حقیر سمجھا تھا یا نہیں' اقرار کیا کہ واقعی ایسا ہوا میں نے کہا اب بھی امر بالمعروف سے ممانعت کی وجہ سمجھ میں آئی' کہا ہاں آ گئی۔ غرض اتنے دلائل کے بعد اس خدا کے بندہ نے مانا کہ بے شک غلطی ہوئی' میں نے کہا کہ اس غلطی کا علاج کیا' کہنے لگے جو تجویز کیا جائے۔

ہر ذکر موجب قرب نہیں

میں نے کہا علاج ہوتا ہے ازالہ سبب سے اور اس غلطی کا سبب تمہارا ذکر و شغل ہے تم ذکر و شغل کر کے اپنے کو بزرگ اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے ہو اس کو چھوڑ دو کیونکہ ہر ذکر موجب قرب نہیں بلکہ بعض ذکر موجب بعد ہوتا ہے اور وہ مطلوب نہیں۔ کما قیل

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں
بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

غرض یہ کہ ان کو ذکر سے منع کر دیا مگر پھر ساتھ ہی ذکر کا ادب غالب ہوا اور اس کا بالکلیہ موقوف کرانا گوارا نہ ہوا اس لیے چلتے پھرتے ذکر کی اجازت دے دی' صرف ہیئت

خاصہ کو موقوف کرادیا اور ازالہ کبر کے لیے خانقاہ والوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کا ان کو مشورہ دیا وہ خود کہتے تھے دس دن میں وہ نفع ہوا جو دس برس میں بھی نہ ہوتا۔ غرض نصیحت کرنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ مولوی صاحب جماعت کی جگہ اس شخص سے نماز بھی چھڑوا بیٹھے اس کا وبال دونوں بھگتیں گے وہ تو نماز چھوڑنے کا اور یہ بے طرح اصرار کر کے نماز چھڑوانے کا۔ غرض یہ کہ بعض لوگ حکم شریعت سن کر تعنت پر اتر آتے ہیں۔ اب بتلایئے کہ کیا محبت ہے یہ تو کفر ہے اگر اس پر بھی کوئی شخص مدعی محبت ہو تو اس کی محبت ایسی ہی محبت ہے جیسا ایک جاہل شخص محب اہل بیت کا قصہ ہے کہ اس نے مسجد میں لکھا دیکھا:

چراغ و مسجد و محراب و منبر ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

(چراغ و مسجد و محراب و منبر ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں)

یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور چھری لے کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام مبارک پر حملہ کیا کہ ہم تو آپ کی حمایت کرتے کرتے مر مٹے مگر تمہیں جہاں دیکھتے ہیں ان ہی میں بیٹھا پاتے ہیں اور جھلا کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام چھیل دیا۔ ایسے بھی محبین ہیں کیا اب بھی کہو گے کہ نری محبت کافی ہے ہرگز نہیں بلکہ محبت مقرون بالاتباع لازم ہے۔

ایک سبق آموز خواب

اس پر مجھے ایک سبق آموز خواب یاد آیا کہ ایک صاحب رہنے والے تو یہاں ہی کے تھے مگر ٹروت جا رہے تھے اور صدق رؤیا میں مشہور تھے اور ان کو مولد شریف سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے مجھ کو ایک خط لکھا تھا جس کو میں نے نشر الطیب میں شائع بھی کر دیا ہے۔ اس خط میں یہ مضمون تھا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ہم اس سے زیادہ خوش نہیں ہوتے جو ہمارا نام زیادہ لے بلکہ اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں جو ہمارے احکام مانے اور گو خواب حجت شرعیہ نہیں مگر یہ خواب دلائل شرعیہ کے موافق ہے اس لیے میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ اس خواب کے علاوہ بیداری کے ارشادات مبارکہ دیکھو سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اتباع کرو باقی جس کو آج کل محبت کہتے ہیں کہ قصیدہ نعتیہ پڑھ دیا جائے اس کی بابت کہیں بھی امر نہیں۔

مدح رسول اکرمؐ میں ضرورت اعتدال

بلکہ ایک مرتبہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدنا (ہمارے سردار) کہہ دیا تھا آپؐ نے باوجود سید السادات ہونے کے فرمایا "ذاک ابراھیم"[1] کہ سید تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق مبارک معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زیادہ تعریف پسند نہ فرماتے تھے اسی لیے کہیں یہ نہیں فرمایا: "امدحونی" (میری تعریف کرو) کہ میری تعریف کیا کرو بلکہ اگر فرمایا تو مبالغہ فی المدح (تعریف میں مبالغہ) سے منع فرمایا۔ "تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم"[2] (میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے) اور اگر کسی مصلحت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بھی بیان فرمائے تو اپنے اوصاف بیان کر کے لافخر پڑھ دیا۔ چنانچہ فرمایا ہے " انا سید ولد ادم ولا فخر"[3] (میں اولاد آدم کا سردار ہوں فخر کی بناء پر نہیں کہتا) مطلب یہ ہے کہ سید ولد آدم ہونا بضرورت بیان کرتا ہوں کیونکہ سب کو اپنا درجہ بتلا دینا حکم خداوندی ہے۔ غرض "امدحونی اور اثنوا علی" (میری تعریف اور میری ثنا بیان کرو) نہیں فرمایا اور اتباع کا امر بار بار فرمایا بلکہ یہاں تک تاکید فرمائی کہ اپنی مخالفت کو خداوند تعالیٰ کی مخالفت فرمایا کہ "من عصانی فقد عصی اللہ"[4] (یعنی جس نے میری مخالفت کی اس نے خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کی)۔ اب بتلاؤ کونسا حق بڑا ہے بس جمع تو دونوں حقوق کو کرنا چاہیے لیکن بڑے حق کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے نہ کہ ایک ہی پر اور وہ بھی دوسرے درجہ کا اکتفا کر کے بیٹھ جاویں اور دوسرے حق کا جو کہ اعظم ہے نام بھی نہ لیا جاوے۔ نیز یہ لوگ گو اس ذکر و مدح کو محبت کامل خیال کرتے ہیں مگر در اصل ان کی یہ مدح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح بھی نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کی مدح اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اور اگر مذاق ممدوح کے موافق نہ ہو تو وہ در حقیقت مدح

---

[1] (الصحیح لمسلم' الفضائل ب ۱ ۴ رقم: ۱۰ 'سنن ابی داؤد: ۴۶۷۲)
[2] (الصحیح للبخاری ۴: ۲۰۴ ' الصحیح لمسلم' القدر ب ۷' رقم: ۳۴)
[3] (المستدرک للحاکم ۲: ۶۰۴ ' کنز العمال: ۳۲۰۳۰)
[4] (الصحیح لمسلم الامارۃ: ۳۳' مسند احمد ۲: ۲۵۳)

نہیں مثلاً اگر کوئی سررشتہ دار کو کلکٹر کے سامنے کلکٹر کہنے لگے تو سررشتہ دار اور کلکٹر دونوں برہم ہوں گے کیونکہ اس نے کلکٹر کی اہانت کی۔ اسی طرح جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایسا غلو کرتے ہیں کہ درجہ الوہیت تک پہنچا دیتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح نہیں کرتے بلکہ حضرت حق کی بے ادبی کر کے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو ناخوش کرتے ہیں اور ایسی گستاخیوں میں گنوار تو معذور بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ایک تحصیلدار کا نام چراغ علی تھا' اس نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا تو جس شخص کے موافق فیصلہ ہوا تھا وہ کوئی دیہاتی تھا اس نے خوش ہوکر دریافت کیا کہ تحصیلدار صاحب تیرا کیا نام ہے بتلایا کہ چراغ علی تو وہ گنوار کہتا ہے کس سوہرے (سسرے) نے تیرا نام چراغ علی رکھ دیا تو تو مشعل (مشعل) علی ہے۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حاکم نے ایک گنوار سے دریافت کیا کہ یہ لڑکا تیرا رشتہ میں کیا ہوتا ہے؟ کہا یہ میرا کڈھیلڑا ہے۔ یہ ثقیل لغت اس بیچارے نے کیوں سنا تھا وہ حیران ہوا کہ یہ کونسا رشتہ ہے۔ اس نے اس کے معنے دریافت کیے تو آپ نے کیا خوب تفسیر سے بتلایا کہ جیسے تیرا باپو مر جاوے اور تیری ماں مجھے کر لے اور تو اس کی گیلوں (ہمراہ) آوے تو تو میرا کڈھیلڑا ہوا' اب بھی سمجھا' کہا ایسا سمجھا کہ عمر بھر بھی نہ بھولوں گا مگر وہ گنوار تھا اس لیے اس کی گرفت نہیں ہوئی اگر کوئی مہذب اس لغت کی بر سر عدالت بھی تفسیر کرے تو کیا اس کو توہین عدالت کے جرم میں جیل خانہ نہ بھیج دیا جاوے گا۔

مضامین لغت میں گمراہ شعراء کا غلو

میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ جو آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں حد سے زیادہ غلو کرتے ہیں اگر ان کو منع کیا جاوے تو محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں اور شاعر معذور ہیں کیا یہ گنوار پن کی مد میں معذور ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعریف یہ لوگ خلاف شریعت کرتے ہیں وہ اہانت ہے انبیاء کی حتیٰ کہ بعض کے کلام میں حق تعالیٰ کی اہانت موجود ہے۔ غضب کی بات ہے کہ حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ اور یہ اقوال چنانچہ کسی بے ادب نے کہا ہے:

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے　　کوئی ڈھب چاہیے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

یعنی اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج سے اصل مقصود تو آپ کی زیارت ہے مگر رستہ میں مکہ مکرمہ ہی جو بیت اللہ ہے اور وہ مثل ہمارے آپ پر عاشق ہونے کے سبب ہمارا رقیب ہوا اور ہے زبردست اس لیے اس کی بھی خوشامد کرتے ہیں اور کعبہ کا طواف کر کے اس کو پھسلاتے ہیں تاکہ سفر مدینہ میں مزاحم نہ ہو' خدا کی پناہ خدا کی پناہ ایسے ایسے ملحد اور بے دینوں کو عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے اول تو یہ کلام کفری ہے۔ دوسرے اس کا مضمون بھی غلط ہے کیونکہ مدینہ کے ہر راستہ میں کعبہ کہاں پڑتا ہے۔ مثلاً جو لوگ شام کی طرف سے آتے ہیں ان کے راستہ میں مدینہ پہلے آتا ہے پھر کوئی اس سے پوچھے کہ وہ لوگ مکہ میں کیوں آتے ہیں۔ بس ان لوگوں میں نہ دین ہے نہ عقل ہے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کہ کیا اچھا شعر کہا ہے' واہ واہ' اس واہ واہ کا قیامت میں مزہ معلوم ہوگا۔ میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں اس سے جائز ناجائز مدح کا پتہ چلنا نہایت آسان ہے وہ معیار یہ ہے کہ مدح کے وقت یوں غور کر کے دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس مجلس میں تشریف رکھتے ہوں تب بھی آپ کے سامنے یہ کلام کہہ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس وقت بھی کہنے کی ہمت ہو تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں اور جو ایسی مدح ہو نہ وہ مدح ہے نہ نعت ہے بلکہ اس شاعر کی ناک میں ناتھ ہے اسی طرح ایک اور شعر ہے:

پے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف ۔۔۔ محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

یعنی جیسے یعقوب علیہ السلام نے اپنی تسلی کے واسطے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ مبارک رکھ لیا تھا اسی طرح حق جل جلالہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ اپنے پاس رکھ لیا کہ تسلی رہے کیا (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آ کر خدا سے غائب ہو گئے تھے اور نظر نہ آتے تھے کیا (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کو سکون کی بھی ضرورت ہے۔ ناس ہو ایسی جہالت کا شاعر نے اپنے نزدیک حسن تعلیل برتی ہے اور اس پر نازاں ہے' اول تو وہ روایت ہی متکلم فیہ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا بیان ہے دوسرے خود اس روایت میں سایہ نہ ہونے کی وجہ بھی موجود ہے کہ آپ پر ابر سایہ فگن رہتا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہوتا تھا اور یہ علت کیسے ہو سکتی ہے جو شاعر نے بیان کی ہے' کیا وہ خدا کو حاضر و ناظر نہیں جانتا' یہ تو حق تعالیٰ کی شان میں دو شعروں کا مختصر بیان تھا' اب اہانت انبیاء کا نمونہ سنئے۔ ایک شخص نے کہا ہے:

بر آسمان چارم مسیح بیمار ست   تبسم تو برائے علاج درکار ست

(چوتھے آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں' آپ کا تبسم علاج کیلئے درکار ہے)

کیا شاعر صاحب دیکھنے گئے تھے کہ حضرت مسیح بیمار ہیں۔ غرض یہ مضمون بالکل غلط ہے۔ عالم علوی میں مرض کا کیا کام اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تو شاعروں نے (نعوذ باللہ) زر خرید بنا رکھا ہے' ان کا ذرا بھی ادب نہیں کرتے۔ ایک مداح نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بے ادبی کی ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی جاتی رہی تھی اور تو ان کے بالکل نابینا ہونے میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ بینائی کمزور ہوگئی تھی کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک انبیاء میں کوئی ظاہری عیب بھی نہیں ہوتا تاکہ لوگوں کو ان سے طبعی نفرت بھی نہ ہو اور اتباع نہ کرنے کیلئے معمولی سا بہانہ بھی نہ ملے اور اگر نابینا ہوئے بھی ہوں تو خلقۃً نابینا نہیں تھے بلکہ شدت غم سے ہو گئے تھے جس طرح اور عوارض جسمانی وامراض لاحق ہوا کرتے ہیں۔ پس اگر اور امراض کی طرح یہ مرض ہو بھی گیا ہو تو کیا وہ مکرم نہیں رہے اور ان کی گستاخی جائز ہو گئی۔ غرض ایک شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا لکھا ہے اور سراپا لکھنے کے لیے ایک سیاہی تیار کی ہے اس کے رگڑنے کیلئے چشم یعقوبی کو تو بہ تو بہ کھرل گردانا ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب فقیر دہلوی بدعتیوں کے حق میں بڑے سخت تھے انتظام کے لیے کچھ آدمی ایسے بھی ہونے چاہئیں انہوں نے اس کا خوب جواب دیا ہے:

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل   نظر آتا ہے جسے دیدہ یعقوب کھرل

توبہ ہی یوں ہو کہیں عین نبی مستعمل   کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجہل

(نعوذ باللہ) کتنی بڑی گستاخی ہے نبی کی شان میں کہ ان کی چشم مبارک کو کھرل بنایا ہے۔ افسوس ہے مسلمان کہلا کر ان لوگوں کو ان باتوں کی کیسے جرأت ہوتی ہے۔ درحقیقت ان میں ایمان ہی کی کمی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو باوجود یقینی افضلیت کے یہ ارشاد فرمائیں "لاتفضلونی علی یونس بن متی"[1] (کہ مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو) اور یہ مدعیان محبت انبیاء کی اہانت کریں اور اس حدیث میں یونس علیہ السلام کی تخصیص کی وجہ ایک

---

[1] (کتاب الشفاء للقاضی عیاض ۱: ۲۶۵' اتحاف السادۃ المتقین ۳: ۱۰۵)

قصہ ہے جس کے اکثر اجزاء کا بیان قرآن شریف میں ہے جس سے ناواقف کو ان پر نقص کا وسوسہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وذالنون اذ ذهب مغاضبا الاية" یعنی وہ اپنی قوم سے خفا ہو کر حق تعالیٰ سے بلا صریح اجازت لیے اپنے اجتہاد سے بستی سے باہر چلے گئے تھے کیونکہ ان کی قوم پر نزول عذاب کی خبر دی گئی تھی اس پر وہ اپنے اجتہاد سے چل دیئے۔ خدا تعالیٰ سے نصاً استفسار نہ کیا حق تعالیٰ کو ان کی شان کے اعتبار سے یہ بات ناپسند ہوئی کہ بدون حکم کے کیوں چل دیئے' اس کا تدارک یہ کیا گیا کہ جب ان کے راستہ میں دریا آیا اور وہ کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی چکر کھانے لگی' لوگ کہنے لگے کہ اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام بولے کہ صاحبو! میں ہوں بھاگا ہوا غلام مگر سب نے انکار کیا اور کہا کہ آپ صورت سے غلام نہیں معلوم ہوتے' آپ تو بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ‏ ‏ ‏ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

(واقعی انبیاء علیہم السلام کی صورت سے ان کا عاقل ومہذب اور شریف ہونا کافروں کو بھی معلوم ہوجاتا ہے)

نور حق ظاہر بود اندر ولی ‏ ‏ ‏ نیک بیں باشی اگر اہل دلی

ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے۔ جب ہر ولی کی شان ہے تو نبی کے لیے نور حق ظاہر بود اندر نبی بدرجہ اولیٰ صادق ہوگا تو کشتی والوں نے آپ کے قول کو نہ مانا اور کشتی کی وہی حالت تھی آخر قرعہ کی تجویز ہوئی کہ جس کا نام قرعہ میں نکلے اسی کو دریا میں ڈال دیا جاوے۔ جب قرعہ بار بار انہیں کے نام نکلا اور یہ بھی اصرار کرتے رہے کہ عبد آبق میں ہی ہوں تو ان کو مجبوراً دریا میں پھینک دیا گیا۔ وہاں ایک بڑی سی مچھلی آئی اور ان کا ایک لقمہ کر کے چلی گئی۔ چالیس روز تک آپ اس کے پیٹ میں رہے اور تسبیح و استغفار کرتے رہے پھر مچھلی نے آپ کو کنارہ پر اُگل دیا' اتنے دنوں میں ضعف بہت ہوگیا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے لیے ایک درخت اُگا دیا۔ یہ قصہ قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے۔ اس قصہ سے احتمال تھا کہ شاید کوئی احمق اس کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتا کہ حضرت یونس علیہ السلام کا یہ فعل اچھے درجہ کا نہیں اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے خاص طور پر آپ کا نام لے کر منع فرمایا کہ ان پر مجھ کو فضیلت مت دینا یعنی جس نبی کے متعلق تم کو شبہ بھی ہوسکتا ہے ان پر اپنی رائے سے مجھ کو فضیلت نہ دو کیونکہ تم اپنی رائے سے فضیلت دو گے تو عنوان غلط تجویز کرو گے۔ ہاں تفضیل بالنص کا مضائقہ نہیں جس میں رائے کا اصلاً دخل نہ ہو کیونکہ نص میں جو تفضیل وارد ہے اس میں کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آسکتی اور تفضیل بالرائے میں اس کا قوی احتمال ہے۔ یہ وجہ ہے ممانعت تفضیل کی ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء سے یقیناً افضل ہیں آپ کی تو یہ شان ہے:

لایمکن الثناء کما کان حقه بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(آپ کی تعریف جیسا کہ آپ کا حق ہے ناممکن ہے۔ قصہ مختصر خدا کے بعد آپ ہی بزرگ ہیں) اسی واسطے آپ نے "لافضل لی علی یونس بن متی" (یونس ابن متّی پر مجھ کو فضیلت نہیں)

نہیں فرمایا بلکہ "لا تفضلونی" فرمایا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ انبیاء کے احترام کا اس درجہ اہتمام تھا تو ان کی اہانت کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت بیان کرنا کیا اس کا نام مدح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ اس مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھاتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جس ذکر و مدح کو ان لوگوں نے کمال محبت قرار دے رکھا ہے وہ محبت نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا رسانی ہے پھر وہ لوگ کیا منہ لے کر ہم لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں کرتے۔ غرض یہ کہ ان کا اعتراض بالکل لغو ہے بلکہ میں نے ثابت کر دیا کہ ہم لوگ ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ دین کے ہر جزو کا ذکر بواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ذکر ہے مگر کبھی کبھی میں اس ذکر کو بلاواسطہ بھی کر دیتا ہوں اور یہ ذکر بلاواسطہ کبھی ربیع الاول کے قریب کبھی اس کے اثناء میں ہوتا ہے کیونکہ وہ مہینہ مذکور ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات کا اس تذکیر کے اثر سے اس مہینہ میں بھی یا اس کے آس پاس ذکر ہو جاتا ہے اور مذکر اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ بھی ربیع الاول ہی میں ہوئی ہے اور بقول بعض کے نبوت بھی اس ماہ میں عطا ہوئی اور

وفات بھی اس میں ہوئی اس لیے یہ مہینہ ان کمالات کا مذکر ہو جاتا ہے اور وفات کے کمالات مقصودہ میں سے ہونے پر میں ایک تعجب کو متفرع کرتا ہوں وہ یہ کہ ولادت شریفہ کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ اہل میلاد سے آپ نے ذکر وفات کبھی نہ سنا ہوگا بلکہ بعض نے منع کر دیا ہے حالانکہ وہ متمم ہے اس عالم کے کمالات کی اور متمم کی فضیلت ظاہر ہے اس کا کون انکار کرسکتا ہے۔ یعنی اس عالم کے کمالات کی ابتداء ہے وفات شریف سے گویا وفات درحقیقت ولادت ہوتی ہے۔ عالم ملکوت میں اور جیسا وہاں کی ولادت اشرف ہے گویا وفات درحقیقت ولادت ہوتی ہے۔ عالم ملکوت میں اور جیسا ولادت اشرف ہے ایسا ہی اس کا ذکر بھی افضل ہوگا۔ پس وفات شریف کا تذکرہ بھی کبھی کبھی کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک وعظ میں وفات کا ذکر کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ولادت ہی ہے یعنی ولادت ملکوتیہ اور اس وعظ کا نام المولد البرزخی رکھا ہے۔ غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ناسوتیہ بھی ربیع الاول ہی میں ہے اور ولادت ملکوتیہ بھی۔

فضیلت ماہ ربیع الاول

اور باقی تمام واقعات بین الربیعین ہیں اس لیے یہ مہینہ سب کمالات کا مذکر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ محفوف ہیں ربیعین کے درمیان میں اسی لیے ماہ ربیع کی فضیلت میں ملا علیؒ فرماتے ہیں:

لهذا الشهر في الاسلام فضل	ومنقبته تفوق على الشهور
ربيع في ربيع في ربيع	ونور فوق نور فوق نور

(اسلام میں اس مہینہ کی بڑی فضیلت ہے اور اس کی منقبت تمام مہینوں پر فوقیت رکھتی ہے ربیع ہے ربیع در ربیع میں اور نور ہے جو نور پر نور ہے)

غرض اس بناء پر ربیع الاول کے قریب یا اس کے اثناء میں گاہ گاہ میرا معمول ہے کہ مقصوداً بلاواسطہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کرتا ہوں اسی وجہ سے اس سال کے ماہ صفر میں میں نے آیت "قد جاء كم من الله نور و كتاب مبين يهدى به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ويخرجهم من الظلمت الى النور" (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے

ایک روشن چیز آئی ہے اور کتاب واضح کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں) کا بیان کیا تھا اور آج کہ خود ربیع الاول کا زمانہ ہے پھر اسی کے متعلق بیان کا قصد کیا کیونکہ گزشتہ جلسہ میں کچھ مضامین اس آیت کے متعلق رہ گئے تھے اور اسی وقت خیال تھا کہ کسی دوسرے جلسہ میں ان کو بیان کروں گا مگر جن کاتب نے وہ مضمون لکھا تھا آج وہ موجود نہیں ہیں اس لیے میں نے اس وقت دوسری آیت اختیار کی۔

کاملین سے صدور خطا ممکن ہے

چنانچہ اس دوسری آیت کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ حاصل اس آیت کا یہ ہے کہ ایک واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے صحابہؓ کے ساتھ خاص برتاؤ کرنے کا غالباً واقعہ تو سب کو معلوم ہوگا مگر مجملاً میں بھی ذکر کرتا ہوں کہ بعض صحابہؓ سے غزوہ احد میں ایک غلطی ہو گئی تھی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں　　وہ طفل کیا گرے کہ جو گھٹنوں کے بل چلے

طفل کے نہ گرنے یعنی اس سے لغزش نہ ہونے پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک محقق خوش مزاج بزرگ سے ایک بچہ نے بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی گناہ تو ابھی کیا ہی نہیں تو بہ کس چیز سے کراؤں' توبہ تو گناہ سے ہوا کرتی ہے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان حضرت نے گناہ کی رائے دی' بزرگوں کے بعضے کلام کا مطلب سمجھنا بڑا دشوار ہے۔ حقیقت اس کلام کی یہ ہے کہ توبہ کی ضرورت گناہ کے بعد ہے یہ نہیں کہ توبہ کی ضرورت سے گناہ کرنا چاہیے۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ طبیب کسی تندرست آدمی کی نبض دیکھ کر نسخہ نہ لکھے اور یہ کہے کہ تم کو دوا کی ضرورت نہیں ہے کہ تم بیمار نہیں ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ بد پرہیزیاں کر کے بیمار ہو جاؤ تا کہ دوسرے مریضوں کی طرح تمہارے واسطے بھی نسخہ لکھا جاوے۔ سو یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ ایک واقعہ کی خبر دینا ہے کہ غیر مریض کے لیے نسخہ نہیں لکھا جاتا ورنہ اگر یہ مطلب ہو تو سرحدی جیسا واقعہ ہو جاوے گا کہ ایک سرحدی ہندوستان آیا تھا اور کسی مقام پر ڈاکوؤں کے ہاتھ سے زخمی ہو گیا۔ ایک شخص نے اس کی خوب خدمت کی

اور علاج کیا، سرحدی نے تندرست ہو کر بہت خوشی سے کہا کہ میاں صاحب اگر کبھی ہمارے ملک میں آنے کا اتفاق ہو جاوے تو ہم سے ضرور ملنا ہم تمہاری خدمت کا صلہ دیں گے۔ اتفاقاً وہ ہندوستانی ایک مرتبہ اُدھر جا نکلا اور تلاش کر کے خان صاحب کے گھر بھی پہنچا، خان صاحب اس کو مکان پر بٹھلا کر کہیں غائب ہو گئے اس کی بیوی نے دریافت کیا تم کون ہو، تمہارا کیا واقعہ ہے۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا اس نے کہا میاں صاحب یہاں سے اسی وقت چل دو کیونکہ خان صاحب اکثر تم کو یاد کر کے یوں کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان میں ایک دوست ہے جس نے ہمارے زخموں کا علاج کیا اگر وہ محسن دوست یہاں آ پہنچے تو میں اس کو زخمی کر کے اس کی خوب خدمت اور مرہم پٹی کروں تو وہ اب چھرا لینے گیا ہے تاکہ اول تم کو زخمی کرے پھر علاج کرے، تم بھاگ جاؤ۔ پس ان حضرات کا مطلب یہ نہ تھا کہ اس سرحدی کی طرح اول گناہ کرے پھر توبہ کرے بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب گناہ نہیں ہوا تو توبہ کس چیز سے کراؤں کیونکہ بدون مرض کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں مفرحات و مقویات کا استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ قصہ درمیان میں یاد آ گیا تھا اصل میں میں یہ بیان کر رہا تھا کہ غلطی کا وقوع صحابہؓ سے قابل تعجب نہیں وہ شہسوار تھے جو کبھی کبھی گھوڑے سے گر گئے بلکہ اس میں حکمتیں ہوتی ہیں جن کو اہل طریق نے مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ ایک عنوان جو سب سے بڑھ کر ہے وہ ہے جس کو نظامی فرماتے ہیں:

گناہ من از نامدے در شمار　　ترا نام کے بودے آمرزگار

(اگر میرے گناہ گنتی میں نہ آتے تو تمہارا غفور نام کب ہوتا)

مگر یہ ناز ہے جو ہر شخص کو زیبا نہیں اس لیے آپ نہ کرنے لگیں ورنہ کبھی وہ حال ہو جیسے ایک احمق شخص نے ایک ولایتی کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو بڑے پیار سے دانہ کھلا رہا تھا، کابلی لوگ گھوڑے کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اس پر خوب خرچ کرتے ہیں، قیمتی قیمتی گھوڑے رکھتے ہیں، گھوڑے کے قیمتی ہونے پر ایک کابلی تاجر کا قصہ یاد آیا کہ وہ کسی رئیس کے پوچھنے پر اپنے گھوڑے کی بڑی قیمت کہہ رہے تھے، خریدار نے کہا تم بڑے گراں فروش ہو اس نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ تم بڑے ارزاں خرید ہو، غرض وہ کابلی اپنے گھوڑے کو بہت محبت سے دانہ کھلا رہا تھا وہ گھوڑا دانہ کھاتے ہوئے کبھی منہ مارتا کبھی دولتی پھینکتا اور وہ کابلی

کہتا بیٹا کھاؤ اور جدھر وہ منہ لے جاتا اسی طرف یہ دانہ لے جاتا۔ اس شخص نے یہ ماجرا دیکھا تو دل میں کہا کہ افسوس ہماری بیوی ہماری اتنی قدر بھی نہیں کرتی جتنی یہ کابلی گھوڑے کی قدر کرتا ہے۔ جب ہماری کچھ قدر نہیں ہوتی تو انسان ہونے سے کیا فائدہ اس سے تو گھوڑا ہی بننا بہتر ہے۔ گھر جا کر بیوی سے کہا کہ ہم اب گھوڑے بنیں گے بیوی نے کہا چاہے تم گدھے بن جاؤ میرا کیا حرج ہے۔ چنانچہ اس نے دو کھونٹے گاڑے اور ایک رسی گلے میں باندھی اور ایک کھونٹے میں پچھاڑی باندھی اور دم کی جگہ جھاڑو بندھوائی اور دانے کا توبڑا منہ پر بندھوا کو دولتیا چلانے لگا اور اصل مقصود کا انتظار ہی تھا کہ بیوی سے کہا تم یوں کہنا کہ بیٹا کھاؤ' بیٹا کھاؤ' اس کود پھاند میں چراغ جو پیچھے رکھا تھا جھاڑو میں آگ لگ گئی اس سے کپڑوں میں آگ لگ گئی' میاں کی اگاڑی پچھاڑی لگی ہوئی تھی یہ کس طرح بچتے بیوی بھی احمق کی احمق ہی تھی اس نے محلہ والوں کو پکارا کہ ارے دوڑو میرا گھوڑا جلا مگر سب نے کہا کہ اس کے گھر میں گھوڑا کہاں سے آیا' مسخری ہے یوں ہی مذاق کر رہی ہے۔ بس آپ گھوڑے بن کر جل کر مرنڈا ہو گئے' اچھا ناز کیا۔ اسی واسطے کہتا ہوں کہ ہر شخص کو ناز کرنا زیبا نہیں۔ نظامی کا ناز دیکھ کر آپ ناز نہ کرنے لگئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ناز را روئے بباید ہمچو ورد — چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کرنے کیلئے گلاب جیسے چہرے کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے بدخوئی کے پاس بھی نہ جاؤ)

عیب باشد چشم نابیناؤ ناز — زشت باشد روئے نازیباؤ ناز

(آنکھ اندھی ہو اور کھلی ہو یہ عیب ہے۔ چہرہ بدصورت ہو اس پر ناز ہو یہ بری بات ہے)

پیش یوسف نازش و خوبی مکن — جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یعنی یوسف یعنی کامل کے سامنے ناز و خوبی یعنی دعویٰ اظہار کمال مت کرو بجز نیاز و آہ یعقوبی کے اور کچھ مت کرو)

کیونکہ تم نظامی تو ہونے سے رہے ہاں بدنظامی ہو جاؤ گے۔

کاملین کی غلطی کا راز

غرض کاملین سے صدور خطا ہونے میں بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں ان کی خطا کی مثال سنکھیا مدبر جیسی ہے۔ سنکھیا کو حکیم مدبر کر کے کھلا دے گا تو مفید ہوگا اور ناتجربہ کار ویسے ہی

کھالے گا تو مر جائے گا۔ پس یاد رکھو کہ صحابیؓ کی خطا کی یہ شان ہے:

گر خطا گوید ورا خاطی مگو ورشود پر خون شہید آں را مشو

خون شہیداں را از آب اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(اگر غلطی کرے اس کو خطا وار نہ کہو اور اگر شہید خون میں لت پت ہو جائے تو اس کو مت غسل دو کیونکہ شہیدوں کا خون پانی سے بہت بہتر ہے اور یہ خطا صد صواب سے بہتر ہے)

اور اس میں راز یہ ہے کہ ان کی غلطی اکثر اجتہاد سے ہوتی تھی اور ہماری غلطی فساد و عناد سے ہوتی ہے مگر باوجود خطائے اجتہادی ہونے کے سزا اور تنبیہ کے وہ فوراً خطا وار ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اجتہاد کا عذر پیش نہیں کرتے کیونکہ تنبیہ کے وقت تاویل کرنا گستاخ و بے ادب کا کام ہے جیسا کہ آج کل مرض ہے کہ باوجود صریح خطا ہونے کے بھی اقرار کرنا موت ہے۔ جھوٹی جھوٹی تاویلیں گھڑتے چلے جاتے ہیں حالانکہ جھوٹی تاویل تو قبیح ہے ہی۔

سلف کا مذاق تو یہ تھا کہ صحیح تاویل کو بھی ہر جگہ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سفیان ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو "من غشنا فلیس منا"[1] (جو شخص ہم کو دھوکہ دے وہ ہم سے نہیں ہے) میں تاویل کرنا پسند نہیں کیونکہ تاویل کر کے اس ارشاد کی غرض فوت ہو جاتی ہے کہ پھر اس سے اس درجہ کا زجر نہیں ہوتا جو مقصود ہے اور ان کا یہ قول بالکل درست ہے۔ البتہ خوارج اور معتزلہ کا استدلال رد کرنے کی وجہ سے تصحیح عقائد کے لیے تاویل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں اور ایسی حدیثوں سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس میں تاویل کر کے ان کا استدلال توڑ دیا جاتا ہے لیکن جہاں خائن کو زجر کرنا ہو وہاں ہم بھی سفیان بن عیینہ ہی کے ساتھ ہیں تاکہ زجر مقصود فوت نہ ہو۔ اسی طرح سزا دینے والا سزا دینے کے وقت یہ نہیں پوچھا کرتا کہ تم نے یہ غلطی قصداً کی ہے یا اجتہاد سے کی ہے تربیت کا مقتضا یہی ہے کہ غلطی کو غلطی ہی ظاہر کیا جاوے اور گو حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ صحابہؓ کی یہ غلطی اجتہاد سے تھی مگر اس کے خلاف کی بھی تصریح نہیں۔ پس مسکوت عنہ ہے اب اگر کسی اور طریق سے اس کا خطا اجتہادی ہونا ثابت ہو جاوے تو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ چنانچہ دوسرے دلائل سے اس کا اجتہادی ہونا معلوم ہے اس کی مختصر تقریر بھی عنقریب آتی ہے۔

---

[1] (الصحیح لمسلم الایمان: ۱۶۴، مسند احمد ۳: ۴۹۸)

شانِ نزول آیت متلوہ

اب میں قصہ بیان کرتا ہوں۔ شروع میں یوں ہوا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احد میں ایک گھاٹی پر پچاس تیر اندازوں کو بٹھا دیا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم اس گھاٹی پر چاہے ہمارا کچھ ہی حال ہو ہٹنا نہیں اس کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی اور کفار بھاگنے لگے تو ان پچاس صحابہؓ میں سے اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ چلو غنیمت کی لوٹ میں ہم بھی شریک ہوں۔

کثرت رائے کا حکم

یہاں ایک بات ضمناً بیان کرتا ہوں کہ یہاں سے کثرت رائے کا مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ باوجود کثرت رائے پر عمل کرنے کے بھی اس فعل کو شرعاً ناپسند کیا گیا۔ جب صحابہؓ کی رائے کا یہ حال ہے تو پھر ہم کس شمار میں ہیں نہ معلوم آج کل کثرت رائے کو کس بناء پر معیار صواب قرار دے رکھا ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں' فقط اہل یورپ کی تقلید سے ایسا کرتے ہیں باوجود یہ کہ دعویٰ کرتے ہیں ان کی مخالفت اور مقاطعت کا اور یہ بھی یاد رکھو کہ ان صحابہؓ کی یہ شرکت فی الغنیمت (مال غنیمت میں شریک ہونا) کسی دنیوی غرض سے نہ تھی یعنی مال حاصل کرنے کے واسطے نہیں تھی کیونکہ غنیمت کا حکم یہ ہے کہ جو بھی جہاد میں شریک ہو اس کو غنیمت سے حصہ ملتا ہے خواہ وہ لوٹ میں شریک ہو یا نہ ہو' یہ نہیں ہے کہ جس کے جو ہاتھ لگے وہ لے بھاگا بلکہ اول سب غنیمت کو جمع کر کے پھر سب مجاہدین پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اگر وہ صحابہؓ گھاٹی پر بیٹھے رہتے تب بھی ان کو اتنا ہی حصہ ملتا جتنا کہ لوٹ میں شرکت کے بعد ملا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے تحصیل مال کے لیے شرکت کی تھی بلکہ محض قتال میں شرکت چاہی تھی تاکہ ثواب میں اضافہ ہو کیونکہ ان لوگوں نے ظاہر میں اب تک کچھ کام نہ کیا تھا صرف گھاٹی پر خالی بیٹھے ہی رہے تھے وہ سمجھے کہ ہم نے کچھ کام نہیں کیا لاؤ جہاد میں ہم بھی عملی حصہ لیں۔

خوب سمجھ لو بے علمی کی وجہ سے لوگ صحابہ پر طمع دنیوی کا طعن کرتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ مفصل معلوم ہو چکا۔ غرض ان صحابہؓ نے اپنی یہ رائے سردار سے ظاہر کی کہ ہم غنیمت میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو انہوں نے منع کیا اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عام

تھا کہ یہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنا اور شرکت غنیمت میں اس کی مخالفت ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد معلل تھا' یہ مطلب نہ تھا کہ فتح کے بعد بھی گھاٹی سے نہ ہٹنا بلکہ عام ممانعت سے فتح کی قبل کی ہر حالت میں جمار ہنا مراد تھا۔ جب فتح ہو گئی تو پھر یہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی غرض فتح تک ٹھہرنا تھا القصہ وہ سردار تو مع چند آدمیوں کے وہاں پر رہ گئے اور باقی سب شریک غنیمت ہو گئے۔ خالد بن ولید اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے ان کو جاسوس نے خبر دی کہ گھاٹی خالی ہو گئی ہے وہ فنون حرب کے بڑے ماہر تھے فوراً سپاہیوں کی ایک تعداد کو لے کر گھاٹی پر آ پہنچے اور جو چند صحابہؓ وہاں رہ گئے تھے ان کو قتل کر کے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا کیونکہ گھاٹی پر جو چند مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ ان کے مقابلہ کو نا کافی ہوئے۔ اُدھر کفار کو جب معلوم ہوا کہ گھاٹی پر ان کے آدمی پہنچ گئے تو وہ بھی بھاگتے بھاگتے واپس لوٹے اس طرح صحابہؓ درمیان میں پس گئے۔ اس ہلڑ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہو گیا اور خود پر پتھر آ کر لگا وہ سر مبارک میں گھس گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف کے باعث ایک جگہ سایہ میں تشریف فرما ہوئے تو شیطان نے اعلان کر دیا "الا ان محمد اقد قتل" یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شہید ہو گئے یہ حالت اور یہ اعلان۔ اس پر عشاق کے پاؤں اُکھڑ گئے اس سے زیادہ پاؤں اُکھاڑنے والی بات کون ہو سکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت کی خبر ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بلند آواز کے ساتھ صحابہؓ کو پکارنے کے واسطے ارشاد فرمایا کہ ان کی آواز بہت بلند تھی' رات کو بارہ میل تک جاتی تھی۔ انہوں نے جب آواز دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ و سلامت ہیں اور تم کو بلا رہے ہیں تو صحابہؓ کو ہوش آیا اور سب جمع ہو گئے۔ قرآن مجید میں "و اذ غدوت" (اور جب آپ صبح کے وقت نکلے) سے اس آیت تک بلکہ بعد تک بھی اس واقعہ کا ذکر ہے جس میں اول غزوہ بدر میں نصرت کرنے کا ذکر ہے پھر غزوہ احد کا بیان ہے اور غزوات کا بیان تو قرآن میں مختصر ہے مگر اس غزوہ کا یعنی جنگ احد کا بہت طویل بیان ہے جس میں صحابہؓ کو ان کی غلطی پر متنبہ کر کے پھر اس واقعہ کی حکمتیں بتلائی گئی ہیں اور مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جس طرح فتح و نصرت نعمت ہے اسی طرح بلاء و مصیبت بھی نعمت ہے۔

بہرحال اس واقعہ میں صحابہ کرامؓ سے دو غلطیاں ہوئیں ایک تو گھاٹی پر سے ہٹ جانا اس کا منشاء تو اجتہاد تھا جیسا کہ مفصل بیان کر چکا ہوں۔ دوسری غلطی بھاگنا اور پاؤں اکھڑنا اس میں خطا اجتہاد سے زیادہ عذر تھا یعنی یہ غلطی حیرانی اور بیہوشی کی وجہ سے ہوئی جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اعلان سن کر صحابہؓ پر طاری ہوگئی تھی' کیا اس اعلان کے بعد مسلمانوں کے ہوش قائم رہ سکتے تھے؟ خاص کر جبکہ صحابہؓ کے قلب میں اس کا خیال بھی نہ گزرتا تھا۔ گو یہ عقیدہ ضرور تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگی مگر غلبہ محبت کی وجہ سے اس جانب التفات نہ ہوتا تھا اور اس پر تعجب نہ کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک بیوی کو انتقال شوہر پر بے حد صدمہ ہوا اور خود مجھ سے کہا کہ میں یہ سمجھتی تھی کہ مولوی مرا نہیں کرتے اس لیے مجھ کو خیال تھا کہ یہ صدمہ کبھی نہ دیکھوں گی وہ بیوی اب تک زندہ ہیں اور ان کے اس خیال کا منشاء محض علماء کی عظمت وعقیدت تھی۔ میں کہتا ہوں کہ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر صحابہؓ کی یہ حالت ہو تو کیا تعجب ہے۔

واقعہ وصال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

غایت محبت کے سبب صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی کے مشتاق تھے اس کے خلاف کا ان کو وسوسہ بھی نہ ہوتا تھا اسی لیے تو حق تعالیٰ نے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو بہت اہتمام سے بیان فرمایا ہے: "**وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم**" (یعنی اور محمد صرف رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ اپنی ایڑیوں کے بل دین حق سے پھر جاؤ گے) اور صدیق اکبرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت یہی آیت پڑھی تھی جبکہ حضرت عمرؓ جیسا مستقل مزاج شخص بھی گھبرا اٹھا اور وہ ننگی تلوار لیے کھڑے تھے کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا نام لے گا اس کی گردن اتار دوں گا۔ اب سوچو کہ جس کو کبھی یہ خیال ہی نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہمارے سامنے ہوگی بلکہ خود اپنی نماز جنازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھوانا چاہتے ہوں نہ کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھنا اس اعلان کو

سن کر ان کا کیا حال ہوگا۔ واقعی عاشق تو یہی چاہا کرتا ہے کہ میں پہلے مروں تا کہ محبوب کو میرے جنازہ پر آ کر میری بے کسی اور ثبات فی العشق کا مشاہدہ ہو کہ محبت میں ایسا پختہ رہا کہ اسی میں مر گیا اور زبان حال سے اس وقت یوں کہتا ہے:

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدنیساں بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(عشق کی کشش تجھ کو اس طرح نہ چھوڑے گی جنازہ پر اگر نہ آئے تو مزار پر ضرور آوے گا)

کبھی وہ اپنے جنازہ پر محبوب کے آنے کی تمنا کرتا ہے اور کبھی کشش عشق سے اس کو مزار پر بلاتا ہے۔ عاشق کبھی نہیں سوچتا کہ محبوب میرے سامنے مرے اور میں اس کی قبر پر جاؤں۔ اس تصور کی اس کو اہمیت کہاں ہوتی ہے۔ جب لیلیٰ مر گئی تو مجنوں کی بری حالت ہوئی اور اس کی قبر پر آیا اس وقت تک اس کو کسی نے بتلایا بھی نہیں تھا کہ لیلیٰ کی قبر کونسی ہے مگر مٹی سونگھ کر خود ہی معلوم کر لیا کیونکہ محبوب کی مٹی بھی عاشق کے شامہ میں ممتاز ہوتی ہے۔ اسی کو حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں:

ماذا علٰی من شم تربۃ احمد ان لا یشم مدی الزمان غوالیا

یعنی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربت کو سونگھ لیا اس کو عمر بھر خوشبو سونگھنے کی ضرورت نہیں۔ عشاق کو بوئے محبوب اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ چنانچہ مجنوں بھی اسی طرح لیلیٰ کی قبر پر پہنچا اور وہاں جا کر چیخ مار کر بیہوش ہو گیا' پھر عمر بھر اسی غم میں رہا حتیٰ کہ ختم ہو گیا۔ حقیقت میں محبوب کا عاشق کے سامنے وفات پا جانا سخت صدمہ جان کا ہے اسی کو حضرت فاطمہؓ دوسرے شعر میں فرماتی ہیں:

صبت علی مصائب لو انھا صبت علی الایام صرن لیا لیا

(مجھ پر اس قدر مصیبتیں پڑی ہیں اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو راتیں بن جاتے)

اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحہ وفات صحابہؓ کے لیے کیسا جانکاہ تھا کہ ایسے بڑے بڑے استقلال والے اس وقت ہل گئے۔ حقیقت میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی دین کا کام لیا گیا ورنہ سانحہ وفات سے سب کے سب معطل ہو جاتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صحابہؓ

آپس میں لڑے تھے۔ ارے کہیں ایسے عاشق بھی لڑا کرتے ہیں جو اپنے کو فنا کر چکے ہوں۔ ان حضرات نے نفس کے لیے کچھ نہیں کیا سب کچھ دین کے لیے کیا۔ اس واسطے ان کی سب لغزشیں معاف ہیں، کسی کا منہ نہیں کہ ان پر طعن کرے۔

بہرحال اس واقعہ میں صحابہؓ سے جو غلطیاں صادر ہوئیں وہ ایسی ہیں کہ دوسرا ان کو غلطی نہیں کہہ سکتا مگر چونکہ وہ بڑے درجہ کے لوگ ہیں اور خدا تعالیٰ کو ان کی تربیت منظور ہے اس وجہ سے ان کو اس خفیف خطا پر لتاڑ آگیا مگر ان کو اس لتاڑ میں بھی مزہ آیا ہوگا کیونکہ اولیاء سے زیادہ صحابہؓ میں بھی ہر مذاق موجود ہے مگر وہ حضرات ان جذبات کو زبان سے کم ظاہر کرتے ہیں اور اگر ظاہر کرتے بھی ہیں تو ان کے الفاظ مؤدبانہ ہوتے ہیں۔ مولوی غوث علی شاہ صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ مولانا رومی اور شیخ عطار اور شیخ اکبر میں باوجود اشتراک مذاق وحدۃ الوجود کے کیا فرق ہے۔ فرمایا پہلے ایک حکایت سن لو کہ تین آدمی کسی گاؤں میں پہنچے اور پانی پینے کسی کنویں پر گئے وہاں ایک عورت پانی کھینچ رہی تھی۔ ان تین شخصوں میں سے ایک نے تو یوں کہا کہ اماں پانی پلا دے۔ دوسرے نے کہا میرے باپ کی جورو پانی پلا دے۔ تیسرے نے کہا میرے باپ سے یوں تو کرانے والی پانی پلا دے۔ معنون سب کا ایک تھا مگر دیکھو عنوان کے بدلنے سے کتنا فرق ہوگیا۔ پس مولانا رومی تو اماں والے ہیں اور شیخ عطار اور شیخ اکبر دوسرے تیسرے عنوان والے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بعض صوفی پھوہڑ ہوتے ہیں وہ الفاظ کا بیباکانہ استعمال کر جاتے ہیں۔ حضرات صحابہؓ ایسا نہیں کرتے ورنہ حقائق سے خالی نہیں۔ صوفیہ کے ہر مذاق کی اصل صحابہؓ میں موجود ہے اور احوال صحابہؓ کو دیکھنے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ صوفیہ کے اس مذاق کی وہ لتاڑ سے بھی مزہ لیتے ہیں، ایک حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ حدیث میں قصہ ہے کہ بعض صحابہؓ کو جنگ احد ہی کے موقعہ پر منافقین کے لوٹ جانے سے وسوسہ ہوا کہ ہم بھی لوٹ جائیں مگر پھر سنبھل گئے۔ اس کے متعلق قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا: "**اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا والله وليهما**" یعنی مسلمانوں میں سے بھی دو جماعتوں نے قصد کیا تھا کہ جنگ سے ہٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھی (اور مددگار) تھے (اس لیے سنبھل گئے) گو اس میں ان

جماعتوں کی رسوائی کردی مگر ایک صحابی اس واقعہ کو بیان فرما کر کہتے ہیں کہ ہم کو اس آیت کے عدم نزول کی خواہش نہیں کیونکہ اس میں "واللّٰہ ولیھما" (اور اللہ تعالیٰ ان دونوں کے مددگار تھے) بھی تو ساتھ ہی کہہ دیا ہے۔ اصل میں تو شکایت کا بھی مزہ آیا ہوگا مگر انہوں نے پردہ رکھا کہ خود شکایت کا مزہ بیان نہ کیا بلکہ "اللّٰہ ولیھما" (اللہ ان کے ساتھی تھے) کے نزول سے خوش ہونے کو بیان کردیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک موقع پر صاف بیان فرمایا ہے: "مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود عتاب کا تذکرہ بھی محبوب معلوم ہوتا ہے۔

حکایت حضرت شاہ ابوالمعالی صاحبؒ

غرض صحابہ میں صوفیہ کرام کا مذاق تو موجود تھا مگر صحابہ اپنے مذاق بیان کم کرتے تھے اور صوفیہ زیادہ اوصاف صاف بیان کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک صاحب کہتے ہیں:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں تیرے لب لعل کے لیے جواب تلخ ہی بہتر ہے)

شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کی حکایت ہے کہ آپ نے ایک مرید سے جو مدینہ شریف جارہا تھا فرمایا کہ مزار شریف پر حاضر ہوکر میرا سلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردینا اس نے پہنچ کر سلام عرض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس شخص کو سلام کے جواب میں مکشوف ہوا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ اس نے آکر شاہ صاحب کے پاس جواب پہنچایا مگر بدعتی کا لفظ نقل نہیں کیا۔ شاہ صاحب کو پہلے ہی کشف ہوگیا تھا' فرمایا وہی الفاظ کہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے تھے اس نے کہا کہ حضرت جب آپ کو معلوم ہی ہے تو میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ارشاد فرمایا کہ سن کر مزا آوے گا۔ واقعی اس سننے میں بھی لطف ہے اس کے متعلق ابونواس کا شعر مشہور ہے:

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر　　ولا تسقنی سراً متی امکن الجھر

(مجھے شراب محبت پلا اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے اور مجھے پوشیدہ مت پلا جب تک ظاہر کرنا ممکن ہو)

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے قرآن سننا چاہا انہوں نے عرض کیا حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کو سناؤں حالانکہ آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا "احب ان اسمع من غیری" (پسند کرتا ہوں کہ اپنے غیر سے سنوں) معلوم ہوا کہ محبوب کے کلام کو دوسرے کی زبان سے سننے میں بھی ایک خاص لطف آتا ہے۔ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے تو پھر صوفیوں کی کیا خطا ہے۔ آخر اس مرید نے وہ الفاظ نقل کر دیئے۔ بس آپ سنتے ہی کھڑے ہوگئے اور وجد طاری ہوگیا رقص کرتے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھتے تھے:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا ہے مگر میں خوش ہوں تیرے لب لعل کے لیے جواب تلخ ہی بہتر ہے)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شاہ صاحب کو بدعتی فرمادیا تو ایسے افعال پر جو کہ صورۃً بدعت تھے کیونکہ وہ سماع میں شریک ہوتے تھے مگر وہ بدعت کے حقیقی درجہ میں نہیں پہنچے ہوئے تھے کیونکہ ان کا سماع منکرات ومحرمات سے پاک تھا اس لیے آج کل کے اہل سماع اس واقعہ سے استدلال نہ کر بیٹھیں اور جب ان کا سماع حقیقت میں بدعت کے درجہ پر نہ تھا تو ہم کو اس کی اجازت نہیں کہ شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کو بدعتی کہنے لگیں۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ادنیٰ سی بات پر گرفت کا حق ہے پھر گرفت بھی محاسبانہ انداز سے نہیں بلکہ محبوبانہ انداز میں جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وعصیٰ آدم ربہ فغوی" (اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہوگیا سو غلطی میں پڑ گئے) بس یہ حق تعالیٰ کو حق ہے کہ ان کو عصیٰ و غویٰ (قصور ہوگیا اور غلطی میں پڑ گئے) جو چاہیں فرمائیں کیونکہ وہ محبوب ہیں اور آدم علیہ السلام محب ہیں اگر ہم کہیں گے تو گت بنے گی' ہاں حکایتاً ونقلاً کہنے کا مضائقہ نہیں۔ جیسا کہ تلاوت قرآن مجید میں ہمیشہ ہی ان الفاظ کو نقل کرتے ہیں پس جس طرح آدم علیہ السلام کی طرف عصیان کی نسبت ہمارے لیے جائز نہیں اسی طرح شاہ صاحب کو بدعتی کہنے کی ہم کو اجازت نہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض ازواج مطہرات کو عقری حلقی فرمادیتے تھے مگر ہم تم نہیں کہہ سکتے۔ یہ مضمون درمیان میں اس بات پر آ گیا کہ حضرات صحابہؓ کو غزوہ احد کی لغزش پر جو

عتاب کیا گیا ہے ممکن ہے کہ بعض کو اس عتاب میں بھی لذت آئی ہو اس پر یہ حکایت شاہ ابو المعالی صاحبؒ کی بیان کر دی تھی۔

حضرات صحابہؓ کی اجتہادی غلطی

اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ لغزش اجتہاد اور عذر کی بناء پر تھی۔ جیسا کہ میرے بیان سے واضح ہو گیا ہو گا جس سے صحابہ دلگیر تھے ان کے غم کو حق تعالیٰ نے اس طرح دور کیا کہ فرماتے ہیں: "**فاثابکم غما بغم لکیلا تحزنوا**" (یعنی تم نے ہمارے نبی کو غم دیا ہم نے اس کے بدلہ میں تم کو غم دیا) اور وجہ یہ فرمائی "**لکیلا تحزنوا**" (تا کہ تم مغموم نہ ہوا کرو) اکثر مفسرین نے اس جگہ لا کو زائد کہا ہے مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری سمجھ میں آ گیا کہ لا کا زائد ہونا ضروری نہیں یعنی لا غیر زائد کہنے کی صورت میں خدا نے ایک توجیہ ذہن میں ڈال دی اور زائد تو مجبوری کو کہا جاتا ہے جب توجیہ بن سکے تو زائد کہنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ توجیہ بھی نہایت لطیف ہے۔ اول بطور مقدمہ کے یہ سمجھو کہ اگر ہم سے بڑے آدمی کی نافرمانی ہو جائے اور وہ بڑا آدمی ہم کو کچھ سزا دے لے تو شرمندگی ختم ہو جاتی ہے ورنہ قلق ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

اس مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ شریف آدمی خصوصاً عشاق کی طبیعتوں میں عمر بھر خطا سے غم رہتا ہے جب تک کہ اس کا بدلہ نہ لیا جاوے۔ بس اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس ہزیمت اور شکست میں جو تم پر مصیبت پڑی ہم نے اس کو تمہاری نافرمانی کا عوض بنا لیا ہے تا کہ تم کو یہ غم نہ رہے کہ ہم کو سزا نہیں دی گئی۔ پس اس طرح صحابہ سے بدلہ لے کر آئندہ کے لیے ان کے غم کو ختم کر دیا مگر اس سے گو وہ غم تو ختم ہو گیا جو صحابہ کو بدلہ نہ لینے سے ہوتا لیکن ایک دوسرا غم تو باقی رہ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر ان کی طرف سے حزن تھا۔ جب چہرہ مبارک کو دیکھتے کہ پہلی سی بشاشت نہیں ہے تو اور بھی رنج میں اضافہ ہو جاتا۔ صحابہ اس کی کہاں تک تاب لا سکتے تھے۔ ان کی تو یہ شان تھی کہ ایک صحابی نے قبہ دار مکان بنا لیا تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک روز اس طرف گزر ہوا تو دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ فلاں شخص کا ہے اس کو سن کر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اس کے بعد وہ صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ رخ اپنی طرف نہ دیکھا جیسا پہلے تھا بس گھبرا گئے اور صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا واقعہ ہے' انہوں نے کہا اور کچھ تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنی بات معلوم ہے کہ تمہارے مکان کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کراہت کے ساتھ خاموش ہو رہے تھے۔ اب گو اس میں یہ بھی احتمال تھا کہ اس سکوت کا کوئی اور سبب ہو مگر صحابی نے محض احتمال کراہت ہی کی بناء پر فوراً سب مکان گرا دیا اور کمال یہ کہ آ کر جتلایا بھی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نے وہ مکان گرا دیا ہے' یہ عرض کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ اللہ اکبر کتنی عظمت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حضرات کے قلوب میں۔ آج کل کے لوگ ان کی خطا کو دیکھتے ہیں مگر ان کمالات کو نہیں دیکھتے۔

پھر ایک مرتبہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ادھر گزر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ مکان گرا دیا گیا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ اور بلند تعمیر مکان کی مذمت بیان فرمائی۔ غرض حضرات صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انقباض اور بے رخی کو کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ بس اس آیت میں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انقباض کو دور فرمایا ہے کیا ٹھکانہ رحمت' خداوندی کا کہ اپنے بندوں کو کسی درجہ میں بھی غمگین نہیں رکھتے بلکہ ہر پہلو سے ان کے رنج دور کرنے کی تدابیر فرماتے ہیں۔ بھلا کہاں خدا اور کہاں بندہ اور پھر یہ توجہ بس اس حقیقت کو یا تو اس طرح تعبیر کیجئے کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت تھی محض فضل و رحمت ہے یا اس طرح رکھئے کہ خدا ہی کی شان ہے کہ بلا غرض اتنی توجہ فرماتے ہیں۔ غرض جس طرح چاہے تعبیر کیا جاوے ہر حال میں اس سے غایت درجہ کی توجہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محض رحمت ہے ورنہ خدا کی شان تو اتنی برتر ہے کہ اگر وہ بندہ کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے تو ان کو اس کا حق تھا۔ اگر بندہ برسوں بھی پکارتا تو وہاں شنوائی نہ ہوتی مگر چونکہ خدا کی صفات قدیم ولازوال ہیں اس لیے یہ شنوائی نہ ہونا لغوی معنے میں تو محال ہے مگر عرفی معنے کے اعتبار سے صحیح ہے یعنی عدم توجہ بلکہ بفرض محال (نعوذ باللہ) اگر علم وسمع لازم ذات نہ ہوتے تو بندہ اس قابل بھی نہ تھا کہ اس کے وجود کی خبر بھی اس بارگاہ عالی تک پہنچی مگر اب تو یہ محال ہے کہ

خدا کو کسی کی خبر نہ ہو اور کسی کی بات نہ سنے اسی لیے فرض محال کی قید لگا دی تھی مگر اس سے کسی ذہن کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب صفات قدیمہ ازلیہ واجبہ کی وجہ سے یہ سب باتیں وغیرہ لازم ہیں تو پھر رحمت خداوندی اضطراری ہوئی کیونکہ صفت رحمت بھی قدیم و واجب ہے اور واجب کا وجود لازم ہے تو اضطراری رحمت میں بندہ پر احسان ہی کیا ہوا۔ یہ شبہ بالکل باطل ہے کیونکہ علم وقدرت وغیرہ صفات تو ایسی ہیں کہ وہ خود بھی قدیم اور ان کا تعلق بھی قدیم ہے اور بعض صفات خود تو قدیم ہیں مگر ان کا تعلق قدیم نہیں ہے بلکہ حادث اور مشیت پر موقوف ہے۔ مثلاً رحمت کہ اس کا تعلق تو قدیم نہیں بلکہ حادث ہے جو ارادہ سے ہوتا ہے بس یاد بمعنے علم تو قدیم اور ضروری ہے اور یاد بمعنے توجہ اور رحمت کا تعلق ضروری نہیں اگر حق تعالیٰ اس کو متعلق نہ کرتے تو اس میں کوئی اشکال یا خرابی لازم نہیں آسکتی تھی بس وہ تو محض رحمت کی وجہ سے ہماری طرف توجہ کرتے ہیں:

من نکردم خلق تا سودے کنم　　　　بلکہ تابر بندگاں جودے کنم

(میں نے اس لیے مخلوق کو کہ کچھ فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لیے کہ بندوں پر جود و کرم کروں)

اسی واسطے ہم کو خدا سے بڑی امیدیں ہیں کہ وہ بلا غرض کے بندوں پر اتنی توجہ فرماتے ہیں۔ مولانا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری فرماتے ہیں کہ اگر آخرت میں بھی وہی خدا ہے جو یہاں ہے تو پھر کوئی فکر کی بات نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وہ ہمارے حال پر بڑی عنایت فرماتے ہیں امید ہے کہ وہاں پر بھی یہی برتاؤ ہوگا کیونکہ یہی خدا تو وہاں بھی ہے اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب صفت رحمت کا سالک پر غلبہ ہو تو اسی مراقبہ میں مشغول رہے کیونکہ حق تعالیٰ کے شیون مختلف ہیں سب شیون کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے۔ بس صفت رحمت کا حق یہ ہے کہ جب سالک پر اس کا ظہور ہو تو اسی کے مراقبہ میں مشغول رہے اور ادھر سے باوجود ان کے استغناء مطلق کے جس کا ابھی اوپر بیان ہوا بندہ کی طرف اتنی توجہ ہونا تو قابل غور ہے ہی مگر اس سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ادھر سے بالکل توجہ نہیں ہوتی جس میں مانعیت توجہ کا اثر ہونا چاہیے مگر پھر بھی ادھر سے توجہ ہوتی ہے۔ اللہ اکبر اول تو

وہ ذات بلاغرض توجہ کرے پھر بلاطلب طالب کے توجہ کرے یعنی مستغنی اور غیر طالب بندہ توجہ کرے بلکہ روگردان کی طرف التفات ونظر عنایت کرے واقعی غایت کرم ہے۔

اے خدا قربان احسانت شوم　　　ایں چہ احسانت قربانت شوم

(اے خدا آپ کے احسان پر قربان ہوتا ہوں یہ احسان کیا چیز ہے میں آپ ہی پر قربان ہوں)

حق سبحانہ تعالیٰ کی عجیب رحمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اس بندہ سے جو جنت میں زنجیروں سے جکڑ کر داخل کیے جاویں گے۔ یہ حدیث بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مذکور ہے۔ اس حدیث میں عجب ربنا (ہمارے پروردگار خوش ہوتے ہیں) کا لفظ آیا ہے۔ بوجہ محاورہ کے خوش ہونے کا ترجمہ کرتا ہوں یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا اور اس کا مطلب بھی خود اسی حدیث میں ان الفاظ سے آیا ہے۔ یعنی "الا سیر یوثق ثم یوثق یسلم" یعنی کہ بعض کفار دارالحرب سے زنجیروں میں جکڑ کر لائے جاتے ہیں وہ یہاں دارالاسلام میں آکر مسلمانوں کا طرز عمل دیکھ کر مسلمان ہوجاتے ہیں تو یہ لوگ گویا زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں پہنچائے گئے ہیں کیونکہ نہ وہ قیدی بن کر آتے نہ اسلام کی توفیق ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ بچوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر اکثر نہلایا جاتا ہے اور وہ روتے ہیں خود میرے ہی بچپن کا قصہ ہے کہ میں سر پر بال تو رکھتا تھا مگر کھیل میں ہفتوں سر نہیں دھوتا تھا اور اس سے بھاگتا تھا۔ ایک بار تائی صاحبہ یعنی بڑی چچی صاحبہ نے کھلی بھگو کر رکھ لی اور جب میں گھر آیا تو موقع پا کر ایک دم سے کھلی سر پر مل دی تا کہ مجبوراً سر دھونا پڑے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے برعج گر نستائی بستم می رسد (اگر خوشی سے نہ لے گا زبردستی پہنچے گا)۔

پس یہی حال ان قیدیوں کا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو زبردستی جنت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ تھے تو وہ معاند مگر پکڑ کر قید کر کے ان کو جنت میں لے گئے۔ جاہل صوفیوں نے اس حدیث کے اور معنے گھڑے ہیں کہ عشاق قیامت کے دن جنت میں جانے سے انکار کریں گے کہ ہم نے جنت کے لیے تھوڑا ہی آپ سے محبت کی ہے اس لیے ان کو زنجیروں میں جکڑ کر

لیجاویں گے۔ ارے بھائی اس مطلب کی کیا دلیل ہے بلکہ خلاف دلیل ہے کیونکہ یہ تو ایک قسم کی نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں جانے کا حکم دیں اور وہ نہ مانیں۔ کیا عشاق سے اس کا احتمال ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی جاہلوں نے تو صوفیہ کرام کو بدنام کیا ہے اور یہ تو بسا غنیمت ہے کیونکہ یہاں تو مطلب ہی میں گڑبڑ کی ہے مگر ترجمہ تو حدیث کا نہیں بدلا۔ بعض جگہ تو اس سے بڑھ کر غضب کیا ہے کہ معنی ہی غت ربود کردیئے۔ چنانچہ ایک جاہل صوفی نے "من ذالذی یشفع" (کون ہے وہ شخص جو سفارش کرے) کے معنے اس طرح کیے ہیں کہ جس نے اس کو یعنی نفس کو ذلیل کیا وہ شفا پا گیا من کو بجائے استفہام کے موصولہ لیا اور ذل کو قطع نظر رسم خط سے بمعنے اذل لیا اور ذی کو اسم اشارہ مؤنث بنایا اور یشف مضارع جو من کی جزاء ہے اور ع کو بمعنے ع صیغہ امر بمعنے احفظ لیا الٰہی تو بہ کچھ حد ہے تحریف کی۔ اور ایک صاحب نے "والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ" (قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے) کے معنے اس طرح کیے۔ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ہے۔ معلوم نہیں نفس کس لفظ کے معنے ہیں شاید لیل سے سمجھا ہو کیونکہ وہ کالی ہوتی ہے اور نفس بھی سیاہ ہوتا ہے یعنی گناہوں کی سیاہی میں ملوث ہوتا ہے اور اذا میں جو ذا ہے اس کو اسم اشارہ سمجھا ہو جس کا ترجمہ ہے یہی ایک فقیر نے ہمارے ماموں صاحب سے دریافت کیا کہ بتلاؤ رزق بڑا ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی بڑے ہیں۔ کہنے لگا بے پیرا معلوم ہوتا ہے' پھر خود ہی بیان کیا کہ دیکھو اذان میں "اشھدان محمداً رسول اللّٰہ" (گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) میں ان پہلے ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیچھے اس لیے ان بڑا ہے اور ان کہتے ہیں ہندی میں اناج کو (نعوذ باللہ من اللہ ھذا الکفریات) یہ نکتے کہلاتے ہیں فقیری کے کوئی اس جاہل سے پوچھے کہ ان کے معنی اناج کے کدھر سے ہیں کیا اذان میں ہندی لغت ہے اور کیا تقدیم ذکری افضیلت کی علت ہے۔ خدا بچاوے اس جہالت سے ایسے ہی جاہلوں نے صوفیوں کو بدنام کیا ہے مگر اس سے علماء ظاہر کو سب صوفیوں پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہوسکتا کیونکہ میں کہتا ہوں کہ آپ کی جماعت میں بھی تو ایسے جاہل موجود ہیں جو اس قسم کی ہزلیات بکتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص نے وعظ کہا اور "انا اعطینک الکوثر" (ہم نے آپ کو کوثر عطا کی) کا یہ ترجمہ کیا کہ ہم نے تجھ کو کوثر کی مانند دیا ہے۔ کسی نے دریافت کیا کہ مانند کس لفظ کے معنی ہیں تو جواب دیا کہ ایک کاف تشبیہ کا ہوتا ہے اس کے معنی مانند کے آتے ہیں اور یہ علم نحو کی بات ہے اس نے کہا کہ کاف تشبیہ کا تو گول لکھا ہوا ہوتا ہے یہ تو لمبا لکھا ہے۔ (واقعی جاہل کو سمجھانے کے لیے خوب طریقہ اختیار کیا) اس پر جواب دیا کہ ہم کو یہ بات معلوم نہیں تھی غنیمت ہے کہیں تو لاعلمی کا اقرار کیا ورنہ آج کل تو اس کا بھی کوئی جواب گڑھ دیتے۔ پس جب ایسے جاہل واعظوں کے قصوں کی وجہ سے محقق علماء کو نہیں چھوڑا جاتا تو اسی طرح جاہل صوفیوں کی وجہ سے محقق صوفیوں کو بھی نہ چھوڑا جاوے گا۔ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ بعض جاہل صوفیوں نے اس حدیث کے معنی میں تحریف کی ہے کہ حق تعالیٰ ان بندوں پر خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر جنت میں بھیجے جاتے ہیں اور میں اس سے پہلے یہ بیان کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ کی کتنی عجیب رحمت ہے کہ طالب تو طالب وہ غیر طالب بلکہ معرض روگرداں پر بھی توجہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھی زبردستی جنت میں بھیج دیا جاوے گا یعنی ان کو خدا کی رحمت سے اسلام کی توفیق ہو جاتی ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گئے تو تھے کیا ارادہ کر کے اور وہاں پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ اس جگہ ایک ضروری بات یاد آ گئی اور وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس واقعہ سے مسلمانوں پر دنیا میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ اسلام پر اس کے برکات مادیہ و روحانیہ یہ سب دنیا ہی میں عطا ہوئے اور آخرت کے برکات جدا رہے پھر بھی افسوس ہے کہ بہت لوگ یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں کفار پر رحمت زیادہ ہے واللہ یہ بالکل غلط ہے۔ خدا کی قسم پھر خدا کی قسم پھر خدا کی قسم دنیا میں بھی مسلمانوں ہی پر زیادہ رحمت ہے اور دلیل اس کی یہ آیت ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"**فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللّٰہ لیعذبھم بھا فی الحیوٰۃ الدنیا و تزھق انفسھم وھم کفرون**" یعنی کفار کو مال واولاد اس واسطے دیا ہے کہ ان کو دنیا میں عذاب دینا منظور ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے کفار کو جیسے اولاد و مال زیادہ دیا ہے ویسے ہی ان کو ان اشیاء کی محبت بھی زیادہ دی ہے جس کی وجہ سے ہر دم وہ اس ادھیڑ بن میں لگے رہتے

ہیں کہ اولاد کس طرح ہو مال کیسے بڑھے نفع کس طرح حاصل ہو اور اس فکر کی وجہ سے کسی وقت ان کو چین اور راحت نصیب نہیں ہوتی اور رحمت کا اثر دراصل راحت اور چین ہی ہے اور وہ اگر میسر ہے تو مسلمانوں کو میسر ہے یہ دوسری بات ہے کہ ان میں باہم تفاوت ہو۔

اہل اللہ کے برابر کسی کو چین میسر نہیں

کہ ادنیٰ مسلمان کو ادنیٰ درجہ کی راحت اور اعلیٰ درجہ کے مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی راحت باقی کفار کے مقابلہ میں عموماً سب مسلمان راحت میں ہیں کیونکہ وہ طالب آخرت ہیں اور کفار طالب دنیا ہیں اور دنیا کی یہ حالت ہے:

گر گریزی بر امید راحتے ہم از انجا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

دنیا کی کوئی چیز آفت سے خالی نہیں پھر اس طالب دنیا کو راحت کہاں اور آخرت کی یہ شان ہے

ہیچ کنجے بے ددو بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ حق طلب آخرت ہی تو ہے کہ لقاء حق کا سامان کرے اور اس کے بعد علاوہ دلیل کے میں مشاہدہ کراتا ہوں اور ایک نظیر بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دنیا میں اہل اللہ تو موجود ہیں ان کو دیکھ لو کس حال میں ہیں ان کا حال دیکھ کر یہ کہو گے:

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست خم و خمخانہ با مہرو نشانست

(اب بھی وہ ابر رحمت درفشاں ہے خم اور خم خانہ مہر و نشاں کے ساتھ موجود ہے)

نبوت تو ختم ہو گئی ہے مگر ولایت تو ختم نہیں ہوئی اہل اللہ اس وقت بھی موجود ہیں تجربہ کر لو تم چند روز اہل اللہ کی صحبت میں رہو اور طالبات دنیا کی صحبت میں بھی رہو اور دونوں جگہ محرم راز بن کر رہو جس سے صحیح حالات دونوں جگہ کے معلوم ہو سکیں۔ واللہ معلوم ہو جاوے گا کہ راحت اور چین اہل اللہ ہی کو نصیب ہے۔ اس سے زیادہ کیا دلیل لاؤں اگر مشاہدہ غلط ہوگا تو آ کر ہاتھ پکڑ لینا مگر قبل تجربہ کے اعتراض کا حق نہیں اور میں اس کا راز بھی کھولے دیتا ہوں کہ اہل اللہ کو سب سے زیادہ راحت کیوں ہے وہ یہ کہ غم ہوتا ہے خلاف توقع سے اور

اہل اللہ نے توقع ہی کو قطع کر دیا ہے یعنی وہ دنیا کی کسی چیز سے توقع کو وابستہ نہیں کرتے اور نہ کسی معاملہ میں ان کی کوئی تجویز ہوتی ہے بلکہ وہ ہر معاملہ میں وہی چاہتے ہیں جو حق تعالیٰ چاہتے ہیں تم بھی حق تعالیٰ سے تعلق پیدا کرلو تو تمہاری سب خواہشیں اس کی مشیت میں فنا ہو جاویں گی۔ پھر یہ حال ہوگا کہ ع..... ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ بادشاہ کرتا ہے وہی خوشگوار ہوتا ہے) جب تفویض ہوگئی تو یہ حالت ہو جاوے گی۔

ناخوش تو خوش بود برجان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

اور یوں کہو گے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں' دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں)

غرض غم ان کے پاس نہیں پھٹکتا۔

اہل اللہ کے غمگین نہ ہونے کا راز

اور ایک لطیفہ اور بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اگر کسی وقت ان کو غم ہی کا مرادحق ہونا معلوم ہو جاوے تو پھر وہ غم ہی میں مشغول ہو جاتے ہیں کیونکہ اصل مقصود تو رضا و قرب ہے نہ خوشی مقصود ہے نہ غم مقصود ہے اس لیے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا غمگین ہونا ہی مطلوب ہے تو اس وقت غمگین بن جاتے ہیں اور غم ظاہر کرتے ہیں مگر ماتم نہیں کرتے بلکہ کبھی چہرہ سے کبھی کسی بات سے غم ظاہر ہو جاتا ہے باقی اہتمام اظہار غم کا نہیں کرتے کیونکہ اظہار غم کا اہتمام کرنا شرعاً ممنوع ہے اور وہ غم ہی کیا ہوا جس کے ظاہر کرنے کے واسطے اہتمام کیا جاوے وہ تو تصنع اور بناوٹ ہوگی۔ غم تو وہ ہے جو خود بخود اضطراراً ظاہر ہو اس تصنع پر ایک خادمہ کی حکایت یاد آ گئی جو ہمارے گھر نوکر تھی اور یہاں سے پہلے ایک شیعی نواب

کے یہاں رہتی تھی وہ ایک بار ماتم میں شریک ہوئی۔ تھوڑا سا ماتم کر کے شیرینی تقسیم ہوتی تھی ایک بار تقسیم میں اس کو بھول گئے اس کو شیرینی میں حصہ نہ ملا اس کے بعد پھر ماتم شروع ہوا' ہائے حسن ہائے حسین' اس نے بجائے ماتم کے ہائے جلیبی ہائے ریکبی کہنا شروع کیا۔ عورتوں کو معلوم ہوا کہ اس کو جلیبی نہیں ملی تو اس کو بھی حصہ دیا گیا۔ اس بیچاری نے ظاہر کر دیا کہ اصل تو جلیبی تھی نہ کہ ماتم اوروں نے گو ظاہر نہ کیا ہو مگر مقصود سب کا مٹھائی ہی ہوتی ہے جس کا امتحان ہو سکتا ہے کہ ماتم میں شیرینی تقسیم نہ کرو پھر دیکھو کتنے آدمی آتے ہیں۔ بس گویا ان کے مذاق پر ایک ریکبی اور چار جلیبی مل کر پنجتن ہو جاتے ہیں ورنہ کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت ہے ماتم کی پھر اس کو دین کہا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس غم کے اظہار کا اہتمام ہو وہ تو تصنع ہے جیسا اس قصہ میں مذکور ہوا لیکن اللہ والے اس غم کا اظہار بھی نہیں کرتے اس میں بھی وہ خوش ہی ہیں اور غم کے وقت بھی صرف اس لیے طبعاً غمگین ہوتے ہیں کہ محبوب کو انہیں غمگین دیکھنا منظور ہے باقی اندرون دل سے عقلاً وہ اس وقت بھی رضا کے ساتھ مسرور ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے اہل اللہ نے جو چیز دیکھی ہے اس کے ہوتے ہوئے ہر حال میں ان کا خوش رہنا کیا کمال ہے خدا کا احسان مانو جس نے یہ حقائق منکشف کیے اور یہ مقامات عطا فرمائے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کند ۔۔۔۔۔ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

(احسان مت جتاؤ کہ ہم بادشاہوں کی خدمت کرتے ہیں بلکہ احسان مانو کہ تم جیسے نااہلوں کو اس نے خدمت میں رکھ چھوڑا ہے)

الغرض دنیا میں مؤمنین پر جتنی رحمت ہے اس کا کوئی جزو بھی کفار پر نہیں چنانچہ اس واقعہ احد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو مسلمانوں کی راحت کا کس درجہ اہتمام ہے کہ اول "لقد عفا اللہ عنھم" (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) فرما چکے ہیں جس سے آخرت کی طرف سے ان کو بے فکر کر دیا گیا کہ تم سے وہاں گرفت نہ ہوگی۔ اس کے بعد ان کی دنیا کی راحت کا سامان فرماتے ہیں کیونکہ اگر صرف آخرت ہی میں مسلمانوں پر رحمت فرما دیتے تو یہی کافی تھا۔ عفا اللہ عنھم (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) فرما دینا بلکہ اس جگہ اس کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہ تھی جب آخرت میں پہنچتے وہاں رحمت فرما دیتے مگر اس پر بس

نہیں کیا گیا بلکہ دنیا میں بھی ان کو اس طرح راحت پہنچائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انقباض جو صحابہؓ کے لیے موجب کوفت تھا اس کے ازالہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اگر حق تعالیٰ کو دنیا میں مسلمانوں کو راحت دینا منظور نہ تھا تو یہ اہتمام کیوں کیا جاتا۔ اگر اس راحت دنیوی پر کسی کو شبہ ہو کہ افلاس وغیرہ تو اہل اللہ کو بھی ہوتا ہے پھر اہل اللہ سے غم کی نفی کیسے صحیح ہے۔

اسباب راحت

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ اسباب غم ہیں عین غم نہیں اس میں لوگوں کو بہت خلط ہو رہا ہے کہ اسباب کو عین مسبب سمجھتے ہیں اسی طرح یہ بھی سمجھو کہ راحت اور ہے اور اسباب راحت اور۔ پس یہ ضروری نہیں کہ جہاں اسباب غم موجود ہوں وہاں غم بھی موجود ہو۔ مثلاً کسی کو ان کا محبوب زور سے دباوے کہ ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو کہ محبوب دبا رہا ہے تو گو سبب موجود ہے مگر غم اصلاً موجود نہ ہوگا بلکہ شوق میں یہ کہا جاوے گا:

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بلکہ اس وقت اگر محبوب یہ بھی کہے کہ تم کو تکلیف ہوتی ہو تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں تو اس وقت یوں کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

بس معلوم ہو گیا کہ دبانا عین تکلیف نہ تھا بلکہ اسباب تکلیف میں سے تھا۔ چنانچہ جب معلوم ہو گیا کہ دبانے والا محبوب ہے تو سب تکلیف جاتی رہی بلکہ اب سبب راحت بن گیا۔ اسی طرح اہل اللہ کے ظاہری مصائب کو سمجھو۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ اسباب ہیں غم کے خود غم نہیں اور اہل اللہ سے ہم غم کی نفی کرتے ہیں اسباب غم کی نفی نہیں کرتے خوب سمجھ لو مگر ان اسباب کے ساتھ بھی اہل اللہ سے غم منتفی ہے کیونکہ اہل اللہ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے محبوب حقیقی کا تجویز کردہ ہے تو اس تصور سے سارا غم ڈھل جاتا ہے۔ شروع میں تو یہ بات عقلی ہی ہوتی ہے مگر آخر میں طبعی بن جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب اہل اللہ خدا

تعالیٰ کے خاص بندے ہیں محب وعاشق ہیں تو ان کو یہ تکلیف کیوں دی جاتی ہے اور اہل اللہ کو تکلیف میں لذت کس طرح حاصل ہوتی ہے یہ تو کچھ کمال نہ ہوا بلکہ بے حسی معلوم ہوتی ہے تو اس سائل سے میں پوچھتا ہوں کہ محبوبان دنیا جو اپنے عشاق سے ناز و انداز کرتے ہیں ان میں کیا حکمتیں ہیں اور عشاق کو ان میں لذت کیوں آتی ہے محبوب کے چپت مارنے میں لذت کیوں ہے عاشق کو اس سے کیا نفع ہوا کچھ نہیں۔

محبت کا خاصہ

بس یہی کہا جاوے گا کہ محبت کا خاصہ ہے کہ محبوب عشاق کو آزمایا بھی کرتے ہیں ان سے ناز و انداز بھی کیا کرتے ہیں اور عشاق کو اس میں لذت بھی آتی ہے اگر اس کا نام بے حسی ہے تو ساری دنیا بے حس ہے کیونکہ محبت سے کوئی خالی نہیں خواہ کسی سے ہو۔ غرض اہل اللہ کی راحت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تجویز کو فنا کر دیا ہے۔ بس ایسے لوگ دنیا میں بھی راحت سے ہیں جو اپنی تجاویز کو حق سبحانہ کے سامنے فنا کر چکے ہیں۔ اسی ازالہ غم کے لیے تو حق جل جلالہ نے ”ولنبلونکم الخ“ (ہم تمہاری ضرور آزمائش کریں گے) کے بعد ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کا مراقبہ تعلیم فرمایا ہے یعنی جب کوئی غم کی بات ہو تو کہو کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں وہ مالک ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ مطوی ہے کیونکہ ایک مقدمہ منتج نہیں ہوتا گو آج کل کے بعض عقلاء قائل ہوئے ہیں کہ ایک مقدمہ بھی منتج ہے اور مطوی ماننا تکلف ہے مگر صحیح یہی ہے کہ نتیجہ مقدمتین سے حاصل ہوتا ہے اور ایسے مقام پر کہ جہاں بظاہر ایک ہی مقدمہ منتج معلوم ہوتا ہے دوسرا مقدمہ مطوی ہوتا ہے یہاں یہ مانا جاوے گا کہ وہ مالک ہونے کے سبب تصرف کا حق رکھتا ہے تو پھر تم کو چون و چرا کا کیا حق ہے۔ یہ عقلی مراقبہ تھا اور ”انا الیہ راجعون“ (ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں طبعی مراقبہ ہے اور اس میں دو مرتبے ہیں ایک عشاق کی نظر میں ہے کہ جب خدا مل گیا تو پھر غم کیسا اور ہم کو دوسری وجہ سے اس مراقبہ میں تسلی ہوئی یعنی یہ سمجھ کر کہ وہاں لوٹ کر سب مل جاویں گے۔ اس عالم

میں ہم اور یہ مفقود جس کے فقدان کا رنج ہے باہم مجتمع ہو جاویں گے۔ سبحان اللہ قرآن کی بھی کیا شان ہے کہ اس سے ہر شخص کو اس کے درجہ کے موافق تسلی ہوتی ہے۔ ایسے جامع الفاظ میں جن سے عوام بھی تسلی حاصل کریں اور خواص بھی ع تسلی داد ہر یک رابرنگے (ہر ایک کو ایک طریقے سے تسلی دی) بس قرآن مجید کی شان یہ ہے:

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت رابہو ارباب معنی را

(اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جاں کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

چنانچہ اسی "انا للہ وانا الیہ راجعون" سے عشاق نے تو یوں سمجھا کہ عالم آخرت میں ہم کو اللہ تعالیٰ ملے گا بیوی نہ رہی نہ سہی اور عوام نے یہ سمجھا کہ وہاں یہ بیوی بھی مل جاوے گی اور اس کے سوا اور بھی بہت کچھ ملے گا' اپنے مذاق اور مرتبہ کے موافق تسلی سب کی ہوگئی۔ بس جب عامہ مؤمنین کو بھی مغموم نہیں رکھتے بلکہ اگر کبھی انہیں کی مصلحت سے جو ان کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو اس میں تسلی کی تدابیر بتلاتے ہیں تو صحابہؓ کو کیسے مغموم چھوڑ دیتے تمہید لمبی ہوگئی مگر کچھ حرج نہیں مفید مضامین آگئے ہیں اور وہ سب ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے افراد ہیں۔ گو اس وقت آپ کا ذکر بواسطہ مقصود تھا مگر الحمد للہ بلا واسطہ بھی ہوگیا۔

شان صحابہؓ

کیونکہ آیت میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات صحابہؓ کے ساتھ مذکور ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ کی لغزش پر تنبیہ کر دینے کے بعد صحابہؓ کا غم دور کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص ارشاد ہے۔ عفو و استغفار للصحابةؓ (صحابہ کیلئے) کا اور اس سے پہلے "فبما رحمة من اللہ لنت لھم" (بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے) اس کی تمہید ہے کیونکہ صحابہؓ کو اور تو کوئی غم نہ رہا تھا سب سے حق تعالیٰ نے تشفی کر دی تھی اب صرف ایک غم باقی رہ گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں اس لیے حق تعالیٰ آپ کو ارشاد فرماتے ہیں: "فاعف عنھم" (تو آپ ان کو معاف

دیکھنا یہ ہے کہ اس مضمون کو کس طرح فرماتے ہیں یعنی "فقط فاعف عنھم" (آپ ان کو معاف کردیجئے) نہیں فرمایا بلکہ اس کے پیشتر ایک تمہید بیان فرمائی جس سے آپ کی جمالت، رحمت اور جلالت نبوت کی خاص شان معلوم ہوتی ہے کیونکہ بدون اس تمہید کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طبعی انقباض زائل ہونا دشوار تھا اس لیے اول ارشاد فرمایا "فبما رحمۃ" (رحمت کے سبب) کہ آپ اپنے لین وشان رحمت کو دیکھئے پھر اس کے ساتھ "من اللہ" یعنی اللہ ہی کی رحمت کے سبب بڑھایا کہ یہ رحمت حق تعالیٰ نے آپ کے اندر رکھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ بہت بڑے درجہ کی رحمت ہے پھر مصلحت اس رحمت کی بیان فرمائی ہے کہ آپ کو نرم اس واسطے بنایا کہ اگر آپ فظ ہوتے یعنی ظاہر میں سخت کلام ہوتے "غلیظ القلب" یعنی اگر آپ دل کے بھی سخت ہوتے تو نتیجہ یہ ہوتا "لانفضوا من حولک" یعنی صحابہؓ آپ کے پاس سے چلے جاتے۔ ان ارشادات کے بعد کہ متضمن ہیں خاص مراقبات کو طبعی انقباض بھی نہیں رہ سکتا۔ پس صحابہؓ کا ہر قسم کا غم دور کردیا گیا اور یہ مقام ایک خاص مسئلہ میں مزال اقدام ہے (قدموں کے پھسلنے کی جگہ) مشائخ مبطلین کے واسطے انہوں نے اس سے یہ سمجھا کہ اپنے ساتھ لوگوں کو لگائے لپٹائے رکھنا خوب مطلوب شرعی ہے اور اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان لین کا اثبات بقصد امر اور فظاظت وغلظت کی نفی بقصد نہی مذکور ہوئی ہے تو انہوں نے مجمع کی دلجوئی کے لیے نرمی اور شفقت ہی کو لے لیا اور داروگیر ودرشتی کو بالکل چھوڑ دیا اور جو مصلح ایسا کرے اس پر ملامت وطعن کرتے ہیں لیکن مشائخ محققین اس غلطی میں نہیں پڑتے وہ کلام کی حقیقت کو سمجھ گئے اسی لیے وہ معتدل ہوتے ہیں کہ نرمی کی جگہ نرم اور سختی کی جگہ سخت کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر ہے وہاں جنگ احد کے بعد جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "فاعف عنھم" (آپ ان کو معاف کردیجئے) کا امر ہوا تھا۔

غزوہ تبوک اور واقعہ کعب بن مالکؓ

تبوک میں جو جنگ سے بہت مؤخر ہے۔ یہ واقعہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شہر کے مسلمانوں کو منع فرمایا کہ کعب بن مالک اور ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع سے نہ بولیں کیونکہ یہ حضرات بدون کسی عذر قوی کے غزوہ تبوک سے مختلف رہے تھے جس میں

شرکت کا سب کو امر ہوا تھا پھر پچاس روز تک یہ حکم رہا۔ اس عتاب سے ان حضرات کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ جس کو قرآن شریف میں بھی اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: "**وضاقت علیھم الارض بما رحبت**" یعنی ان کو زمین تنگ نظر آتی تھی (باوجود وسعت) کے کوئی دوسرا شخص یہ حالت بیان کرتا تو غالباً مبالغہ پر محمول کیا جاتا مگر جب خود خدا تعالیٰ نے ان کی یہ حالت بیان فرمائی ہے تو اندازہ کرلو کہ ان حضرات پر کیا گزرتی ہوگی اور خطا صرف یہ تھی کہ جنگ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے کچھ منافقین بھی پیچھے رہ گئے تھے مگر وہ تو بہانہ کر کے بچ گئے اور ان تین حضرات نے صاف صاف عرض کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ہم کو کوئی عذر نہیں تھا' تخلف کے باعث محض سستی تھی اس پر ان کا مقدمہ ملتوی کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو ان سے کلام وسلام قطع کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں حضرت کعب کے پاس ایک نصرانی بادشاہ کا خط آیا کہ ہم کو معلوم ہوا کہ تمہارے آقا نے تمہارے ساتھ بہت بے قدری کا برتاؤ کیا تم یہاں چلے آؤ ہم تمہاری بہت عزت کریں گے۔ غرض یہ کہ ابتلاء پر ابتلاء ہوا کس قدر سخت امتحان تھا۔

بیم سر یا بیم جاں یا بیم دیں　　　امتحانے نیست مارا مثل ایں

(سر کا خوف جان کا ڈر دین کا خطرہ ہمارے لیے اس کی مثل کوئی امتحان نہیں ہے)

مگر ان کی ہمت کہ جواب تک نہیں دیا بلکہ اس کو پڑھتے ہی ایک تنور میں جو قریب تھا فوراً جھونک دیا۔ گو بزبان حال قاصد سے یہ کہا کہ آنست جوابش کہ جوابش ندہم (اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو میں جواب نہ دوں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خط کی اطلاع ہوئی مگر اس واقعہ پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے مبارک نہیں بدلی کیونکہ وہاں تو سب کام حکم سے تھا وہاں حکم کے سامنے کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی بگڑ جاوے گا یا کوئی مخالف ہو جاوے گا اس دربار کی تو یہ شان ہے:

ہر کہ خواہد گو بیاید ہر کہ خواہد گو برو　　دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

(جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہے چلا جائے اس دربار میں چوبدار چوکیدار داروگیر نہیں ہیں)

وہاں احسان کس پر تھا کسی کو ہزار غرض ہو تو دربار میں ناک رگڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کو خدا کافی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے محتاج نہ تھے اس لیے آپ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی کہ ان کو ایک دشمن بلا رہا ہے لاؤ میں ان کے ساتھ کچھ نرمی کروں' ہرگز نہیں۔ جب پورے پچاس دن ہو چکے تب آیت نازل ہوئی اور حضرت کعب بن مالک کہتے ہیں جیسا حدیث میں آیا ہے کہ بڑا غم یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی حالت میں اس عالم سے تشریف لے گئے تو بعد میں میرا کیا حال ہوگا کیونکہ جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار صحابہؓ حکم کے خلاف ہرگز نہ کریں گے تو بس ساری عمر کو مسلمانوں سے بول چال بند رہے گی اور اب تو تبدیل حکم کی امید بھی ہے کہ وحی آ جاوے پھر تو یہ احتمال بھی منقطع ہو جاوے گا اور اگر میرا انتقال اسی حال میں ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے۔

نیز ان کے لیے زیادتی غم کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ساتھی تو بوڑھے تھے وہ تو گھر میں بیٹھ رہے جس سے ایک قسم کی یکسوئی ہو گئی اور یہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ کر نظر پھیر لیتے تھے تو ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر یہ کن آنکھوں سے دیکھتے رہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو دیکھتے ہیں یا نہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نماز پڑھا کرتا جب نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو دیکھا کرتے تھے اور جب میں آپ کو دیکھتا تو آپ نظر ہٹا لیتے تو اصول عشق سے عجب نہیں کہ جب یہ دیکھتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف دیکھ رہے ہیں تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے ہوں کیونکہ اگر یہ بھی دیکھتے رہتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم عادت کے موافق اپنی نظر ہٹا لیتے اور یہ بھی ایک محبوبانہ انداز تھا:

خوبی ہمیں کرشمہ ناز و خرام نیست　　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(حسن اسی ناز و خرام اور کرشمہ کا نام نہیں ہے حسینوں کی بہت ادائیں ایسی ہیں جن کا نام نہیں ہے)

اور حضرت کعب اصول عشق سے اپنے دیکھنے سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے کو لذیذ سمجھتے ہوں گے اس لیے خود نہ دیکھتے ہوں گے جس کو محبت کا چسکا لگا ہے اس کے مزہ کو وہی جانتا ہے۔

ذوق این می نشناسی تا بخدا نچشی
(اس شراب محبت کو ذوق بخدا جب تک نہ پیو نہیں جان سکتے)

اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں کی ضرورت ہے

الحمدللہ تھوڑی سی حس ہم کو بھی نصیب ہے اور یہ لذت کہ محبوب ان کو دیکھے گو یہ محبوب کو نہ دیکھیں کچھ عشاق کی گھڑت نہیں بلکہ اس کی اصل قرآن شریف میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے: "واصبر لحکم ربک فانک باعیننا" کہ آپ اس لذت میں مشغول رہئے کہ میں خدا کے سامنے ہوں وہ مجھ کو دیکھ رہے ہیں۔ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ بتلایا ہے کہ کفار کی ایذاؤں پر صبر کے واسطے کہ اس سے آپ کا تنج کافور ہو جائے گا۔ صاحبو! صحیح مذاق قرآن شریف میں سب موجود ہیں البتہ من گھڑت باتیں اس میں نہ ملیں گی۔ غرض کبھی اپنے محبوب کو دیکھنے میں لذت ہوتی ہے اور کبھی محبوب کے ان کو دیکھنے اور خود اِدھر نگاہ نہ کرنے میں لذت ہوتی ہے تا کہ وہ دیکھتا رہے۔ یہی حالت حضرت کعبؓ کی تھی اور اس سے معلوم ہوا کہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر ناراض تھے مگر دل سے ناراض نہ تھے بلکہ دل سے ان کی طرف توجہ تھی۔ اسی توجہ نے تو ان کو سنبھالا۔ حضرت کعبؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے کن آنکھوں سے یہ بھی دیکھتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب کے لیے لبہائے مبارک کو حرکت دی یا نہیں؟

اب بتلایئے کیا یہ واقعات سیاست کے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کیا' ایسا برتاؤ کرنا آج جائز نہیں' یقیناً جائز ہے۔ پس محققین پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے اگر وہ اس کے موافق عمل کریں۔ آج کل لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص سخت ہے حالانکہ وہ سختی نہیں اور اگر یہ سختی ہے تو میں کہوں گا ارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو ایسی سختی کی ہے بلکہ آخر عمل وہی ہے۔ یاد رکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاں یہ کمال ہے کہ لین اور نرم مزاج تھے وہاں یہ بھی کمال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سختی کے موقع پر سخت بھی تھے۔ کیا یہ بھی کوئی تعریف ہے کہ ڈاکٹر فقط مرہم رکھے اور کسی شخص کے باوجود ضرورت کے شگاف نہ دے ہرگز نہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہمیشہ ایسا کرے گا تو اس کے مریض ہلاک ہوں گے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ مرہم

کے موقع پر مرہم رکھو اور شگاف کے موقع پر شگاف دو تو جس طرح شگاف اور مرہم دونوں کی ضرورت ہے اسی طرح اصلاح میں نرمی اور سختی درکار ہیں۔ اسی بناء پر یہاں واقعہ تبوک میں اصلاح کے لیے سختی کی گئی اور وہاں واقعہ احد میں اصلاح کے بعد "فاعف عنھم" (سو آپ ان کو معاف کر دیجئے) فرمایا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ "لو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک" (اگر آپ تندخو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب لوگ منتشر ہو جاتے) میں مبطلین کو غلطی ہو گئی کہ انہوں نے مطلقاً نرمی کو ضروری سمجھا تا کہ مجمع جما رہے حالانکہ نرمی مطلقاً مطلوب نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا اور جو مطلوب بھی ہے وہ نرمی نہیں جو ان لوگوں نے اختیار کی ہے۔ اصل یہ ہے کہ نرمی کی دو قسمیں ہیں ایک نرمی تو وہ جو لوگوں کی دینی مصلحت سے ہو اور ایک نرمی وہ جو اپنی دنیوی مصلحت سے ہوتا کہ لوگ زیادہ معتقد ہوں یعنی جاہ زیادہ ہو آمدنی زیادہ ہو تو یہ لوگ معتقدوں کا مجمع بڑھانے اور زیادہ آمدنی کے ہونے کی وجہ سے نرمی بلکہ بعض مرتبہ خوشامد تک اختیار کرتے ہیں اور نیت ملفوظی کے طور پر وجہ یہ گھڑتے ہیں کہ ان کو ہدایت ہوگی۔ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ ہدایت سے محروم ہو جاویں گے۔ ذرا یہ پیر صاحب غور تو کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالم سے تشریف لے جانے پر تو ہدایت بند نہ ہوئی آپ سے تعلق موقوف ہونے پر بند ہو جاوے گی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور خدام جو دین کی خدمت کر رہے ہیں اس سے درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض باقی ہے کیونکہ ان حضرات میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے جس سے مخلوق کو ہدایت ہو رہی ہے اور اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض لینے کی یہی صورت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین سے فیض حاصل کیا جائے۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں:

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب	بوئے گل را از کہ جوئیم جز گلاب
چونکہ شد خورشید وما را کرد داغ	چارہ نبود در مقامش از چراغ

(موسم گل ختم ہو گیا اور چمن اُجڑ گیا' گلاب تو ہے نہیں جس سے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے اس کی بو حاصل کر لو چوں کہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اب اس کی جگہ چراغ ہی کافی ہے)

مگر ظاہر میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم سے تشریف لے ہی گئے اور پھر بھی ہدایت کا سلسلہ جاری ہے تو اے پیر کیا تیرے بغیر ہدایت گم ہو جائے گی ہرگز نہیں بس بیٹھ اپنا کام کر۔ بس تمہارا یہ کہنا کہ نرمی میں ہماری یہ نیت ہے کہ مخلوق کو ہدایت ہو محض لفظی نیت ہے قلبی نیت نہیں ہے۔ نیت ملفوظی پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک جگہ میں سفر میں تھا لوگوں نے مجھ سے نماز پڑھانے کی درخواست کی۔ میں نے عذر کیا کہ میں مسافر ہوں نماز میں قصر کروں گا اور عوام قصر کی وجہ سے گڑبڑ میں پڑ جاتے ہیں اس لیے کوئی مقیم نماز پڑھاوے تو بہتر ہے۔ تو ایک صاحب نے اس وقت مجھے نیت اقامت کا مشورہ دیا کہ اقامت کی نیت کر لیجئے اور چار رکعت پڑھا دیجئے۔ میں نے کہا سبحان اللہ بھلا اس حالت میں کہ میں سواری کے لیے آدمی بھیج چکا اور ٹکٹ کے لیے دوسرا آدمی بھیج چکا ہوں اقامت کی نیت کس طرح کر سکتا ہوں اور اگر کروں گا تو وہ محض الفاظ ہی الفاظ ہوں گے نیت کدھر سے ہو جائے گی۔ بس ایسی ہی ہدایت کی نیت شیخ مبطل کی ہے کہ اس کے نزدیک اصل چیز تو مال یا جاہ ہے مانعۃ الخلو کے طور پر یعنی کہیں مال و جاہ دونوں مقصود ہوتے ہیں کہیں ایک مگر زبان سے نیت ہدایت اور اتباع سنت اور خوش خلقی کا دعویٰ ہے۔ شیخ جی صاحب اول تو دنیا میں سارے بیوقوف نہیں بستے سب دھوکہ میں نہیں آ سکتے۔ دوسرے تم کو تو اپنی حالت بخوبی معلوم ہے اگر تمام مخلوق دھوکہ میں آ گئی تاہم خدا سے تو مخفی نہیں اس کے سامنے کیا جواب دو گے۔ کیا وہاں بھی یہ تصنیفی وجہ چل سکتی ہے ہرگز نہیں رہی نرمی کی دوسری وجہ جو شرعاً مطلوب ہے یعنی لوگوں کو دینی مصلحت سے نرمی اختیار کرنا وہ وجہ ہر موقع کے لیے عام نہیں ہو سکتی کیونکہ جہاں اصلاح کے واسطے سختی کی ضرورت ہے وہاں نرمی کرنے میں دوسروں کی کیا مصلحت ہے۔

مشائخ مبطلین کی غلطی کا منشاء

اب میں ان مشائخ مبطلین کی غلطی کا منشاء بتلاتا ہوں کہ اس آیت سے انہوں نے ہر حال میں نرمی کی ضرورت کس طرح سمجھی۔ بات یہ ہے کہ ترجمہ آیت سے یہ لوگ یوں سمجھے کہ مقصود بالکلام انفضاض کا انسداد ہے اور اس کے لیے لین کی ترغیب اور فظاظت و غلظت سے کی گئی ہے اس لیے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہر حال میں نرمی کرنا چاہیے تا کہ لوگ مجتمع رہیں حالانکہ یہ

سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ آیت کا یہ مدلول ہی نہیں کہ اجتماع خلق مقصود ہے اور اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرمی کا حکم ہے اگر یہ مطلب ہوتا تو اجتماع خلق مقصود ہوتا تو ابن اُم مکتوم کے واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کیوں ہوتا حالانکہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرداران قریش کو دعوت اسلام دے رہے تھے جن کے مسلمان ہوجانے سے مجمع کی زیادت وقوت کی توقع تھی اسی وقت ابن ام مکتوم نابینا صحابی آ گئے اور کچھ دریافت کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قدر ان کا سوال گراں ہوا اس پر سورہ عبس نازل ہوئی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجمع کا بڑھانا اور اس کا اہتمام کرنا مطلوب نہیں بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے عفو اور ان کے لیے استغفار کا اور ان کی دلجوئی کا حکم فرماتے ہیں۔ پس اصل مقصود تو "فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم" (تو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور خاص خاص امور میں آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے اور "فبما رحمة من الله لنت لهم" (بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب سے آپ ان سے نرم رہے) اس کی تمہید ہے خود مسوق لہ الکلام اور مقصود نہیں جس سے لین کی ترغیب پر استدلال کیا جا سکے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ آپ ہمیشہ سے ان کی مصلحت افاضہ کے لیے ان کے ساتھ نرمی فرماتے رہے جس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فظاظت اور غلظت کے لوازم میں سے انفضاض ہے اور یہاں انفضاض نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ آپ فظ اور غلیظ القلب نہیں۔ پس اس سے تاکید ہوئی آپ کے لین کی۔ پس آپ ہمیشہ سے ان کے ساتھ نرم رہے ان کو یہی عادت ہوگئی اب بھی اس عادت کے موافق برتاؤ کیجئے اور معاف کر دیجئے تو یہاں تمہیداً لین کی خبر ہے۔ لین کا امر مقصود نہیں گو ضمناً وہ بھی مفہوم ہوتا ہے یہ ہے آیت کا مطلب مگر اہل غرض کو فہم کہاں اور ان کو ضرورت بھی کیا ہے غور و فہم کی۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب غرض آ جاتی ہے ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے دل سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں)

ان لوگوں نے نہ معلوم کس طرح آیت سے یہ مطلب نکال لیا کہ اجتماع کے لیے نرمی برتنا چاہیے اور اجتماع اور اس کا اہتمام مطلوب ہے دوسرے اگر بالفرض آیت کا وہی مطلب

مان لیا جاوے جو یہ لوگ سمجھتے ہیں تو ایک بڑا فرق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان شیخ صاحب میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہونے میں تو ہدایت منحصر تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی ہدایت کے باب میں کہ

عزیزے کہ ہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت بہر درکہ از درگہش سر بتافت

(ایسا غالب حسن جس نے اس کی درگاہ سے سر پھیرا جس دروازہ پر گیا کچھ عزت نہ پائی)

وجہ یہ کہ نبی سے منقطع ہونے میں نجات کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اب یہ شیخ صاحب بتلائیں کہ کیا ان کے ساتھ وابستہ ہونے میں بھی ہدایت خلق منحصر ہے اگر ہے تو اس کی دلیل بیان کریں اور اگر نہیں تو پھر وہ کس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نرمی نہ کریں تو مخلوق ہدایت سے محروم ہو جائے گی' آخر کیوں محروم ہو جائے گی؟ کیا آپ کے سوا اور کوئی ہادی نہیں؟ پس اس فرق کی وجہ سے بھی ان کا استدلال آیت سے تام نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخلوق کے وابستہ ہونے کی ضرورت تھی جو یہاں نہیں۔

ایک لطیفہ

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ عمرا خاں جو ایک سرحدی نواب تھے جب حج کو گئے تو ممبئی میں گورنر کو مزاج پرسی کا حکم دیا گیا' گورنر آیا اور مزاج پرسی وغیرہ کر کے چلا گیا اور خان صاحب اس کی تعظیم کو اُٹھے تک نہیں۔ سہارن پور کے ایک رئیس بھی ہمراہ تھے اور انہی سے یہ حکایت منقول ہے۔ انہوں نے کہا کہ مہمان کا اکرام تو مسنون ہے گو کافر ہی مہمان کیوں نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر مہمانوں کا بھی اکرام فرمایا ہے تو آپ نے اس کی مدارات کیوں نہ کی؟ عمرا خان نے جواب دیا کہ سنو جی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر مہمانوں کا اکرام کیا ہے تو آپ کو پیغمبری کرنا تھی اور مجھ کو پیغمبری کرنا تھوڑا ہی ہے جو میں کافروں کا اکرام کروں یہ کلام عنوان کے اعتبار سے تو پٹھانوں جیسا ہے کہ الفاظ کیسے بے ڈھب ہیں مگر مضمون شیخوں جیسا ہے یعنی محققانہ مطلب یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بددل ہونے میں تو مخلوق کا ضرر تھا کہ وہ ہدایت سے محروم رہ جاتے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکرام کرتے تھے اور مجھ سے بددل ہو کر کسی کا کیا بگڑے گا اور اگر اس کے دل میں اس کے سوا اور کچھ مطلب تھا تو میں

اس کا ذمہ دار نہیں مگر ہم تو شاہی کلام کے اچھے ہی معنی لیں گے۔ بالخصوص جبکہ ایک مسلمان بادشاہ کا ہو۔اب میں عود کرتا ہوں اصل مضمون کی طرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ امر کیا گیا ہے کہ ان کو آپ کے فیوض کی حاجت ہے جس کے لیے آپ کے انشراح کی ضرورت ہے اس لیے آپ ان کی خطا معاف کر دیجئے اور اس لغزش کی وجہ سے جو درمیان میں انقباض اور عدم انشراح کا برتاؤ ہوا ہے اس کو موقوف کر دیجئے۔

جلالت جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سبحان اللہ اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کس درجہ ظاہر ہوتی ہے حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قصور خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے اور جب خدا تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا تو کیا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاف نہ فرماتے' ضرور معاف فرماتے مگر پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے کہ آپ بھی ان کو معاف فرماویں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ان کو اپنے معاف کر دینے کی بھی اطلاع کر دیجئے تا کہ ان کی پوری تسلی ہو جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ حق تعالیٰ کی معافی کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاف نہ کرنے کا احتمال تھا ہرگز نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رضائے حق کے تابع تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر ناراض رہتے جس سے محبوب راضی ہو جائے اس سے محب کس طرح ناراض رہ سکتا ہے کسی طرح نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو شان بڑی ہے۔ عام اولیاء رضائے حق میں فنا ہوتے ہیں' جدھر حق تعالیٰ کی مرضی دیکھتے ہیں ادھر ہی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ حوادث دنیا میں بھی چنانچہ ایک بزرگ تھے شاہ دولا ان کے گاؤں میں سیلاب چڑھ آیا' گاؤں والوں نے آپ سے دعا کے واسطے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ دریا پر چلو اور پھاوڑے ساتھ لے چلو' لوگوں نے ایسا ہی کیا' دریا پر پہنچ کر آپ نے گاؤں کی طرف پانی کا راستہ کھدوانا شروع کیا' لوگوں نے امر کی وجہ سے مہورا کھوداا اور عرض کیا کہ حضرت اس طرح تو سیلاب گاؤں کی طرف جلدی آ جاوے گا' آپ نے فرمایا جدھر مولا ادھر شاہ دولا مگر اگلے دن دیکھا تو دریا کو گاؤں سے ہٹا ہوا پایا' لوگ بہت خوش ہوئے اور اس کا سبب دریافت کیا کہ ہم نے راستہ کھودا

گاؤں سے ہٹا ہوا پایا' لوگ بہت خوش ہوئے اور اس کا سبب دریافت کیا کہ ہم نے راستہ کھودا تو تھا گاؤں کی طرف کو اور پانی ہٹ گیا' دوسری طرف کو اس کی کیا وجہ ہے' فرمایا کہ اس دریا کو یہاں تک آ کر واپس جانا تھا تم خواہ مخواہ گھبرانے لگے میں نے کہا لاؤ جلدی ہی یہاں تک پہنچا دیا جائے تو جلد ہی واپس چلا جاوے گا اس واسطے گاؤں کی طرف کو راستہ کھدوایا تھا۔ واقعی

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تطویل کلام سے کیا فائدہ' سلامتی اسی میں ہے کہ ان فضا میں سے سکوت کیا جائے)

جب بزرگوں کا یہ حال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے خلاف کیسے ہو سکتے ہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو متابعت حق میں اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ خدا تعالیٰ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پوری کرنے لگے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: "ما اری ربک الا یسارع ھواک" (میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے رب تمہاری خواہش کو جلدی پورا کر دیتے ہیں) واقعی اتباع کامل سے غلام کی یہی شان ہو جاتی ہے کہ آقا خود اس کی رعایت کرنے لگتا ہے کسی نے خوب کہا ہے:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   مید ہد یزداں مراد متقیں

(جیسا تو چاہتا ہے ایسا ہی خدا چاہتے ہیں' اللہ تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری کرتے ہیں)

ایک علمی نکتہ

اس جگہ ایک نکتہ اہل علم کے لیے بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے یوں دعا فرمائی: "اللّٰھم ادر الحق معہ حیث دار"[1] (یعنی اے اللہ علی جدھر ہوں حق کو ادھر ہی کر دیجئے) یہ نہیں فرمایا کہ حق کی طرف ان کو کر دے اس میں اسی مقام مرادیت کی طرف اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے کبھی اجتہادی غلطی بھی ہو جاوے تو آپ اسباب ایسے پیدا کر دیجئے کہ ان کی بناء پر حق علیؓ کی طرف ہو جاوے۔

---

[1] (العلل المتناھیة ۱ : ۲۵۴)

یہ مطلب نہیں ہے کہ ناحق کو حق بنادیا جائے نہیں بلکہ صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ جو حضرت علیؓ کریں یا کہیں وہی حق ہو جائے مثلاً مدعی نے غلط دعویٰ کیا اور حضرت علیؓ نے اجتہادی خطا سے اس کو غالب کر دیا۔ یہ ظاہر میں خلاف حق ہوا مگر پھر مقدمہ میں مظلوم نے زیادتی شروع کر دی جس سے ظالم مظلوم ہو گیا تو حق علیؓ کی طرف ہو گیا۔ خوب سمجھ لو یہ احادیث کے لطائف ہیں جو صوفیہ کے علوم سے حاصل ہوتے ہیں مگر جہلاء صوفیہ کے لطائف معتبر نہیں جاہل صوفی تو بالکل ڈوب گئے اور ظاہری مولوی بالکل کورے رہ گئے مگر اتنی غنیمت ہے کہ کورے نہیں ہیں۔ بہر حال جب یہ برکت ہے اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ اس کی بدولت آدمی رضائے حق کی طرف خود بخود ہو جاتا ہے تو پھر بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تابع رضا کیوں نہ ہوتے یعنی خدا نے جب "عفا اللہ عنہم" (اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا) فرمایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم کی خطا کیوں معاف نہ فرماتے؟

فاعف عنہم کی حکمت

بس فقط تطییب قلب کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معاف کر دیا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس طبعی رنج کے ازالہ کا طریقہ یہی تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زبان مبارک سے معاف فرمادیں۔ "لقد عفوت عنکم" (میں نے تم کو معاف کر دیا) کیونکہ عاشق کی بدوں اس کے تسلی نہیں ہوتی اس لیے چاہیے کہ اگر کوئی شخص کسی سے معافی مانگے تو اس کی خاطر سے اتنا کہہ دے کہ میں نے معاف کر دیا۔ گو واقع میں اس کی خطا بھی نہ ہو بعض لوگ ایسے خشک ہوتے ہیں کہ بار بار یوں ہی کہتے رہتے ہیں کہ تم نے کیا ہی کیا ہے کس بات کو معاف کروں اور معاف کر دینے کا لفظ زبان پر نہیں لاتے حالانکہ دوسرے کی تسلی کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ صاف الفاظ سے معاف کر دے تاکہ اس کی کھٹک نکل جاوے اگر معاف کر دینے میں زیادہ ہی شرم آوے کہ اس میں مخاطب کو قصوروار ٹھہراتا ہے تو یوں کہہ دو کہ گو تم نے کچھ کیا نہیں مگر تمہارے کہنے سے کہے دیتا ہوں کہ معاف کیا اور میرے مذاق پر "لیغفر لک اللہ" (تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بخش دیں) میں بھی یہی نکتہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو قصوروار

سمجھتے تھے اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ اپنے کو قصور وار ہی سمجھتے ہیں تو ہم نے سب قصور معاف کر دیا اس سے مقصود محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کرنا ہے اس آیت کی توجیہیں اور بھی ہیں مگر میں تو اپنی ہی چھاچھ کو میٹھی کہتا ہوں۔ پس "**فاعف عنھم**" (آپ ان کو معاف کر دیجئے) کی حکمت معلوم ہوگئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تسلی تھی اس کے بعد فرماتے ہیں "**واستغفر لھم**" کہ آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے۔

جلالت شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اس میں اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کا اظہار ہے کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ تمہاری معافی کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کے بعد ہوگی۔ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تطییب قلب ہے کیونکہ وہ اکثر خطاؤں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استغفار کی درخواست کیا کرتے تھے اور اس واقعہ میں خطا ایسی ہوئی تھی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ملال پہنچا۔ اس لیے اس واقعہ میں وہ خود استغفار کی استدعا کرتے ہوئے شرماتے مگر طبعاً ان کو یہ ضرور خیال ہوتا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے استغفار نہ کیا تو اس درجہ کی معافی نہ ہوگی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کے بعد ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ کریم کے بیٹے کی سفارش پر کچھ زائد ہی مل جاتا ہے اور حق تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے کہ کسی باپ کو اولاد سے بھی نہ ہو سکتی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کے بعد مغفرت کاملہ کی یقینی امید ہے۔

عظمت صحابہؓ

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے حروف سے بھی زیادہ علوم ہیں اور یہ بات بالکل بلا مبالغہ ہے مگر ان علوم کے سمجھنے کے لیے ضرورت ہے توفیق خداوندی کی جس کا ایک شعبہ علم عربیت بھی ہے تو یہ علوم محض توفیق سے عطا ہوتے ہیں۔ تیسرا نکتہ **واستغفر لھم** (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطا معاف کر دی مگر اس سے وہ اجنبیت کیسے دور ہوگئی جو خطا سے پیدا ہوگئی تھی اس کے لیے تو خصوصیت کی ضرورت ہے ورنہ معافی کی تو

معاف کیں۔ کیا اس معافی سے تعلقات شگفتہ ہو گئے ہرگز نہیں تو حق تعالیٰ نے "فاعف عنهم" (آپ ان کو معاف کر دیجئے) کے بعد "و استغفر لهم" (آپ ان کے لیے استغفار کیجئے) بڑھا کر یہ بتلایا ہے کہ صرف عفو خطا کافی نہیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم سے خصوصیت کا برتاؤ کریں کہ پہلے کی طرح اس واقعہ میں بھی ہم سے ان کی مغفرت کی درخواست کریں۔ و نیز ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اوپر جیسا دوسرے نکتہ میں بیان ہوا ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ یہ خود کیسے کہتے کہ ہمارے واسطے استغفار کر دیجئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی خود ہم سے خفا ہیں۔ پس جب وہ یہ عرض نہ کر سکے تو خدا نے ان کا کام کر دیا۔ حاصل اس نکتہ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تفویض کا اور اس کی برکات کا اظہار ہے۔ جیسا کہ بچہ کے سب کام کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ خود نہیں کر سکتا۔

طفل تا گیر اوتا پویا نبود مرکبش جز گردن بابا نبود

(بچہ جب تک ہاتھ سے پکڑنے کے اور پاؤں سے چلنے کے قابل نہیں ہوتا تو باوا کی گردن پر چڑھا پھرتا ہے)

یعنی چونکہ بچہ ہاتھ پاؤں سے کچھ کام نہیں کر سکتا اس لیے حق تعالیٰ خود اس کے سارے کام بنا دیتے ہیں اور جب خود کرنے لگے اس کا بوجھ اسی پر ڈال دیتے ہیں۔ بس جس نے یہ نکتہ نہ سمجھا وہ مفلوج ہو گیا مگر تم خود اپنی رائے سے مفلوج نہ بننا بلکہ کسی محقق شیخ کی اجازت سے ایسا کرنا چاہیے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر اپنے کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حدود کو جانتے تھے اس لیے ان کی خاموشی بدون صریح اجازت کے بھی محدود تھی۔ بہرحال "و استغفر لهم" (آپ ان کے لیے استغفار کیجئے) میں خصوصیت کے برتاؤ کا امر ہے اور انہیں خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ "وشاورهم في الامر" (اور آپ خاص خاص باتوں میں ان سے مشورہ کر لیا کیجئے) کہ بعض معاملات میں جو محل ہیں مشورہ کے ان سے مشورہ کیا کیجئے۔ یہاں الامر میں لام عہد کا ہے اس کی توضیح کے لیے ایک مسئلہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مشورہ ہر کام میں نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ جو کام خیر محض ہو کہ اس میں کسی ضرر کا احتمال ہی نہ ہو اس میں مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثل مشہور ہے:

میں کسی ضرر کا احتمال ہی نہ ہو اس میں مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثل مشہور ہے:
ع...... درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ (کار خیر میں استخارہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے)
میں نے اس میں تصرف کرکے اس مصرعہ کو اس طرح بنایا ہے۔ ع..... درکار خیر حاجت ہیچ استشارہ نیست۔ (کار خیر میں مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے) اور دونوں کا ایک ہی حکم ہے اگر شر کا احتمال نہ ہو تو استشارہ اور استخارہ دونوں مسنون ہیں ورنہ نہیں۔

امور خیر میں استخارہ کا ثبوت

چنانچہ بعض احادیث سے ایسے امر خیر میں بھی استخارہ کا ثبوت معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت زینبؓ سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے کہا "حتی استخیر فیہ ربی" کہ میں اللہ تعالیٰ سے اول استخارہ کرلوں۔ اب یہاں سے حضرت اُم المؤمنین زینبؓ کا فہم معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس پیغام نکاح بھیجا تو جواب دیا کہ استخارہ کرکے عرض کروں گی۔ یہاں بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اور آپ کے نکاح میں شر کا احتمال کہاں تھا جو استخارہ کی حاجت ہوئی اس نعمت عظمیٰ کو فوراً قبول کرلینا چاہیے تھا اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت تو خیر محض تھی مگر ہر شخص تو اس کا اہل نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ خادم نا اہل ہوتا ہے اس کی خدمت سے مخدوم کو راحت نہیں ہوتی اور بعض دفعہ خادم اہل ہوتا ہے لیکن مخدوم کا مزاج بہت لطیف ہوتا ہے جس کی رعایت اس سے پوری طرح نہیں ہوسکتی جیسے حضرت مرزا صاحبؒ شاہ غلام علی صاحب پنکھا جھلا کرتے تھے تو پنکھا ہلکا ہونے پر فرماتے کیا تمہارے ہاتھوں میں جان نہیں رہی اور اگر زور سے جھلتے تو فرماتے کیا مجھ کو اڑاؤ گے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کہیں سے نوز آئے مرزا صاحب نے پکارا غلام علی وہ حاضر ہوئے تو فرمایا نوز لو انہوں نے ہاتھ پھیلایا کہا گنوار کہیں نوز ہاتھ میں لیا کرتے ہیں کوئی کاغذ یا پتہ وغیرہ لاؤ وہ کچھ لائے اور اس میں نوز لیے اگلے روز دریافت کیا کہ کچھ نوز باقی ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا: حضور وہ تو کل ہی کھالیے تھے تو فرمایا تم کیسے آدمی ہو کہ ایک دن میں اتنا کھا گئے' میاں مٹھائی تو کھانے کے بعد ذرا سی کھالیا کرتے ہیں۔ غرض مخدوم میں جتنی حس زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی

اس کو بات بات پر تکلیف ہوتی ہے اور اسی لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی ایذا نہیں دی گئی۔ حالانکہ نوح علیہ السلام کو جس قدر تکالیف دی گئیں۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر تکلیف نہیں پہنچی لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حس اور لطافت سب سے زیادہ رکھتے تھے اس لیے واقعات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ اثر ہوتا تھا۔ پس اب سمجھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گو خیر محض تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لطافت طبع کی وجہ سے کسی خدمت کے خلاف مزاج ہونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا احتمال تھا۔ حضرت زینب اس نکتہ کو پہنچ گئیں اس لیے انہوں نے استخارہ کیا۔ غرض مشورہ کی ہر جگہ ضرورت نہیں اس لیے لام عہد سے فرمایا "وشاورھم فی الامرای فی بعض الامر المعلوم لک" (آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کریں یعنی محض امور میں جو آپ کو معلوم ہیں) اور جہاں لام استغراق کا نہ ہو وہاں عہد ہی کا ہوتا ہے۔ آئمہ فن نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ محققین کا قول یہ ہے کہ لام میں اصل عہد ہی ہے جہاں عہد نہ بن سکے وہاں دوسرے معانی پر محمول کیا جاتا ہے اور یہاں کوئی شخص یہ سوال نہیں کر سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی حاجت تھی یا نہ تھی کیونکہ یہ امر تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی تطییب کے لیے ہے باقی اصل مشورہ کی ضرورت سے سکوت ہے اور اس میں روایتیں مختلف ہیں' میں ان میں تطبیق دیتا ہوں۔

سرکار دو عالمؐ کے مشورہ فرمانے میں حکمت

ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو مشورہ کی ضرورت نہیں مگر اُمت پر رحمت کے لیے کہ تطییب قلب بھی اس میں داخل ہے کر لیتا ہوں:

"اخرجه ابن عدی والبیھقی فی الشعب بسند حسن عن ابن عباس لما نزلت وشاورھم فی الامر قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اما ان اللہ ورسوله یغنیان ولکن جعلھا اللہ تعالٰی رحمة لامتی کذافی روح المعانی[1]"

(ابن عدی اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ سے سند حسن

---

[1] (الدر المنثور ۲: ۹۰)

سے روایت کیا ہے جبکہ آیت شاورھم فی الامر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو مستغنی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لیے رحمت اس کو بنادیا ایسے ہی روح المعانی میں ہے)

اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاجت مشورہ کی نہ تھی اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشورہ کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔

"اخرجه الامام احمد عن عبدالرحمٰن بن غنم ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال لابی بکر و عمر لواجتمعتما فی مشورة ما خالفتکما کذا فی روح المعانی ایضاً"[1]

(امام احمد نے عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں متفق ہوجاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہ کرونگا۔ ایسے ہی روح المعانی میں ہے) مراد انتظام و بعث عساکر وغیرہ کا کام۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب اوقات میں تو مشورہ کی حاجت نہ ہوتی تھی کبھی کبھی اتفاقاً ضرورت پڑ جاتی تھی اور یہ بات شان نبوت کے خلاف نہیں بلکہ مناسب شان ہے۔ میں نے اس میں ایک نکتہ نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی حاجت ہونے میں "ولو فی بعض الاحوال" (اگرچہ بعض حالتوں میں ہو) حکمت ہے کیونکہ حاجت منافی الوہیت ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان شریف کا اظہار تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں الٰہ نہیں اور بعض علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کی حکمت تعلیم اُمت بیان کی ہے۔ اب مشورہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیارات کی وسعت بیان فرماتے ہیں۔ "فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰه" (پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) اس میں مطلقاً یہ فرمایا ہے کہ مشورہ کے بعد جدھر آپ کا عزم ہو اپنے عزم پر عمل کیجئے اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] (مسند احمد ۴: ۲۲۷، کنز العمال: ۳۲۶۸۰)

قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت

یہاں سے جڑ کٹتی ہے سلطنت جمہوری کی کیونکہ اس میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور محض مشورہ کرنے سے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا لازم نہیں آتا اس لیے "وشاورھم" سے سلطنت جمہوری پر استدلال نہیں ہوسکتا اور اگر کھینچ تان کر کوئی اس سے استدلال کرتا بھی تو "فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ" (پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) نے اس کو بالکل ہی اُڑا دیا اور اس سے مشورہ کو بیکار نہ کہا جاوے کہ جب اس پر عمل نہ کیا تو نفع ہی کیا ہوا اور اصل مشورہ میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے معاملہ کے ہر پہلو پر نظر پہنچ جاتی ہے اس کے بعد جو رائے ہوگی اس میں سب مصالح کی رعایت ہوگی اسی واسطے کہا گیا ہے:

"رایان خیر امن الواحد" (دو رائیں ایک رائے سے بہتر ہیں) یہ حاصل ہے مشورہ کا نہ یہ کہ عوام کی رائے کو بادشاہ کی رائے پر ترجیح دی جائے۔ جیسا کہ جمہوری سلطنت میں ہوتا ہے وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو رعایا کی رائے پر مجبور ہوگیا۔ اسلام میں یہ حکم نہیں بلکہ اس کو پورے اختیارات ہیں۔ ہاں البتہ انتخاب سلطان کے وقت جمہور اہل حل وعقد کی کثرت رائے معتبر ہے جبکہ وہ رائے خلاف شرع نہ ہو۔ بہرحال "وشاورھم فی الامر" (آپ بعض بعض باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں) تو جمہوری سلطنت کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ ایک اور آیت سے بظاہر اس پر استدلال ہوسکتا ہے شاید وہ کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو مگر میں اس کو بیان کرتا ہوں مع جواب کے کوئی صاحب فقط "لاتقربوا" (مت قریب جاؤ) کو نہ دیکھیں بلکہ "وانتم سکارا" (اس حال میں کہ نشہ کی حالت میں ہوں) کو بھی دیکھیں یعنی جواب کو بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ فرمالیں۔ وہ آیت یہ ہے:

"واذ قال موسٰی لقومه یقوم اذکروا نعمة اللّٰه علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا الآیة"

(اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم میں نبی بنائے اور تم سب کو بادشاہ بنایا)

اس میں حق تعالیٰ شانہ بنی اسرائیل پر انعام نبوت کے مضمون میں تو ارشاد فرماتے ہیں: "جعل فیکم انبیاء" یعنی تم میں نبی بنائے اور انعام سلطنت کے بارے میں ارشاد ہے

"جعلکم ملوکا" یعنی تم سب کو بادشاہ بنایا اس سے معلوم ہوا کہ ان کی بادشاہت جمہوری تھی ورنہ یہاں بھی یوں فرمایا جاتا "جعل فیکم ملوکا" کہ تم میں بادشاہ بنائے جیسا کہ نبوت کے متعلق فرمایا یہ تو دلیل ہوئی اور اس کے دو جواب ہیں ایک عقلی ایک نقلی۔ عقلی جواب تو یہ ہے کہ فاتح قوم کا رعب شاہی عام ہوتا ہے۔ نیز جس قوم میں بادشاہت ہوتی ہے اس کے ہر فرد کا حوصلہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے کو فاتح اور سلطان سمجھتا ہے قوم مفتوح کے مقابلہ میں اس لیے "جعلکم ملوکا" (تم سب کو بادشاہ بنایا) فرمایا یہ نہیں کہ وہ سب کے سب بادشاہ تھے اور نقلی دلیل یہ ہے کہ جب ہماری شریعت میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اگر بنی اسرائیل کے لیے جمہوری سلطنت بھی مان لیں تو وہ منسوخ ہو چکی اور ہمارے لیے حجت نہیں ہو سکتی۔ غرض قرآن شریف سے تو سلطنت شخصی ہی ثابت ہوتی ہے۔ اب جو اہل اسلام میں جمہوریت کے مدعی ہیں وہ یاد رکھیں کہ ہمارے ذمہ شخصیت پر دلیل قائم کرنا لازم نہیں ہے بلکہ دلیل ان کے ذمہ ہے اور ہم تو مانع ہیں۔ پس جب وہ دلیل لاویں گے اس کا جواب بھی انشاء اللہ ہم دے دیں گے۔

بعد مشورہ اللہ پر اعتماد کی ضرورت

اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں لا سکتے اور "فتوکل علی اللّٰہ" (خدا ہی پر اعتماد رکھئے) میں یہ بھی بتلا دیا کہ باوجود مشورہ کرنے کے جو کہ اسباب رویت صواب سے ہے خدا ہی پر اعتماد رکھئے مشورہ کے بعد بھی کام بنانے والا وہی ہے مشورہ پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ آگے فرماتے ہیں "ان اللہ یحب المتوکلین" (بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد رکھنے والوں کو پسند فرماتے ہیں) اس میں مسلمانوں کو امر وجوبی ہے توکل کا کہ ہر کام میں خدا ہی پر نظر رکھیں دلیل وجوب کی یہ ہے کہ یہاں یحب فرمایا ہے جس سے مقابلہ کی بناء پر لازم آیا کہ "لا یحب غیر المتوکلین" وغیرہ (اعتماد نہ رکھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں) اور قرآن کا محاورہ یہ ہے کہ لا یحب اپنے لغوی معنی پر مراد نہیں بلکہ بغض کے معنی میں ہے "یحب المتوکلین کو یبغض غیر المتوکلین" (غیر اعتماد رکھنے والوں کو مبغوض رکھتے ہیں) لازم ہے اور عدم توکل کا مبغوض ہونا دلیل ہے توکل کے وجوب کی البتہ توکل کے مراتب مختلف ہیں اس کا ہر درجہ فرض نہیں اس لیے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ فرض کا درجہ کیا ہے اس کی تفصیل سنو۔

توکل کا درجہ فرض

توکل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ اعتقاداً ہر حال میں خالق پر نظر رہے اسی پر اعتماد ہو یہ تو فرض ہے یعنی اسباب ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں بھروسہ خدا پر ہو اصلی کارساز اسی کو سمجھیں اسباب پر نظر نہ رکھیں۔ دوسرا درجہ توکل کا عملی ہے یعنی ترک اسباب اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ سبب کسی ضروری مقصود دینی کے لیے ہے تو اس کا ترک حرام ہے جیسا کہ اسباب جنت میں سے نماز وغیرہ ہیں ان کا ترک جائز نہیں اور اگر مقصود دنیوی کا سبب ہے تو پھر اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر عادۃً اس مقصود کا توقف ثابت ہے اور وہ مسبب مامور بہ ہے تو اس کا ترک بھی حرام ہے جیسے کھانا سبب شبع ہے اور پانی پینا سبب ارتواء ہے ان اسباب کا ترک جائز نہیں اور اگر سبب پر مقصود دنیوی کا ترتب ضروری اور موقوف نہیں تو اقویاء کے لیے ایسے اسباب کا ترک جائز بلکہ بعض صورتوں میں افضل ہے اور ضعفاء کے واسطے ترک کی اجازت نہیں اور اگر وہ سبب محض وہمی ہے تو اس کا ترک سب کے لیے افضل ہے اور اگر اشتغال میں کوئی دینی ضرر ہے تو اس کا ترک واجب ہے خوب سمجھ لو۔ بہرحال مقصود آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حق میں رحمت ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نہایت کریم اور رحیم بنایا ہے۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

(اے اللہ آپ کریم ہیں اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کریم ہیں صد شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں)

اگر یہاں کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی ہے تو اس کے لیے آخرت میں سب کچھ امید ہے۔ تھوڑا سا تعلق بھی ہو تو ان شاء اللہ کافی ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر وہ اس شعر کا مخاطب ہے:

اس کے الطاف تو عام ہیں شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام بمناسبت مضمون کے ”الرحمۃ علی الامۃ“ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں اور ہم سب کو اس رحمت میں شامل فرماویں۔
(اس کے بعد حسب معمول دعا مانگی)۔

کمالات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اور بعد دعاء کے چلتے ہوئے فرمایا کہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ ان مدعیان محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اپنے اتنے کمالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ سنے ہوں گے (اور مسکرا کر فرمایا) ہاں ہمارے ہاں مٹھائی نہیں ہے اس واسطے ہم کو محب نہیں کہا جاتا (اس کے بعد نماز پڑھائی اور بعد نماز کے فرمایا کہ ایک ضروری مضمون جو دراصل روح تھی اس بیان کی اس کو وقت پر بیان کرنا بھول گیا۔ اب بیان کرتا ہوں اہل فہم ذرا ٹھہرے رہیں اور اس کا رہ جانا موجب تاسف ہوتا۔ (گو اب بھی افسوس رہا کہ اس کمال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان مفصل نہ ہوا) مدلول لفظی تو اسیت کا واضح ہو چکا کہ اس میں معاملات مع الصحابہؓ کا ذکر ہے جس کے ضمن میں کمالات مستنبط ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کمال اور بتلاتا ہوں اور اس کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اور مقدمہ یہ ہے کہ بندے کو جو تعلقات پیش آتے ہیں وہ تین قسم کے ہیں ان میں دو کا حق ادا کرنا آسان ہے ایک ان تعلقات کا جو وجود کے ساتھ ہیں دوسرے ان تعلقات کا جو دشمنان خدا یعنی کفار کے ساتھ ہیں کیونکہ تعلق مع اللہ کا تو بڑھانا ضروری ہے اس میں تو یہی ایک کام ہے کہ اس تعلق کو بڑھایا جائے اور تعلق مع الکفار کا قطع ضروری ہے اس میں بھی ایک ہی کام ہے کہ اس کو قطع کیا جائے باقی رہے وہ تعلقات جو مومنین کے ساتھ ہیں بہت سخت ہے کیونکہ مومن میں دو شانیں ہیں ایک یہ کہ اس کو خدا سے تعلق ہے اور خدا تعالیٰ کو اس سے تعلق ہے یہ مقتضی اس کو دوسری شان یہ ہے کہ وہ غیر حق ہے یہ مقتضی ہے فصل کو تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس میں دو مقتضی متضاد ہیں تو مومن کے ساتھ اس درجہ سے کہ اس کو تعلق مع اللہ ہی تعلق کرنا دوسرے غیر اللہ ہونے کی وجہ سے اس سے قطع تعلق کرنا اس لیے اس کے حدود بہت باریک ہیں اور اس کے ساتھ تعلق اور قطع تعلق دونوں کو جمع کرنا سخت دشوار ہے۔ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر فرمایا گیا ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ تعلق کے یہ حدود رکھو ظاہر میں ان کے ساتھ تعلق ہو ان سے مشورہ وغیرہ بھی ہو ان کی دلجوئی بھی ہو اور باطن میں صرف خدائے تعالیٰ پر نظر ہو اسی پر توکل اور اعتماد ہو مخلوق پر اس درجہ میں بالکل نظر نہ ہو یہ ہے مجمل تقریر مضمون کی۔

بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بہت بڑا کمال تھا کہ آپ سب حدود کی پوری رعایت رکھتے تھے کہ ایسی رعایت کسی سے ہو نہیں سکتی۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس آیت میں مومنین

کے اس حق کو یاد دلایا ہے کہ ان کے ساتھ بے تعلقی کے بعض شعبوں کو تو مبدل بہ تعلق کرنا چاہیے اور قطع کے شعبوں کا حق ادا کیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر پوری طرح عمل کرتے تھے وصل کے حقوق بھی ادا کرتے اور فصل کے حق بھی اور پھر اس کے ساتھ ایک اور بات بھی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلطان بھی تھے شان سلطنت کا مقتضا یہ تھا صحابہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب وجلال قائم ہو اور شان نبوت کا مقتضا یہ تھا کہ صحابہؓ کے دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کھلے ہوئے ہوں تا کہ استفاضہ ہو سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں شانوں کے حقوق بھی ادا کرتے تھے کہ محض رعب ہی تھا کہ کوئی استفاضہ نہ کر سکے نہ ایسے بے رعب تھے کہ شان سلطنت کا حق فوت ہو۔

اب غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب شیون کے حقوق ادا کرنے میں کس قدر دشواری ہوتی ہوگی۔ در حقیقت یہ امر دق من الشعر واحد من السیف ہے یعنی بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ محققین نے لکھا ہے کہ پل صراط اور اصل شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مثالیہ ہے جو شخص اس جگہ شریعت پر عامل ہے اس کو وہاں پل صراط پر چلنا آسان ہوگا ورنہ مشکل ہوگا اور گو اس میں سب مشترک ہے کہ شریعت کا جو درجہ متوسطہ ہے اس پر پوری طرح عمل کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی اس میں تفاوت ہے کہ بعضے درجہ وسط سے بہت قریب ہیں اور بعض بعید ہیں۔ پس اس کی اصلی حد پر جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے دکھلا دیا وہ از بس دشوار ہے۔ اب غور کیجئے کہ ہماری خاطر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی دشواری کا تحمل گوارا فرمایا کیا یہ رعب نہیں؟ یقیناً بڑی رحمت ہے اور قیامت میں اس سے زیادہ کی امید حق تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہماری امیدیں پوری فرما دے۔

شُکُر النِّعمۃِ بِذِکُر رَحُمَۃُ الرّحمۃ

جامع مسجد تھانہ بھون میں ۷ ربیع الثانی ۱۳۳۳ ہجری جمعہ کو ''رافت و رحمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم برحال اُمت'' کے موضوع پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ وعظ ۲ گھنٹے جاری رہا۔ مولوی ظفر احمد صاحب تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اسے قلمبند کیا۔ ایک سو افراد نے سنا' یہ وعظ عام اُمت کیلئے مفید ہے۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم○ (التوبۃ آیت ۱۱۸)

ترجمہ: ''اے لوگو! تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہارے جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے۔ تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں۔ (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔''

ذکر اللہ اور ذکر رسول اکرم کسی خاص وقت کیساتھ مقید نہیں

یہ ایک آیت ہے سورہ برأت کے ختم کے قریب کی جس میں کچھ فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر چند کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مثل ذکر اللہ کے کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہر وقت ہونا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت فرض فرمائی ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے۔ ''من اطاع الرسول فقد اطاع اللہ'' (جس نے اطاعت کی رسول کی پس تحقیق اس نے اطاعت کی اللہ کی) ''واطیعوا اللہ والرسول'' (اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) تو جو شان اطاعت کی ہے وہی شان ذکر کی بھی ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ کی

اطاعت فرض ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے اور جس طرح ذکر اللہ باعث ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اسی طرح ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجب ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ یہ بھی ہر وقت ہی ہونا چاہیے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت اس پر مجھے یاد آ گئی۔ کسی نے مولانا سے دریافت کیا کہ میلاد شریف کرنا کیسا ہے آپ نے فرمایا کہ بھائی ہم تو ہر وقت میلاد شریف کیا کرتے ہیں کیونکہ ہم "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اس میں ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پس ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا ذکر کیسے کرتے۔ واقعی خوب جواب دیا۔

ولادت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقصود

مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے مقصود تو رسالت ہی تھی ورنہ نفس پیدائش میں تو سب شریک ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر کرتا ہے وہ پیدائش کا ذکر بابلغ وجہ کرتا ہے کہ پیدائش کا بھی ذکر کرتا ہے اور جو اس سے مقصود تھا اس کو بھی بیان کرتا ہے اور جو لوگ صرف میلاد کا ذکر کرتے ہیں وہ ایسی چیز کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ہر فرد بشر میں مشترک ہے وہ مقصود کا ذکر نہیں کرتے جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اور پھر ذکر بھی جب قیود کے ساتھ ہو تو یہ ان کی کمی ذکر کو مستلزم ہے کیونکہ جب تک خاص مہینہ خاص مجمع کی صورت اور خاص طریقہ ذکر میلاد نہ ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے محروم رہتے ہیں اور یہ منطقی مسئلہ بھی ہے کہ عام کے ساتھ جس قدر تخصیصات زیادہ ہوں گی اسی قدر اس کے افراد کم ہوں گے۔ مثلاً مطلق جسم کا وجود بہت زیادہ ہے جسم نامی کا اس سے کم حیوان کا اس سے بھی کم انسان کا سب سے کم۔

پابندی قیود سے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمی ہوگی

غرض یہ بات مشاہد بھی ہے کہ قیود اور تخصیصات بڑھانے سے شے کا وجود کم ہو جاتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے تو ہر طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

لیے جو لوگ قیود کے پابند ہیں وہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم کرتے ہیں اور جو لوگ قیود کے پابند نہیں وہ ہر وقت ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ اگر ایک مقدمہ یہ بھی ملا لیا جاوے کہ "من احب شیئًا اکثر ذکرہ" کہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے وہ اس کو کثرت سے یاد کیا کرتا ہے تو آپ خود فیصلہ کرلیں گے کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قیود کو لازم کر لینا یہ کی محبت کی دلیل ہوئی یا نہیں۔ بخلاف ان کے جو قیودات کے پابند نہیں کہ وہ ہر وقت ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رہتے ہیں۔ ہاں ان کے نزدیک صرف ایک قید کی ضرورت ہے وہ کیا اخلاص کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خلوص دل سے ہونا چاہیے کیونکہ بدون خلوص کے عمل مقبول نہیں ہوتا مگر یہ قید بھی قبولیت کے لیے ہے نفس عمل کے لیے اس کی بھی ضرورت نہیں بلکہ محققین ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیا خود مطلق ذکر کے لیے بھی یوں ہی فرماتے ہیں کہ خلوص قلب کا انتظار نہ کرنا چاہیے بلکہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہیے اس کی برکت سے شدہ شدہ خلوص بھی پیدا ہو جاوے گا یہ سب باتیں حاجی صاحب قدس اللہ سرہم کے یہاں جا کر حل ہوئیں۔

ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہتی

چنانچہ حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ریاء ہمیشہ ریاء ہی نہیں رہتی۔ پہلے ریاء ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت بن جاتی ہے۔ غرض ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہا کرتی آخر کار مبدل بخلوص ہو جاتی ہے پھر وہ خلوص موجب قرب ہو جاتا ہے تو اہل تربیت کے نزدیک ابتداء عمل کے لیے اخلاص کی قید بھی ضروری نہیں وہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس طرح ہو ذکر کرنا چاہیے' خلوص کا انتظار نہ کرنا چاہیے' دوسرے یہ کہ بعض اعمال سے دوسروں کو تو نفع پہنچ جاتا ہے پھر ان کی برکت سے اس عامل کا کام بن جاتا ہے فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب سے ریاء کا ر مر گئے ابواب خیر بند ہو گئے اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ریاء بھی کوئی اچھا عمل ہے۔ نہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں بہت سے لوگ نام آوری کے لیے خانقاہیں اور سرائے مدرسے وغیرہ بنایا کرتے تھے۔ مقصود ان کا صرف نام ہوتا تھا مگر جب ان سے مخلوق کو نفع پہنچا تو کوئی ان میں خدا کا خاص بندہ بھی ہوتا تھا وہ بانی کے حق

اطاعت فرض ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی فرض ہے اور جس طرح ذکر اللہ باعث ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اسی طرح ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجب ثواب ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں بلکہ یہ بھی ہر وقت ہی ہونا چاہیے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی حکایت اس پر مجھے یاد آ گئی۔ کسی نے مولانا سے دریافت کیا کہ میلاد شریف کرنا کیسا ہے آپ نے فرمایا کہ بھائی ہم تو ہر وقت میلاد شریف کیا کرتے ہیں کیونکہ ہم "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) پڑھتے ہیں اس میں ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ پس ہم تو ہمیشہ ذکر میلاد کرتے ہیں کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا ذکر کیسے کرتے۔ واقعی خوب جواب دیا۔

ولادت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقصود

مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے مقصود تو رسالت ہی تھی ورنہ نفس پیدائش میں تو سب شریک ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر کرتا ہے وہ پیدائش کا ذکر بابلغ وجہ کرتا ہے کہ پیدائش کا بھی ذکر کرتا ہے اور جو اس سے مقصود تھا اس کو بھی بیان کرتا ہے اور جو لوگ صرف میلاد کا ذکر کرتے ہیں وہ ایسی چیز کا تذکرہ کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور ہر فرد بشر میں مشترک ہے وہ مقصود کا ذکر نہیں کرتے جس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اور پھر ذکر بھی جب قیود کے ساتھ ہو تو یہ ان کی کمی ذکر کو مستلزم ہے کیونکہ جب تک خاص مہینہ خاص مجمع کی صورت اور خاص طریقہ ذکر میلاد نہ ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے محروم رہتے ہیں اور یہ منطقی مسئلہ بھی ہے کہ عام کے ساتھ جس قدر تخصیصات زیادہ ہوں گی اسی قدر اس کے افراد کم ہوں گے۔ مثلاً مطلق جسم کا وجود بہت زیادہ ہے جسم نامی کا اس سے کم حیوان کا اس سے بھی کم انسان کا سب سے کم۔

پابندی قیود سے ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمی ہوگی

غرض یہ بات مشاہد بھی ہے کہ قیود اور تخصیصات بڑھانے سے شے کا وجود کم ہو جاتا ہے اور عقلی مسئلہ بھی ہے تو ہر طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

فضول خیالات میں نہیں پڑا کرتے خدا سے خود بھی دعا کرنا چاہیے بلکہ صاحب ضرورت کی دعا میں زیادہ امید قبولیت ہے کیونکہ وہ پریشان ہوکر گھبرا کر دعا کرتا ہے اور حق تعالیٰ مصیبت زدہ کی دعا جلدی قبول فرماتے ہیں: ''امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء'' (یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے)

شیطانی دھوکہ

غرض یہ بھی ایک شیطانی دھوکہ ہے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر اللہ یا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں ہم اس لائق کہاں جو خدا سے دعا کریں اس دھوکہ میں پڑ کر بہت لوگ خدا کی نعمت سے محروم پڑے ہوئے ہیں اور فی ذاتہ تو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بیشک ایسی ہی چیز ہے کہ:

ہزار بشویم دہن بمشک و گلاب   ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(یعنی ہزاروں لاکھوں دفعہ منہ کو خوشبودار بنایا جائے۔ جب بھی اس کے قابل نہیں ہوسکتا مگر پھر بھی کام شروع ہی کردینا چاہیے۔ گو وہ کام ناقص ہوگا مگر رحمۃ حق سے وہی قبول ہوجاوے گا)

قبولیت ذکر کی عجیب مثال

مولانا خوب فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تو از رحمت است   چوں نماز مستحاضہ رخصت است

خوب مثال دی کہ جیسے استحاضہ والی عورت جس کو ہر وقت خون جاری رہتا ہے شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ ایسی حالت میں تو نماز پڑھتی رہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا خون بہہ رہا ہے تو وہ حقیقت میں ناپاک ہے مگر اس حالت میں بھی اس کی نماز قبول ہوجاتی ہے تو اسی طرح گو ہمارا منہ مثلاً خدا کی یاد کے قابل نہیں مگر شریعت کا حکم ہے کہ قابل ہو یا نہ ہو کام کرنا چاہیے حق تعالیٰ قبول فرمانے والے ہیں اور اس میں ایک راز غامض ہے وہ یہ کہ اگر کوئی بدون طہارت غیر مامور بہا کے اطاعت نہ کرے یا نہ ہوسکتی ہو اور یہی انتظار رکھے کہ جب تک ہم ذکر کے قابل نہ ہوجاویں ذکر شروع نہ کریں تو

جس وقت بھی یہ شخص ذکر شروع کرے گا یا کوئی طاعت کرے گا تو اس وقت اپنے آپ کو طاہر اور اس کے قابل سمجھے گا حالانکہ حق تعالیٰ کی عظمت حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی قابل اور طاہر نہیں ہوسکتا اور کسی اور کی تو کیا مجال ہے جبکہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "لااحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک"[۱] (کہ اے اللہ میں بھی آپ کی ثناء نہیں کرسکتا تو جب بھی ہم طاعت کریں گے وہ ناقص ہی ہوگی)

عجب میں مبتلا

تو جو لوگ اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ جب ذکر کے قابل ہوں گے اس وقت شروع کریں گے وہ عجب میں مبتلا ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کبھی اس قابل بھی ہوسکتے ہیں یہ کتنا بڑا مرض ہے۔

صاحبو! ہم جب بھی عبادت کریں گے وہ خدا کی عظمت کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی کبھی بھی اس کے لائق نہیں ہوسکتی اور جس درجہ کے تم متمنی ہو وہ تو مستحیل ہے تو یہ خیال باطل ہے اس کو دل سے نکال دینا چاہیے ورنہ اس خیال میں پڑ کر یا تو کام سے رہ جاؤ گے اگر ہمیشہ اپنی ناقابلیت پیش نظر رہی اور اگر کبھی شروع کرو گے تو دوسری بلا میں گرفتار ہو گے کہ اپنے آپ کو صاف اور عبادت کے قابل سمجھو گے۔ یہی وہ راز ہے جس کی وجہ سے اہل تربیت فرماتے ہیں کہ اپنے کو ریاء کار ہی سمجھ کر تم کام شروع کردو اور یہی سمجھتے رہو کہ تم کسی قابل نہیں اور نہ کبھی قابل ہوسکتے ہو حق تعالیٰ سب قبول فرمالیں گے اور اگر کچھ نقصان بھی رہے گا تو تمہارا اپنے آپ کو ناقص سمجھنا اس نقصان کی تلافی کردے گا۔ واقعی عجیب دربار ہے کہ اپنے عمل کو ناقص سمجھنے سے اس کی تکمیل ہوجاتی ہے:

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش — عذر بدرگاہ خدا آورد

ورنہ سزا وار خداوندیش — کس نتواند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے کہ اپنی کوتاہی کا عذر دربار خداوندی میں لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی عظمت خداوندی کے لائق کوئی اطاعت بجالائے۔)

---

[۱] (مسند احمد ۶: ۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۲: ۱۰۷)

پاک ہونے کا انتظار

اس انتظار کی بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسا کہ امثال میں مذکور ہے کہ ایک ناپاک شخص کا دریا پر گزر ہوا اور دریا نے اس کو پکارا کہ میرے پاس آ جا میں تجھے پاک کر دوں اس نے کہا کہ میں کس منہ سے آؤں تو پاک صاف اور میں گندہ ناپاک۔ دریا نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ پاک ہو کر میرے پاس آئے اور بدون میرے پاس آئے تو پاک نہیں ہو سکتا تو ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا۔ بس تو اسی حالت میں ناپاک ہی میرے پاس چلا آ تجھے میں ہی پاک کر سکتا ہوں مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہو سکتا۔

صاحبو! اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گمان کے موافق پاک صاف ہو کر خدا کی طرف رخ کریں۔ حالانکہ بدون خدا کی طرف رخ کیے تم پاک ہی نہیں ہو سکتے۔ بس اس کا تو یہی طریقہ ہے کہ تم جیسے بھی ہو چلے آؤ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آ جا' گرچہ کافر اور آتش پرست و بت پرست بھی ہے تو واپس آ)

رحمت متوجہ ہو کر تم کو خود پاک کر دے گی۔

ذکر اللہ کیلئے فراغت کا انتظار

اسی طرح بعض لوگ خدا کی یاد کے لیے منتظر رہتے ہیں کہ دنیا کے جھگڑوں سے نجات ہو جائے تو پھر فارغ ہو کر اللہ اللہ کریں۔ کوئی کہتا ہے کہ بیٹے کا نکاح ہو جائے تو بے فکر ہو کر خدا کو یاد کریں فلاں زمین کے مقدمہ سے چھٹکارا ہو جائے تو آخرت کی فکر میں لگیں مگر میں بقسم کہتا ہوں کہ ان جھگڑوں سے نجات خدا کی یاد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا سے لگاؤ پیدا کرو رفتہ رفتہ سب تعلقات خود ہی کم ہو جائیں گے اس کے بغیر کبھی تعلقات سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو آپ روز یہی کہتے رہیں گے کہ آج یہ قصہ پیش آ گیا اس سے فراغت ہو جائے تو پھر کام میں لگوں پھر کوئی دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا تو آپ اس سے فارغ

ہونے کا انتظار کریں گے تو ہمیشہ یہی حال رہے گا۔

ہر شبے گویم کہ الف فردا ترک ایں سودا کنم ۔ باز چوں فردا شودا مروز را فردا کنم

(ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنون چھوڑ دوں جب کل آتی ہے تو پھر اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں)

دنیا کے قصوں سے کبھی نجات نہیں نصیب ہوگی۔ کوئی شاعر دنیا کے بارے میں خوب کہتا ہے:

وما قضی احد منها لبانته لاینتهی ارب الا الی ارب

(کوئی شخص اس کی حاجتوں کو پوری نہ کرسکا ایک حاجت سے فارغ ہوا دوسری حاجت پیش آگئی)

یہ لوگ وصل کے لیے منتظر ہیں فصل موقوف ہے وصل پر ان کو کبھی خدا کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنے کی توفیق نہیں ہوسکتی ہمیشہ انتظار ہی میں رہیں گے۔ یہاں تک کہ ایک دن موت آ کر دبائے گی اور دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جائیں گے۔ بس اگر وصل خدا چاہتے ہو تو ان جھگڑوں کے ختم ہونے کا انتظار نہ کرو ایسی حالت میں خدا کی یاد میں لگ جاؤ پھر وہ خود ہی سب تعلقات کو ختم کر دے گا اور رحمت حق متوجہ ہو کر تم کو اپنی ہی طرف کھینچ لے گی۔ "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا وّ یرزقہ من حیث لا یحتسب" (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کوئی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا)

مولانا فرماتے ہیں:

اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(اس راہ سلوک میں) ادھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بیکار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

کام میں لگنے کی ضرورت

یہ مسئلہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حل ہوا۔ حاجی صاحب سے جب کوئی یہ کہتا کہ حضرت نوکری چھوڑ دوں تو آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ نوکری مت چھوڑو تم کام میں لگے رہو کام کرتے کرتے پھر تم خود ہی چھوڑ دو گے کسی سے پوچھو گے بھی نہیں۔ سبحان اللہ! بڑے محقق تھے۔ غرض یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو کام میں لگ جانا چاہیے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم اس قابل کہاں جو ذکر خدا و ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں۔ تم کام شروع کر دو حق تعالیٰ شانہ سب قبول فرمالیں گے وہ فقط کاملین ہی کے خریدار نہیں وہ ناقص کے بھی خریدار ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: "ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ" دیکھیے فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے ان کی جان و مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں اس میں مؤمنین کا لفظ ہے یہ نہیں فرمایا کہ "ان اللّٰہ اشتری من الکاملین انفسھم واموالھم" (یعنی اللہ تعالیٰ نے کاملین کی جانوں اور مالوں کو (جنت کے بدلے) خرید لیا ہے) اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ وہ بازار جس درجہ کا کھرا ہے اس کے قابل متاع تو کسی کے پاس بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کاملین کو بھی جو جزاء عطا ہوگی وہ اس قدر ہوگی کہ ان کے اعمال کی ان کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہ ہوگی وہ محض فضل ہی فضل ہوگا اس لیے اس بازار میں کھوٹے کھرے کی پوچھ ہی نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب بازار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

یعنی ایک پھول کے بدلے پر باغ عطا فرماتے ہیں اور باغ بھی کیسا "جنت تجری من تحتھا الانھر" (ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں) ایسا بازار کہیں دیکھا بھی ہے جس میں اس کا کچھ بھی خیال نہیں کہ یہ تو ایک پھول لے کر آیا ہے اتنے بڑے باغ کا یہ مستحق نہیں واقعی خود اپنے عمل سے اس کو کون پا سکتا ہے۔

رحمت خداوندی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ "لن یّدخل الجنة احد بعملہ"[1] کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے کوئی داخل نہیں ہوگا۔ سب رحمت خداوندی سے جنت میں جائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا "ولا انت یا رسول اللّٰہ" کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا "ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ برحمتہ" یعنی نہ میں ہاں اگر خدا کی رحمت متوجہ ہو جائے تو میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں تو اور تو کس شمار میں ہیں بالکل سچ فرمایا:

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل می خری گلزار را

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　　انچہ در وہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان سے بلند وبالا ہے)

محبّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت

غرض ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ذکر خدا کی طرح ہر وقت ہونا چاہیے اس کے لیے کسی قید کا پابند نہ ہونا چاہیے ظاہر میں بس ایک قید ضروری معلوم ہوتی تھی اخلاص کی مگر محققین اس کو بھی ضروری نہیں سمجھتے یعنی اس میں مبالغہ کرنے کو تو ذرا غور کرو کہ جو شخص اتنا توسع کرے گا اس کو زیادہ توفیق ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی یا اس شخص کو جو اتنی قیود میں جکڑا ہوا ہے کہ مہینہ بھی خاص ہو، مجمع بھی ہو، لوبان بھی ہو، کچھ غزل گانے والے بھی ہوں، مٹھائی بھی ہو، پھر یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم محب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میاں اگر محب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو جس طرح بن پڑتا محبوب کو یاد کیا کرتے، ان قیدوں کے پابند نہ ہوتے۔ بھلا کہیں عاشق بھی اپنے محبوب کی یاد میں کسی چیز کا پابند ہوا

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۲: ۱۹۷)

کرتا ہے۔محبت ہی دل میں نہیں جو اتنے قصوں کے منتظر ہو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان رسوم نے لوگوں کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے بہت روک رکھا ہے۔ میں نے ایک واقعہ خود دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ دوسرے وقت پر رکھو' دوسرے وقت اور چند آدمی بیعت ہونے آئے۔ حاجی صاحب نے ان صاحب سے بھی فرمایا کہ بھائی آؤ تم بھی بیعت ہو جاؤ تو آپ فرماتے ہیں کہ حضرت میں نہیں ابھی بیعت ہوتا میں تو مٹھائی لا کر بیعت ہوں گا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ان رسوم نے کیسا لوگوں کا راہ مار رکھا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی تھی کہ شیخ خود بلائے کہ آؤ ہم تمہارے خریدار بنتے ہیں اور وہ عاشق صاحب ہیں کہ مٹھائی نہ ہونے کی وجہ سے رکے جاتے ہیں۔

بس سوا اس کے کہ تعلق کی کمی ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے تو بس اگر محبت ہے تو یہ قیود خود ہی معلوم ہو جائیں گی کہ کس قدر مانع ذکر ہیں اس لیے چاہیے کہ جس طرح ذکر اللہ کے لیے کوئی قید نہیں اٹھتے بیٹھتے کھڑے ہوئے لیٹے ہوئے سب طرح کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی قید لازم نہ کریں' رہا نماز وغیرہ کے لیے جو قیود ہیں ان میں خاص مصالح و حکمتیں ہیں اور وہ قیدیں ایک خاص طریق ذکر کے لیے ہیں۔ مطلق ذکر اللہ کے لیے تو نہیں ہیں اور پھر وہ بھی نص ہے اور یہاں کونسی نص ہے۔ بعض لوگ اہل عرب کے دستور سے استناد کرتے ہیں کہ وہاں بھی تو قیود ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بیشک وہاں بھی کچھ قیود ہیں تو پھر کیا ہوا۔ اہل عرب کے فعل سے کوئی شرعی حکم تو نہیں بدل سکتا اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستان کے لوگوں کو اہل عرب کے فعل سے استناد کرنے کا کوئی حق بھی نہیں کیونکہ وہ لوگ ان قیود کے اس قدر پابند نہیں ہیں اگر اتفاق سے مجمع ہو گیا تو مجمع میں ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گیا اور کہیں مجمع کی بھی قید نہیں دو چار آدمی کھانا کھانے بیٹھے جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنیں۔ ایک دوسرے سے کہتا ہے یا مولانا المولد الصغیر یعنی مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر میلاد تو سنا دو۔ اس نے مولد مختصر سنا دیا پھر کھانا شروع کر دیا اگر کہیں مجمع میں میلاد کا ذکر ہوا تو مٹھائی وغیرہ کے وہ

ایسے بہت پابند نہیں ایک شخص مٹھائی تقسیم کرنے پر اٹھتا ہے جہاں تک تقسیم ہوگئی بانٹ دی۔ جب ختم ہوگئی صاف کہہ دیا' خلاص بس جاؤ ختم ہوگئی نہ صاحب خانہ کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے' میری ناک کٹے گی نہ ان لوگوں کو کچھ خیال ہوتا ہے جن کو مٹھائی نہیں ملی کہ دیکھو ہم مٹھائی سے رہ گئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع صرف ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اکٹھا ہوا تھا مگر خوش طبعی کے لیے مٹھائی بھی تقسیم ہوگئی یہ نہیں کہ مجمع کی علت غائی صرف مٹھائی ملنا ہو۔ جیسا کہ ہندوستان میں ہے کہ صاحب خانہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ بہت جمع ہوگئے اور مٹھائی کم ہے تو فوراً ایک آدمی کو مٹھائی کے لیے چلتا کرتا ہے اور مولود خواں سے اشارہ سے کہہ دیتے ہیں کہ ذرا کوئی غزل گانا شروع کردو ابھی مٹھائی نہیں آئی۔ اب مولود تو ختم ہو چکا تھا مگر مٹھائی کے واسطے گلا پھاڑ پھاڑ کر مولود خان صاحب غزلیں گا رہے ہیں جس سے سننے والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا جوش وخروش مٹھائی کے اشتیاق میں ہے اور جہاں وہ مٹھائی آئی سارا جوش ختم ہوا۔ بھلا ان لوگوں کو اہل عرب کے فعل سے استناد کرتے ہوئے شرم نہیں آتی وہ اللہ کے بندے مٹھائی کے واسطے مجلس میں جمع نہیں ہوتے نہ صاحب خانہ ہی کو اس کا اہتمام ہوتا ہے نہ آنے والوں کو اس کا خیال ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مولود کی مثال تو شیعوں کی مجلس حسینؓ جیسی ہے۔ لکھنؤ میں محرم کے مہینے میں جا بجا مجلس حسینؓ ہوتی ہے۔ ایک شیعی شخص نے ایک سنی وکیل صاحب سے کہا کہ آپ مجلس حسینؓ میں شریک نہیں ہوتے' انہوں نے کہا کہ مجلس حسینؓ تو میں نے آج تک یہاں کہیں ہوتے ہوئے سنی نہیں اس نے کہا واہ صاحب لکھنؤ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے روزانہ پچاس جگہ تو مجلس حسینؓ آج کل محرم میں ہوتی ہے ان وکیل صاحب نے کہا کہ صاحب میں نے تو کہیں بھی مجلس حسینؓ نہیں سنی اور اگر آپ کو میرا اعتبار نہ ہو تو تھوڑی دیر آپ یہاں تشریف رکھئے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دعوت دینے آیا کہ فلاں نواب صاحب کے یہاں آج مجلس ہے۔ وکیل صاحب نے پوچھا کہ بھائی کا ہے کی اس نے کہا کہ فیرینی کی اس کے بعد دوسرا شخص آیا کہ فلاں رئیس صاحب کے یہاں رات کو مجلس ہے انہوں نے پوچھا کہ میاں کا ہے کی مجلس ہے اس نے کہا کہ شیرمال کی۔ تیسرا آیا اس نے کہا شیرینی کی وکیل صاحب نے

ان صاحب سے کہا کہ آپ نے سن لیا۔ امام حسینؓ کا تو کہیں بھی ذکر نہیں کہیں شیر مال کی مجلس ہے کہیں فیرنی کی ہے کہیں شیرینی کی ہے۔ امام حسینؓ کی مجلس ہوتی تو بھلا ایسی بات تھی کہ میں شریک نہ ہوتا وہ دوسرے صاحب کہنے لگے کہ میاں تم تو بڑے مذاقی آدمی ہو۔

مجالس میلاد کا حال

غرض یہی حال آج کل ہماری مجالس میلاد کا ہے کہ اکثر مٹھائی کی بدولت مجمع ہو جاتا ہے۔ اگر مٹھائی تقسیم نہ ہو تو نہ کوئی پڑھنے اور نہ کوئی سننے آوے۔ خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں اور اسی قبیل سے ہمارے یہ میاں جی رمضان کے حافظ غضب دکھاتے ہیں سارے رمضان تو وہ تیز قرآن پڑھتے ہیں کہ "یعلمون تعلمون" کے سوا کچھ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا' رکوع میں بمشکل تمام شاید ایک بار "سبحان ربی العظیم" کہتے ہوں ترویحہ تو گویا ہوتا ہی نہیں اور جب ختم کا دن ہوتا ہے اور ذرا مٹھائی کے آنے میں دیر ہو جائے تو اب کوئی حافظ صاحب کی قرأت دیکھئے کیسے گا گا کر لحن کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں' لمبے رکوع اور لمبے سجدے ترویحہ بھی خوب لمبا کریں گے اور پکار پکار کر "سبحان ذی العزة والجبروت سبحان ذی الملک والملکوت سبحان الحی الذی لایموت سبوح قدوس رب الملائکة والروح" (پاک ہے وہ ذات جو زندہ ہے جس کو موت نہیں آئے گی' پاک ہے پاک ہے پروردگار ہے ملائکہ اور روح کا) اور بہت سی دعائیں پڑھیں گے کوئی پوچھے کہ آج یہ زور زور سے کس کو یاد کر رہے ہیں فقط مٹھائی کو کیونکہ آج حافظ صاحب کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ ہر ترویحہ کے اوپر ادھر ادھر جھانک لیتے ہیں کہ مٹھائی آ گئی یا نہیں اگر انہیں نماز شروع کرنے کے بعد بھی معلوم ہو جائے کہ مٹھائی آ گئی ہے تو اسی وقت سے وہ قرأت اور لحن اور لمبے رکوع لمبی تراویح سب رخصت ہو جاتے ہیں واقعی ان میاں جیوں کی تو ساری قرأت اور ساری تراویح ختم کے دن مٹھائی ہی کے واسطے ہوتی ہیں۔ گویا مٹھائی کیا ہے جنت ہے کہ جس طرح جنت میں پہنچ کر سارے اعمال معاف ہو جائیں گے اسی طرح اس مٹھائی کے آتے ہی وہ قرأت اور تراویح سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ اب خیال کیجئے کہ ان رسوم نے ہماری حالت کو کہاں تک پہنچا دیا اس

پر اگر کوئی خدا کا بندہ اس سے منع کرے تو اس کو برا بھلا کہنے کو تیار ہوتے ہیں۔ "استغفر الله العظیم" (میں استغفار کرتا ہوں اللہ عظیم سے) معلوم ہوا کہ محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب کے ذکر کے واسطے کسی وقت اور کسی قید کا پابند نہ ہو جیسا اس وقت بلا کسی قید و تخصیص کے بیان کے لیے یہ آیت اختیار کی گئی ہے۔

فضائل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جس میں حق سبحان تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں:

"لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف الرحیم"

(ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں جو کہ تمہیں میں سے ہیں ان پر تمہاری مشقت (اور تکلیف) بہت گراں ہوتی ہے وہ تم پر (تمہاری بہبودی کیلئے) بہت حریص ہیں، مسلمانوں پر بہت زیادہ شفیق و مہربان ہیں) پس ہر چند کہ جیسا اس ذکر مبارک کا مقتضا ہے کہ اس میں کوئی قید نہ ہو اس وقت بھی کوئی قید نہیں جیسا میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے لیے کوئی قید نہیں اور کسی وقت کی پابندی نہیں جس وقت چاہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرو مگر تاہم کوئی خاص داعی دینی خاص وقت پر اس کا محرک ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت جو میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اس کا داعی ایک خاص تازہ انعام ہے جو اس بندہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے ہوا ہے جس کے شکریہ میں متحیر تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اگر آج وعظ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کر دیئے جائیں تو یہ بھی اس انعام کے شکریہ کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ بیان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو نفع پہنچ جانے کی امید ہے اس وقت وعظ لکھنے کا سامان بھی نہ تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کے لیے آتے ہوئے رستہ ہی میں یہ مشورہ ہوا مگر خدا تعالیٰ کو چونکہ منظور تھا وقت کے سب انتظام ہو گیا اس لیے میں نے اس آیت کو بیان کے لیے اختیار کیا تا کہ اس نعمت کے

شکر یہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان ہونے سے کچھ تسلی ہو جاوے۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بے شمار ہیں اور مختلف قسم کے ہیں جن میں سب کا بیان کرنا تو اس وقت دشوار ہے بلکہ سب کے بیان کے لیے تو عمر بھی کفایت نہیں کر سکتی۔

عنایت وشفقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

مگر میں اس وقت ایک خاص فضیلت کا بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو حق تعالیٰ نے "بالمؤمنین رؤف الرحیم" میں بیان فرمایا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت اور شفقت ورحمت کو بیان کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمت کے حال پر ہے کیونکہ وہ نعمت خاص بھی عنایت وشفقت ہی کے قبیل سے ہوئی ہے۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمارے حال پر یہ شفقت ہی تو ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کے حال پر بھی توجہ فرماتے ہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں اور ہم کہاں تو اس ذکر کی ایک تو یہ وجہ ہے کہ انعام کے وقت ایک خاص جوش ہوا کرتا ہے منعم کے احسانات وفضائل کے تذکرہ کرنے کا دوسرے اس بیان کی آج کل اُمت کو ضرورت بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ذکر اُمت کے لیے بھی بہت نافع ہوگا کیونکہ میں اس وقت یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل اُمت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں بہت کمی اور کوتاہی ہو رہی ہے چنانچہ بہت لوگ تو صرف یہی سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے احکام الٰہی پہنچادینا آپ کا فرض منصبی تھا آپ نے احکام پہنچادیے اب ہم کو ان پر عمل کر کے قرب الٰہی حاصل کرنا چاہیے۔ یہ لوگ بجز اعتقاد تبلیغ احکام اور ان میں آپ کی اطاعت کر لینے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق پیدا کرنا ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ نصوص سے تصریحاً معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اس اطاعت کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے خاص تعلقات پیدا کرنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے جن میں سے ایک حق تو آپ کی عظمت کرنا ہے یعنی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم پوری طرح بجالاؤ۔ چنانچہ ارشاد ہے: "یایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ" (اے ایمان والو! اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی اجازت) سے پہلے سبقت مت کیا کرو) "یایھاالذین امنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھر والہ بالقول کجھر بعضکم لبعض" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے پیش قدمی مت کرو آپ کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو جس طرح آپس میں چیخ پکار کر باتیں کرتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح باتیں نہ کرو۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے: "فالذین امنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی انزل معه اولئک هم المفلحون" (سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں)۔

حقوق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

دیکھئے ایمان بالرسول پر اکتفا نہیں فرمایا۔ "عزروه و نصروه" (ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں) کی بھی قید زیادہ فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ فلاحِ اور کامیابی آخرت کے لیے جس طرح آپ پر ایمان لانا شرط ہے آپ کی عظمت کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے: "لتؤمنوا بالله ورسوله وتعزروه و توقروه" (تا کہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حمایت کرو ان کی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مدد کرو ان کی) دوسرا حق آپ کے ساتھ محبت کرنا ہے کہ وہ بھی بے حد ضروری ہے اور یہ بہ نص حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا حق ہے جس کے بدون ایمان کامل نہیں ہوتا۔ "لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین"[1] (تم میں سے کوئی مؤمن کامل نہ ہوگا جب تک میری محبت اس کو اپنے لڑکے اور اپنے باپ اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہوگی) دیکھئے کتنی صاف حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تک میرے ساتھ محبت سب سے زیادہ نہ ہوگی کوئی شخص مومن (کامل) نہیں ہوسکتا۔ دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو خدا کی محبت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے: "لن یؤمن احدکم حتّٰی یکون الله ورسوله احب الیه ممّا سواهما" (ہرگز کوئی شخص تم میں سے مؤمن کامل نہیں ہوسکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماسوا سے زیادہ نہ ہو جائے)

---

[1] (مسند احمد ۳: ۱۷۷، کنز العمال: ۷۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حقوق

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح حق تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ہے اسی طرح حق تعالیٰ کی عظمت و محبت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کرنا بھی فرض ہے گو فرق مراتب کا لحاظ ان سب میں ضرور ہوگا۔ حق تعالیٰ کی اطاعت و عظمت و محبت کی اور شان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و عظمت و محبت کی دوسری شان ہے مگر ہیں سب فرض اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حقوق بہت سے ہیں مگر اس وقت کلی طور پر ان ہی تین حقوق کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کا ذکر اجمالاً ابھی کر چکا ہوں۔ جب آپ دیکھیں گے کہ ان تین حقوق میں ہم نے کس قدر کوتاہیاں کر رکھی ہیں تو اس سے باقی حقوق میں کوتاہی کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ سو کلی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تین حقوق ہیں ایک اطاعت' دوسری محبت' تیسری عظمت۔ اب ان میں کوتاہی دیکھئے کہ بعض لوگ صرف اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نہ تعلق عظمت ہے نہ تعلق محبت مگر میں سچ کہتا ہوں کہ بدون محبت و عظمت کے اطاعت بھی پوری طرح نہیں ہوسکتی قدم قدم پر اتباع سنت وہی کرے گا جس کے دل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رچی ہوئی ہوگی۔ اس لیے گو وہ اپنے آپ کو مطیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عامل بالحدیث کہیں مگر سوائے چند مسائل اختلافیہ کے جن کو وہ رات دن گایا کرتے ہیں باقی افعال و اعمال کو ان کے کوئی دیکھے کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے وہ اتباع حدیث کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ رات دن آمین و رفع یدین کی حدیثیں تو تلاش کرتے ہیں کبھی یہ بھی فکر ہوئی کہ حدیث سے معلوم کریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کھانا کھاتے تھے' کس طرح بیٹھتے تھے کس طرح معاملات و معاشرات میں برتاؤ کرتے تھے' تقویٰ کے کن دقائق کی رعایت فرماتے تھے' باطنی اخلاق میں آپ کا کیا رنگ تھا۔ ہم نے تو کبھی ان لوگوں کو سوائے چند اختلافی مسائل کے باقی اعمال میں اتباع سنت کا گرویدہ نہ پایا اور جن میں بزعم خود اتباع کرتے ہیں وہاں بھی اطاعت کا نام ہی نام ہے زیادہ محرک اس کا وہی نفسانیت و تعصب و گروہ بندی ہے جس کی وجہ وہی ہے کہ اطاعت پوری طرح بدون محبت کے ہو نہیں سکتی۔

دعویٰ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور بعض لوگ صرف محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضروری سمجھتے ہیں تو انہوں نے فقط محبت کو لے لیا ہے مگر یہ بھی محض ان کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ظاہر ہے دعویٰ بدون دلیل مسموع (سننے کے قابل) نہیں ہوسکتا اور دلیل مفقود بس ان کے نزدیک تو محبت اس کا نام ہے کہ کبھی مجلس میلاد منعقد کرلی۔ نعتیہ غزلیں پڑھ دیں یا سن لیں اس کے سوا ان کو کچھ بھی خیال نہیں کہ ہم جو کچھ حرکتیں کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی ہیں یا ناراض؛ ہم نے مدعیین محبت کو دیکھا ہے کہ شراب پیتے ہیں' سود لیتے ہیں' زنا میں مبتلا ہیں مگر سال میں ایک دو مرتبہ ربیع الاول میں میلاد کی مجلس منعقد کر کے محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دم بھرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ ابن مبارک کا قول بھول گئے۔

تعصی الرسول وانت تظهر حبه	هذا العمری فی الفعال بدیع
لو کان حبک صادقاً لاطعته	ان المحب لمن یحب مطیع

(تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ کاموں میں نادر بات ہے اگر تو آپ کی محبت میں صادق ہوتا تو آپ کی اطاعت کرتا اس لیے کہ محب محبوب کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے)

کیا غضب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ ہے اور سر سے پیر تک مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غرق ہیں بھلا یہ بھی کہیں عاشق کا طریقہ ہوا کرتا ہے۔ یہ عجیب محبت ہے کہ عاشق کو محبوب کے ناراض ہوجانے کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جو برتاؤ یہ لوگ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کر کے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے ہیں اگر کوئی ان کے ساتھ یہی برتاؤ کرے کہ ان کی محبت کا دعویٰ کر کے مجلس میں بیٹھ کر ان کی مدح سرائی کر دیا کرے مگر ان کا حکم کوئی بجا نہ لاوے تو یہ لوگ خود اس کی محبت کو اس کے منہ پر دے ماریں گے۔ پھر ہائے افسوس ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی برتاؤ کر کے خوش ہیں اور نازاں ہیں اور ذرا بھی نہیں ڈرتے کہ یہ محبت تو اس قابل ہے کہ الٹی ہمارے منہ پر ماری جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو سکتی ہے

اس جگہ ایک شبہ ہو سکتا ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص نے شراب پی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حد جاری فرمائی پھر ان سے یہ حرکت صادر ہوئی پھر آپ نے ان پر حد جاری فرمائی جب کئی مرتبہ ایسا ہوا تو کسی دوسرے صحابی نے ان پر لعنت کی کہ خدا اس پر لعنت کرے بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس پر حد جاری ہوتی ہے اور شراب پینے سے باز نہیں آتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لعنت کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ "انه یحب الله ورسوله" کہ اس کو برا بھلا مت کہو اس کو اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ اس حدیث کو نقل کر کے شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ مسئلہ استنباط (کسی بات کا کسی بات میں سے نکالنا) کیا ہے کہ اس حدیث سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی کہ معصیت کے ساتھ بھی محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم جمع ہو سکتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود شراب پینے کے ان شخص کو محبّ اللہ والرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب دیا تو شاید آج کل کے مدعیان محبت بھی اس حدیث سے سہارا ڈھونڈھیں کہ گو ہم دوسرے گناہ کرتے ہیں مگر پھر بھی اس حدیث کے مطابق ہم اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہو سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس وقت نفس محبت میں گفتگو نہیں اور نہ میں نفس محبت کی آپ سے نفی کرتا ہوں جب کسی شخص نے کلمہ "لا اله الا الله محمد رسول الله" پڑھ لیا تو کسی قدر تو محبت اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگی، گفتگو محبت مطلوبہ میں ہے، جس کی تحصیل مامور بہ ہے اور جس کے بعد دعویٰ محبت تسلیم کیا جا سکے چونکہ دعویٰ بدون قدر معتدبہ کے صحیح نہیں، کیا کوئی شخص ایک پیسہ کا مالک بن کر اپنے کو مالدار کہہ سکتا ہے آپ کو اس حالت کے ساتھ اپنے آپ کو محبّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کا منہ نہیں۔ شاید تم یہ کہو کہ پھر کیا ان صحابی میں محبت مطلوبہ نہیں تھی؟ کیا ان میں وہ درجہ درجۂ محبت کا موجود نہ تھا جو شریعت کو مطلوب ہے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ قیاس آپ کا صحیح نہیں کیونکہ ہر شخص کی معصیت بھی برابر نہیں ہو سکتی، دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس کو ہر وقت اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دھن ہو، خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جان و مال و آبرو قربان کرنے میں ذرا بھی پس و پیش

نہیں کرتا پھر کسی وقت شیطان نے دھوکہ دے دیا، نفس کی شرارت غالب آ گئی اور گناہ صادر ہوگیا پھر گناہ کر کے بھی چین سے نہیں بیٹھتا جب گناہ سے فارغ ہوا اور آنکھیں کھلیں تڑپ گیا اور بے قرار ہوگیا کہ ہائے کیا کروں میرے خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہوگا اب خدا کو کس طرح راضی کروں، ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ صحاح میں موجود ہے کہ ان سے زنا کی حرکت صادر ہوگئی تھی فوراً بیقرار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع عام میں آ کر عرض کیا "**یا رسول اللہ طھرنی فقد ھلکت**" یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تباہ ہوگیا مجھے پاک فرما دیجئے تنہائی میں بھی نہ کہا ایسے خدا کے خوف سے بے چین ہوئے کہ مجمع عام میں آ کر زنا کا اقرار کیا نہ آبرو کا خیال کیا نہ بدنامی کا۔

ع عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ان کی بات پر توجہ نہیں فرمائی، ہر بار میں آپ نے ٹالنا چاہا اور یہ فرمایا کہ شاید تم نے چھو لیا ہوگا، شاید تم نے بوسہ لے لیا ہوگا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس پر حد قائم نہ ہو خدا سے توبہ استغفار کر لے کیونکہ اس طرح سے بھی گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر ان کو تو خدا پر جان فدا کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ صاف صاف لفظوں میں بیان کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو اس طرح کیا، تب آپ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ ان کو باہر میدان میں لے جا کر رجم کر دو یعنی پتھر مار مار کر جان سے مار ڈالو اس وقت کسی صحابی کے بدن پر ان کے خون کی چھینٹ آ پڑی تھی تو ان کی زبان سے کوئی سخت لفظ ماعز رضی اللہ عنہ کی شان میں نکل گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت غصہ ہوئے اور فرمایا کہ ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ نے ایسی کامل توبہ کی ہے کہ اگر سارے مدینہ والوں پر بھی اس کو تقسیم کیا جاوے تو سب کی مغفرت ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص کی توبہ کے جب اس قدر حصے کیے جائیں گے تو بظاہر ہر شخص کے کیا بانٹے آئے گا مگر ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ اس قدر کامل توبہ تھی کہ اس کے ہزارہا حصے کرنے کے بعد بھی ہر حصہ ایک مسلمان کی مغفرت کے لیے کافی تھا تو ان کے لیے تو کیا کچھ ہوا ہوگا تو بھلا ایسی خطا کو کوئی خطا کہہ سکتا ہے جس سے ایسی توبہ کاملہ نصیب ہو۔

ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

صحابہؓ کی معصیت پر کس کا منہ ہے جو اپنی معصیت کو قیاس کرے ان حضرات کی معصیت توبہ کاملہ کا سبب بن جاتی تھی جس سے ان کو مقام توبہ جو بڑا اعالی مقام ہے نصیب ہوتا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ معصیت سبب قرب خیر کا ہو سکتی ہے نہیں نہیں معصیت ہمیشہ موجب شر ہی ہوتی ہے کہ سبب سخط حق ہے مگر کبھی سبب بعید خیر کے لیے بن جاتی ہے اس طرح کہ معصیت سے خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور اس شخص کو اپنے دل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا تعالیٰ ناراض ہیں اس لیے بے چین ہو گیا اور ایسی ندامت طاری ہوئی جو کبھی نہ ہوئی تھی اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے اور پہلے سے زیادہ مقامات عطا ہو جاتے ہیں تو اس طرح وہ معصیت سبب بعید کا بن گئی۔

ایک دوسرا واقعہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ یا ان کے صاحبزادے عبداللہ کا کہ زمین مصر میں اسلامی لشکر کے سردار بنے ہوئے تھے کہ لشکر میں سے چند آدمیوں نے شراب پی لی چونکہ اس وقت تک شراب کی حد مقرر نہ ہوئی تھی اس لیے سالار لشکر نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجا کہ یہاں لشکر میں بعض لوگوں نے شراب پی ہے ان کو کیا سزا دی جائے۔ غور کیجئے کہ لشکر دشمن کی زمین میں موجود ہے اور ذرا بھی ان کی رعایت کا خیال نہیں بلکہ حکم سزا کے لیے امیر المؤمنین کی خدمت میں قاصد بھیجا جا رہا ہے حالانکہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب لشکر دشمن کی زمین میں ہوتا ہے تو اس کی بہت رعایت اور خاطر کی جاتی ہے مگر حضرات صحابہؓ میں یہ مضمون تھا ہی نہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہؓ کے اجماع کے بعد ۸۰ کوڑے شراب پینے کی سزا لکھ کر بھیج دی۔ اب جس وقت یہ حکم پہنچا ہے تو یہ نہیں ہوا کہ سالار لشکر نے تفتیش کی ہو کہ شراب کس کس نے پی بلکہ آپ نے ایک اعلان فرما دیا کہ جس کسی نے شراب پی ہو وہ آ کر اپنے آپ کو پاک کرا لے بس اتنا اعلان ہوتا تھا کہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ ایک آتا ہے کہ حضرت میں نے شراب پی تھی، اس کے بعد دوسرا آتا ہے کہ میں نے بھی شراب پی تھی۔ اب غور کیجئے کہ ان لوگوں پر کوئی ثبوت تھا نہ گواہ تھے نہ تفتیش کی گئی خود ہی ان کے اقرار سے جرم کا ثبوت ہو رہا ہے اور ہر شخص پر ۸۰ کوڑے پڑ رہے ہیں اور یہ لوگ صحابہؓ بھی نہیں تھے بلکہ تابعین تھے

ہر شخص خوشی کے ساتھ اپنی زبان سے شراب پینے کا اقرار کرتا ہے اور کوڑے کھا کر چلا جاتا ہے ایک تو گنہگار یہ تھے ایسے گنہگاروں کی نسبت ارشاد ہے: "انه یحب الله ورسوله" کہ ان کو اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے اور یہ گناہ شیطانی دھوکہ سے صادر ہو گیا۔ ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کبھی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھتے بیٹھتے خیال بھی نہیں آتا' شریعت کو دو پیسے میں بیچ ڈالنا اسے گوارا ہے جس وقت جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے ہر کام میں بے باک ہے حلال و حرام کی تمیز ہی نہیں' گناہ کرنے کے بعد بھی کچھ زیادہ پریشان و پشیمان نہیں ہوتا کیا ایسے شخص کو بھی "انه یحب الله ورسوله" (اس کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے) میں داخل کیا جا سکتا ہے اور کیا ان لوگوں کو بھی یہ کہنے کا منہ ہے کہ ہم اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محب ہیں بلکہ حضرت اگر سچ مچ محبت ہوتی تو کبھی زبان سے بھی یہ دعوے نکل سکتے' سچے عاشقوں کی تو زبان سل جاتی ہے زبان سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہی یہ بات کہ جب وہ زبان سے نہیں دعویٰ کرتے تو دوسرے کیسے سمجھیں کہ ان کو اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے سو بات یہ ہے کہ وہ زبان سے اگرچہ ظاہر نہ کریں مگر عشق بھی کہیں چھپا رہا ہے کھل ہی جاتا ہے۔

می تواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن زردی رنگ رُخ و خشکی لب را چہ علاج

شاعر کہتا ہے کہ تم آدمیوں سے عشق کے تذکرہ کو چھپا سکتے ہو مگر چہرہ کی زردی اور لبوں کی خشکی کو کس طرح چھپا لو گے۔ غرض عشق ایسی بلا ہے کہ پوشیدہ رہ نہیں سکتا کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن (عشق اور مشک کو نہیں چھپا سکتے) بلکہ مولانا تو فرماتے ہیں کہ عشق بے زبان عشق زبانی سے بھی زیادہ روشن ہوتا ہے کیونکہ زبانی محبت تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور عشق بے زبان کے ساتھ ساتھ دلیل بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است لیک عشق بے زباں روشن تر است

(اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ رموز ذوقیہ سے ہے جس کو زبان سے اچھی طرح نہیں کہا جا سکتا)

محققین کاملین کا عشق

اسی لیے محققین کاملین کا عشق اکثر بے زبان ہی ہوتا ہے اور وہ بے زبان رہ کر بھی سب کچھ کر گزرتا ہے ہاں کبھی کبھی کامل بھی بے قرار ہو کر بول اُٹھتا ہے کہ:

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا ‏ ‏ دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

(ضبط انتہا کو پہنچنے کی وجہ صاحبدلوں اول نکلا جاتا ہے وہ دردِ عشق جو پوشیدہ تھا افسوس ظاہر ہوا جاتا ہے)

یعنی جب ضبط انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور تاب ضبط نہیں رہتا تو بے تاب ہو کر زبان سے بھی اظہار ہو جاتا ہے تو پھر ایسے وقت میں یعنی جب کہ عشق بے زبان کو زبان لگتی ہے تو پھر قیامت کا سامنا ہے پھر اس کے سننے کے واسطے بڑا مضبوط کلیجہ چاہیے اس وقت اس کی بالکل یہ حالت ہوتی ہے:

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ‏ ‏ وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(میرے دل میں ایسا دردِ عشق ہے کہ ظاہر کروں زبان جل جائے۔ اگر خاموش رہوں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودا نہ جل جائے)

پھر اگر اس پر کوئی ملامت بھی کرنے لگے تو اس وقت تو اس کے جوش کا ٹھکانا ہی نہیں رہتا وہ بے تاب ہو کر پھر یوں کہتا ہے:

ساقیا برخیز دردہ جام را ‏ ‏ خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ‏ ‏ ما نمی خواہیم ننگ و نام را

(اے ساقی اُٹھ اور جامِ محبت عطا کر اور ایام گزشتہ کے غم کے سر پر خاک ڈال)

غرض اس کا زبان سے ظاہر ہونا غضب ہے قیامت کا سامنا ہے اس کا پوشیدہ ہی رہنا بہتر ہے مگر وہ بے زبان ہو کر بھی سب کچھ کر ڈالتا ہے اس کے ظاہر ہونے کی ضرورت ہی نہیں وہ اخفا پر بھی مخفی نہیں رہا کرتا۔ سو ایسا عاشق اگر کوئی غلطی کر گزرے وہ بے شک "یحب اللہ و رسولہ" (وہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) کا مصداق رہتا ہے نہ یہ کہ بے باکی کرے اور مدعی محبت بنا رہے ہیں۔ پس ایسے بے باک

عاصی کی نسبت "انه یحب اللّٰه و رسوله" (بلاشک وہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے) وارد نہیں ہوا وہ انہیں حضرات کی بابت ارشاد ہے جو اپنی جان و مال کو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر چکے تھے ہر وقت رضا جوئی اور اتباع کے گرویدہ رہتے تھے۔ خیر کبھی نفس کی شرارت سے گناہ بھی صادر ہو گیا۔ پس معیار یہ ہے کہ اگر نیکیاں زیادہ ہوں اور معاصی کم تو وہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبّ ہے اور اگر نیکیاں کم ہوں اور گناہ زیادہ اس کو محبّ نہیں کہیں گے اس کو ابن مبارک کا قول سنایا جائے گا کہ اگر تجھ کو محبت ہوتی تو زیادہ تو اطاعت کرتا خیر کبھی اتفاقاً معصیت کا بھی صدور ہو جاتا مگر جب سرکشی کا پلہ بھاری ہے تو اس کو محبّ کون مان لے گا' محبت ایسی سستی چیز نہیں محبت کے لیے بڑے امتحان کی ضرورت ہے۔

وجائز دعویٰ المحبة فی الهوی ولکن لا یخفی کلام المنافق
(عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن منافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا)

لوازم محبت

چنانچہ جس طرح اطاعت نہ ہونا ایک امتحان ہے دوسرا امتحان عظمت کا نہ ہونا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ حال ہے کہ ان کے قلب میں عظمت کا نشان تک نہیں حالانکہ محبّ کے دل میں محبت کی عظمت بھی لوازم محبت سے ہے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب کی ذرا بھی عظمت نہیں۔ عظمت کا حال سنئے' یہ لوگ اپنے اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بہت بیہودہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہیں فتنہ کہتے ہیں کہیں لفظ ستم استعمال کرتے ہیں اور بعض تو اس سے بھی زیادہ غضب کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ک ف ر کے لفظ سے (نعوذ باللہ) خطاب کرتے ہیں' خدا کی پناہ یہ لوگ کس قدر بیباک ہیں۔ بعضے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح اس طرح کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی شان میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ بھلا خیال کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی مدح سے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص صاحب کمشنر کے سامنے پیشکار کی ایسی مدح کرے کہ حضور جو کچھ ہیں بس آپ ہی ہیں آپ ہی کے قبضے میں سارا اختیار ہے بدون آپ کے کوئی حاکم کچھ نہیں کر سکتا تو اس وقت

پیشکار کا ناگواری و شرمندگی سے کیا حال ہوگا۔ آیا اس مدح سے اس کو کچھ خوشی ہوگی یا ندامت کے مارے سیروں اس پر پانی پڑے گا کہ حاکم بالا کے سامنے میں کیا چیز ہوں جو اس کی تنقیص کر کے یہ شخص میری مدح کرتا ہے۔ بعینہ یہ حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی مدح سے ہوگا۔ چنانچہ حدیث میں ایک مقام پر وارد ہے: "لاتسودوا وجهي يوم القيامة"[1] کہ قیامت کے روز تم میرا منہ کالا مت کر دینا۔ یہ ایسی مدح کی نسبت اور ایسے مداحین کی بابت بھی ارشاد ہے۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منور چہرہ مبارک اور اس کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ میرا منہ کالا مت کرنا تو بہ تو بہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور ایسا کیوں ہوتا (فداہ ابی و امی) (میرے باپ اور ماں آپ پر قربان ہوں) ان مداحین ہی کا قیامت میں منہ کالا ہوگا مگر اس کلمہ میں آپ اپنی سخت ناگواری کا کس قدر اظہار فرماتے ہیں۔ دیکھئے صاحبو! کیا یہ شعر بے ادبی کا نہیں۔

پے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف ۔۔۔ محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

استغفر اللہ العظیم اس شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا مضمون باندھا ہے اور اس میں کیا عجیب توجیہ اختیار کی ہے جس سے وہ اپنے دل ہی میں خوش ہو لیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے یقیناً سخت ناراض ہوں گے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہیں تھا اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا نور ہی نور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ظلمت نام کو بھی نہ تھی اس لیے آپ کے سایہ نہ تھا کیونکہ سایہ کے لیے ظلمت لازمی ہے شاعر صاحب اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تو بیقرار ہو گئے کہ اب میرا محبوب مجھ سے جدا ہوتا ہے کہاں دیکھوں گا تو تسکین خاطر کے لیے آپ کا سایہ رکھ لیا کہ اسی کو دیکھ کر تسکین کر لیا کروں گا۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے جدا کیا تو ان کو پیراہن یوسفی سے تسلی ہوتی تھی۔ الٰہی توبہ الٰہی توبہ دیکھئے اس مضمون میں حق سبحانہ تعالیٰ کی کس قدر بے ادبی کی گئی ہے اول تو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بیقرار مانا کہ ان کے واسطے تسلی کی ضرورت ثابت

---

[1] (مسند احمد ۵: ۲۱۲)

کی حالانکہ خدا تعالیٰ اس سے بالکل منزہ اور پاک ہیں جب خدا کو بھی بے قراری ہونے لگے اور تسکین خاطر کی ضرورت ہو تو پھر خدائی کس طرح باقی رہے گی۔ دوسرے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے ایسے دور پڑ گئے کہ خدا تعالیٰ ان کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر تنقیص ہے کہ خدا تعالیٰ سے بعید مانا اور خدا پر کیسا دھبہ لگایا کہ دنیا میں بھیج کر وہ اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ گویا بصیر کی صفت نہ رہی تھی کیا خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی عظمت ہونی چاہیے۔

بعض شعراء کی گستاخیاں

کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں انبیاء علیہم السلام کی اہانت کی جاتی ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک بھائی کی مدح اس طرح کی جائے کہ اس کے دوسرے بھائی کو اس کے سامنے گالیاں دی جائیں کیا ایسی مدح سے کوئی شخص خوش ہو سکتا ہے جس میں اس کے دوسرے بھائی کو برا بھلا کہا جائے اور بھائی بھی کیسے دو قالب و یک جان انبیاء علیہم السلام آپس میں سب بھائی بھائی ہیں اور ان میں ایسا اتفاق ہے کہ ہرگز دوسرے کی اہانت کو ایک گوارا نہیں کر سکتا اور انبیاء علیہم السلام کی یہ توہین کہیں تو تہذیب کے ساتھ ہوتی ہے کہیں بدتہذیبی کے ساتھ توہین کی یہ مثالیں ہیں۔ کسی شاعر نے آپ کی نعت لکھنے کے لیے خیالی سیاہی تیار کی ہے تو اس میں کہا ہے "دیدہ یعقوب کھرل الخ" استغفر اللہ یعقوب علیہ السلام کی شان میں کس قدر گستاخی ہے کسی دوسرے شاعر نے اس کا خوب جواب دیا ہے:

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل   نظر آتا ہے جسے دیدہ یعقوب کھرل
توبہ ہے یوں ہو کہیں عین نبی مستعمل   کوئی تشبیہ نہ تھی اور نصیب اجل

کبھی یوسف علیہ السلام کی توہین کی جاتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بھلا تختہ مشق ہیں ان کی شان میں تو بہت ہی گستاخی کی جاتی ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں:

بر آسمان چہارم مسیح بیمار است   تبسم تو برائے علاج در کار ست

(چوتھے آسمان پر عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں آپ کا تبسم علاج کیلئے درکار ہے)

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چہارم پر بیمار ہیں ان کی شفاء کے لیے آپ کے تبسم کی

ضرورت ہے بھلا جو نبی بیماروں کو اچھا کرتے ہوں ان کو محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم کو شفاء ثابت کرنے کے لیے بیمار مانا جائے یہ کتنی بڑی گستاخی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم کا شفا ہونا اس کے بدون بیان نہ ہوسکتا تھا پھر آسمان پر بیمار کیونکر ہو سکتے ہیں وہ تو ایسی جگہ ہیں جہاں ان کو نہ کھانے کی ضرورت نہ پینے کی نہ آب وہوا وہاں کی خراب جو بیمار ہونے کا احتمال بھی ہو۔

غلبہ حال

اور یہ کرتے ہیں کہ امیر خسروؒ کی غزل جو کسی محبوب مجازی کی شان میں ہے تضمین کر کرا کے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں پڑھتے ہیں جس میں یہ مصرع بھی ہے:

اے نرگس زیبائے تو آوردہ رسم کافری

(اے محبوب تیری نرگس زیبا رسم کافری لائی ہے)

اور اگر اس قسم کے مضامین کسی بزرگ کے کلام میں پائے جائیں تو اس کو غلبہ حال پر محمول کیا جائے گا مگر ان شاعروں کے کلام میں ہم کو تاویل کی کیا ضرورت۔ جن کو نہ محبت ہے نہ خاک محض تک بندی ہی چاہتے ہیں یہ تو بدتہذیبی کے ساتھ اہانت انبیاء علیہم السلام کی مثالیں تھیں۔ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی توہین کرتے ہیں اور اس میں عوام کی تو کیا شکایت کی جائے خواص تک مبتلا ہیں گو میرے اس بیان سے بعض خشک علماء ناخوش ہوں گے مگر جو بات ناحق ہوگی اس کو تو بیان کیا ہی جائے گا۔ بعض واعظین ومصنفین ومدرسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں اس طرح سے ثابت کرتے ہیں کہ اس سے ان کی تنقیص لازم آتی ہے۔ گو ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس طرح مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بیان کرنا جس سے دوسرے انبیاء کی تنقیص کا وہم بھی ہو جائز نہیں اسی لیے میں نے یہ کہا تھا کہ بعض لوگ تہذیب کے ساتھ انبیاء کی توہین کرتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ مشہور ہے کہ ان کے پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے تھے اب بعض مدرسین اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انبیاء سابقین کے ہر ہر معجزہ کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو ان سے افضل واکمل ثابت کریں۔

چنانچہ اس معجزہ موسوی کے مقابلہ میں بھی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بیان کرتے ہیں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے چشمے جاری ہوگئے تو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے غزوہ حدیبیہ میں پانی جاری ہوگیا تھا جس سے تمام لشکر سیراب ہوگیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کو معجزہ موسوی سے افضل ثابت کرنے کے لیے اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کچھ زیادہ عجیب نہیں کیونکہ بعض پتھروں سے چشمے نکلتے ہیں مگر لحم وشحم سے پانی کا جاری ہوجانا یہ بہت عجیب ہے اس تقریر سے مفضول اور افضل دونوں کی تنقیص لازم آتی ہے مفضول کی تنقیص تو ظاہر ہے کہ اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی وجہ اعجاز کو کمزور کردیا گیا ہے کہ پتھر سے پانی کا نکلنا کچھ چنداں جائے تعجب نہیں گویا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کوئی بڑا بھاری معجزہ نہ تھا (استغفر اللہ) ایک ایسے معجزہ کو جسے حق سبحانہ تعالیٰ نے جابجا امتنان و اظہار قدرت کے لیے بیان فرمایا ہے اعجاز میں کمزور اور معمولی بتلانا کتنا بڑا غضب ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اس سے اس طرح لازم آتی ہے کہ ان حضرات نے اس واقعہ کے معجزہ ہونے کو اس پر موقوف کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں سے پانی نکلتا تھا حالانکہ اس کا کہیں ثبوت نہیں۔ احادیث سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیالہ میں پانی منگا کر اپنا دست مبارک اس میں رکھ دیا تو وہ پانی اُبلنے لگا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے ابلتا ہوا نظر آتا تھا اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ لحم وشحم سے پانی نکلتا تھا بلکہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک رکھ دینے سے وہ پانی بڑھنے لگا اور جوش مارنے لگا اور انگلیوں کے درمیان سے اس کا ابلنا نظر آتا تھا اب جن صاحب نے اس معجزہ کے اعجاز کو اس بات پر موقوف کیا ہے کہ پانی لحم و شحم سے نکلا تھا جس کا کچھ ثبوت نہیں تو گویا در پردہ وہ اس اعجاز کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ لحم وشحم سے تو پانی کا نکلنا ثابت ہی نہ ہوا۔ ایک دوسرے صاحب کہتے ہیں:

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوہ صفات   تو عین ذات ہے نگری در تبسمی

مطلب ان کا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلی صفاتی سے بیہوش ہوگئے اور آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم ہی فرماتے رہے۔ بھلا ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ کیا تم تجلی

طور کے وقت موجود تھے جو تم نے قطعی فیصلہ کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی صفاتی ہوئی تھی یا تم شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے جو یقین کے ساتھ حکم لگاتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی عین ذات ہوئی تھی یا محض تخمین اور قیاس سے جو چاہا حکم لگا دیا حالانکہ شب معراج کا حال کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی کیسی ہوئی تھی۔

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کی کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے جواب میں یہ شعر فرمایا:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　　بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

واقعی خوب ہی جواب دیا اس وقت کسی کی کیا طاقت جو ان اسرار کو یقینی طور پر معلوم کر سکے۔ اگر قسمت میں ہے تو جنت میں جا کر معلوم کر لیں گے باقی یہاں اول تو کسی کو معلوم کس طرح ہو سکتا ہے اور جو کسی کو کشف سے کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ظنی ہے اس پر یقین کیونکر ہو سکتا ہے مگر یہ حضرت تو بڑی پختگی کے ساتھ بلا کھٹکے فرماتے ہیں:

تو عین ذات می نگری در تبسمی

(آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم ہی فرماتے رہے)

گویا یہ بھی معراج کے وقت سارا معاملہ دیکھ رہے تھے پھر اس شعر میں جو فضیلت شاعر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہے وہ فضیلت بھی تو نہیں بن سکتی۔ وہ فضیلت یہ بیان کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک تجلی صفاتی سے بے ہوش ہو گئے تھے اور آپ عین ذات کے مشاہدہ کے وقت بھی تبسم ہی میں رہے۔ اگر تھوڑی دیر کو ان کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی صفاتی ہوئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی ذاتی تو جو نقص یہ موسیٰ علیہ السلام پر لگاتے ہیں اگر معاذ اللہ وہ کوئی نقص ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے زیادہ لازم آئے گا کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے ایک بار درخواست کی تھی کہ تم مجھے ایک دفعہ اپنی اصلی صورت دکھلا

دو حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ دیکھ نہ سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے تو ایک دن حضرت جبریل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے نہایت حسین وجمیل صورت تمام آفاق آسمان کو ان کے پر گھیرے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوان کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا تو آپ بیہوش ہو کر گر پڑے تو اگر کوئی یہودی اس واقعہ سے یہ اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو خدا کی تجلی سے بیہوش ہوئے تھے اور تمہارے نبی ایک فرشتہ کو دیکھ کر بیہوش ہو گئے اگر خدا کو دیکھ کر بیہوش ہو جانا کوئی نقص کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو دیکھ کر بیہوش ہونا اس سے بڑھ کر نقص ہوگا تو اس وقت یہ شاعر صاحب کہاں جائیں گے جو فرماتے ہیں:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوہ صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمی

(موسیٰ علیہ السلام تو ایک تجلی صفاتی سے بیہوش ہو گئے اور آپ نے تجلی ذاتی کا مشاہدہ کیا اور تبسم بھی فرماتے رہے)

بے سمجھی ایسی بات کہہ ڈالنا بھی غضب ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کرنے بیٹھے تھے مگر الٹا اعتراض لازم آ گیا، کسی نے سچ کہا ہے:

دوستی   بے   خرد   چوں   دشمنی   است

(بے عقل کی دوستی دشمنی کی طرح ہے)

اب اس کی حقیقت سنئے بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شب معراج میں بے ہوش نہ ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام کے بیہوش ہو جانے کو دلیل مفضولیت کی ٹھہرائی جاوے نہ موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر بیہوش ہونا کوئی ایسی حالت تھی جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شب معراج میں بے ہوش نہ ہونے کو دلیل افضلیت کہا جاوے بلکہ وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی الٰہی عالم ناسوت میں ہوئی تھی اور اس عالم میں قویٰ انسانی کمزور ہوتے ہیں اس لیے وہ بیہوش ہو گئے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی عالم میں تجلی ہوتی تو آپ بھی بیہوش ہو جاتے۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر آپ کا بیہوش ہو جانا ثابت ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی فقط یہی کہ عالم ناسوت میں آپ کے قویٰ کمزور تھے اور شب معراج میں آپ اس لیے بیہوش نہ ہوئے کہ وہ عالم ملکوت

ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ملکیت غالب تھی آپ کے قوی متحمل ہو گئے تھے عالم ملکوت میں اگر موسیٰ علیہ السلام پر بھی تجلی ہوتی تو وہ بھی بیہوش نہ ہوتے۔

غرض یہ طریقہ ہرگز پسندیدہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل دیگر انبیاء کا مقابلہ کر کے اس طرح بیان کیے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اس سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تنقیص لازم آجاتی ہے اور اگر یہ نہ بھی ہو تب بھی آخر دیگر انبیاء علیہم السلام کا ادب بھی تو لازمی ہے جب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ادب کرتے تھے تو ہم کو ضرور ان کا ادب کرنا چاہیے۔ بس اسلم یہ ہے کہ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اتباع کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لاتفضلوا بین انبیاء اللّٰہ" مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ تم انبیاء میں ایک کو دوسرے پر محض اپنی رائے سے کسی وجہ سے افضل نہ ثابت کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ انبیاء سب برابر ہیں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں کیونکہ بعض مقامات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کچھ اپنے فضائل ذکر فرمائے ہیں کیونکہ اُمت پر ان فضائل کا اعتقاد ضروری تھا۔ سو ان فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ "لاتفضلوا بین انبیاء اللّٰہ"[۱] (انبیاء علیہم السلام کے درمیان ایک کو دوسرے پر اپنی رائے سے فضیلت مت دو) تفضیل بالرائے کی نفی مقصود ہے کہ تم خود اپنی رائے سے وجہ فضیلت تراش کر کے انبیاء میں تفضیل مت کرو کہ اس میں اندیشہ دیگر انبیاء کی تنقیص کا ہے اور فضائل منصوصہ کے بیان کرنے میں یہ اندیشہ نہیں کیونکہ وہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ارشاد فرمودہ ہیں ان میں سے کسی کی تنقیص نہیں۔ مثلاً فضائل منصوصہ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "انا خاتم النبیین لا نبی بعدی"

فضائل منصوصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔[۲] "انا سید ولد ادم" میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔ "انا اول شافع و اوّل مشفع"[۳] میں سب سے پہلے

---

[۱] (الصحیح للبخاری ۴: ۱۹۴، الصحیح لمسلم الفضائل ب ۴۲، رقم: ۱۵۹)

[۲] (اتحاف السادۃ المتقین ۲: ۳۶)

[۳] (سنن ابن ماجہ: ۴۳۰۸، سنن الدارمی ۱: ۲۷)

شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔"انا صاحب لواء الحمد و ادم ومن بعده تحت لوائی" میرے ہی ہاتھ میں لواالحمد ہوگا آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے تمام آدمی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔"لو کان موسیٰ حیا لما وسعه الا اتباعی"[1] اگر اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو میری ہی اتباع کرتے اور اس کے سوا فضائل منصوصہ بکثرت ہیں اگر کسی کو شوق ہو تو یہ فضائل بیان کرے مگر اپنی طرف سے تراش کرنا وجوہ فضائل بیان کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔کیا کہوں علماء تک اس میں مبتلا ہیں ایک تفسیر کی کتاب جو داخل درس ہے اور سب اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس تک میں ایسے مضامین موجود ہیں۔موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب بنی اسرائیل کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے چلے تو طلوع شمس کے بعد فرعون نے ان کو جالیا اس کا لشکر قریب پہنچ گیا تو بنی اسرائیل نے گھبرا کر کہا کہ بس ہم تو پکڑے گئے اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا" کلا ان معی ربی سیهدین" (بلا شک اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہنچادے گا)اس پر وہ مفسر لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو ترجیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبرؓ سے فرمایا تھا جبکہ کفار غار کے قریب پہنچ گئے اور وہاں جا کر باتیں کرنے لگے کہ یہاں تک تو نشان قدم کا پتہ چلتا ہے یہاں سے آگے نشان قدم نہیں معلوم ہوتے نہ معلوم آسمان پر چڑھ گئے یا زمین میں غائب ہوگئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف نگاہ کریں تو ہم کو دیکھ لیں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا"لا تحزن ان اللّٰہ معنا"(مت غمگین ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے)وہ مفسر فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے معی فرمایا بصیغہ واحد متکلم کہ خدا میرے ساتھ ہے اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معنا بصیغہ جمع متکلم فرمایا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کے صیغہ سے دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک فرمایا دوسرے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم فرمایا۔"ان معی ربی"(بے

---

[1] (الاسرار المرفوعة لعلی القاری:۸۳)

شک اللہ میرے ساتھ ہے) پہلے معی ہے پھر ربی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا "ان اللہ معنا" میں کہتا ہوں کہ بلاغت کوئی کمالات نبوت سے نہیں نبوت کے کمالات دوسری قسم کے ہیں۔ بلاغت کو اس میں کیا دخل اس کی تو بالکل ایسی مثال ہوئی کہ جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یوسف علیہ السلام تمام انبیاء سے زیادہ حسین تھے اس لیے وہ سب سے افضل تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہی جواب دیا جائے گا کہ حسن صورت کمالات نبوت سے نہیں اس لیے اس سے فضیلت ثابت نہیں ہوسکتی۔ بس اسی طرح بلاغت کلام بھی کوئی شرائط نبوت سے نہیں جس کی وجہ سے ایک نبی کی دوسرے کے اوپر فضیلت ثابت کی جاسکے ورنہ اگر فضیلت کے یہی معنی ہیں کہ ہر بات میں افضل ہو تو شاید یہ بھی دعویٰ کیا جائے گا کہ فلاں ولی سے رستم افضل ہے کیونکہ رستم کی قوت جسمانی اس ولی سے زیادہ تھی مگر ظاہر ہے کہ اس سے اس ولی کی طرف کوئی نقص عائد نہیں ہوسکتا' کمالات ولایت میں قوت جسم کو کیا دخل ہاں قوت قلبیہ مقبولین کی سب اقویاء سے زیادہ ہوتی ہے جس کا اندازہ قوت فیضان سے ہوسکتا ہے۔ یہ گفتگو تو تسلیم کے بعد تھی ورنہ ہم یہ ہی تسلیم نہیں کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بلاغت میں کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے کم ہے کیونکہ بلاغت کلام کے معنی یہ ہیں کہ کلام مقتضی حال کے موافق ہو تو ان دونوں اقوال میں سے کسی کو دوسرے سے ابلغ اس وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ دونوں یکساں حال میں صادر ہوئے اور دونوں حال بالکل متحد تھے اور یہ ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جگہ حال مختلف تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک اکھڑ جاہل قوم تھی جس وقت لشکر فرعون کو اس نے آتے ہوئے دیکھ لیا تو موسیٰ علیہ السلام کے قول پر بھی ان کو اعتماد نہ رہا کہ حق تعالیٰ میری مدد فرمائیں گے اور اس قوم ظالم سے مجھ کو نجات دیں گے۔ انہوں نے بڑی پختگی اور یقین کے ساتھ یہ کہہ ڈالا کہ "انا لمدرکون" کہ اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے جملہ اسمیہ اور "ان ولام تاکید" ان کلام میں موجود ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں سے بے اعتقاد ہو کر کہا تھا۔ اب فرمایئے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معیت حق کہاں باقی رہی تھی۔ یہ حال اسی کو چاہتا ہے کہ "ان معی ربی" (یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے) بصیغہ واحد استعمال کیا جائے۔

شان صدیق اکبرؓ

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو "ان اللہ معنا" (بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں) بصیغہ جمع ارشاد فرمایا وہاں کیا حال تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت فقط صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ (نعوذ باللہ) صدیق اکبرؓ نے کوئی بے اعتقادی کی بات ظاہر کی ہو یا ان کے کسی حال سے بے اعتقادی ظاہر ہوئی ہو بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو اس وقت حزن تھا وہ اپنی جان کے اندیشہ کی وجہ سے نہ تھا ورنہ اپنے کو سانپ کے منہ میں نہ دیتے بلکہ ان کا سارا حزن فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہیں بال بیکا نہ ہو جائے تو ایک تو وہ حال تھا کہ ساتھ میں بے اعتقاد قوم تھی جس نے دشمن کو آتے ہوئے دیکھ کر یقین کر لیا کہ بس ہم گرفتار ہو جائیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کے وعدوں کے ہوتے ہوئے کیسے پختگی کے ساتھ زبان سے یہ لفظ نکل گئے "انا لمدرکون" (اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے) یہ بھی نہ خیال کیا کہ ہم خدا کے حکم سے نکلے ہیں خدا تعالیٰ نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے ایسی قوم کے لیے یہی جواب زیبا تھا جو موسیٰ علیہ السلام نے دیا "کلا ان معی ربی سیھدین" کہ سب سے پہلے لفظ کلا بڑھایا جو لغت عربی میں ڈانٹنے اور دھمکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ گویا کہ کلے پر طمانچہ مار دیا کہ ہرگز نہیں خدا میرے ساتھ ہے وہ مجھ کو راہ پر پہنچائے گا۔

دوسری جگہ یہ حالت ہے کہ ساتھ میں ایک صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے جس سے کبھی بے اعتقادی کا وہم بھی نہیں ہوا' ہمیشہ ہر بات کو سب سے پہلے ماننے والا ہے اور جان نثار ہے کہ اس کو اپنی جان کا غم نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا غم تھا اس کو معیت حق میں کیونکر نہ شریک کیا جاتا اور کیونکر اس کی تسلی نہ کی جاتی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا "لاتحزن" غم نہ کرو "ان اللہ معنا" خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔

غرض کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام اس حال کے مقتضی کے بالکل موافق تھا اگر وہ حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتا تو بقاعدہ بلاغت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غالباً "ان معی ربی" یقیناً میرا رب میرے ساتھ ہے) ہی فرماتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس حال کے

مقتضی کے موافق تھا اگر یہ حال موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوتا تو وہ بھی غالبًا "ان اللّٰہ معنا" (یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) ہی فرماتے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ اپنی طرف سے تراشی ہوئی وجہ فضیلت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کو ذرا سے تامل کے بعد ایک ادنیٰ طالب علم نے توڑ دیا۔ اب بھلا ان حضرت مفسر سے کوئی پوچھے کہ جیسا آپ نے دونوں اقوال کو تو دیکھا تھا احوال کو بھی تو دیکھا ہوتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول کس موقعہ پر صادر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کیسے موقعہ پر صادر ہوا اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ذکر کو خدا کے ذکر سے مقدم کیا اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے ذکر کو اپنے ذکر سے مقدم کیا۔

اے صاحبو! کیا اس تقریر میں موسیٰ علیہ السلام پر سخت اعتراض نہیں ہوا کہ معاذ اللہ ان کو بولنا بھی نہ آتا تھا ان کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہ تھا کہ خدا کے ذکر سے اپنے ذکر کو مقدم کر دیا' میں یہ نہیں کہتا کہ مفسر کے دل میں بھی یہ اعتراض ہوگا مگر ان کی اس تقریر سے ہر سننے والے کو موسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہی بدگمانی پیدا ہوگی۔ استغفر اللہ العظیم مگر میں کہتا ہوں کہ اس سے بھی موسیٰ علیہ السلام کا قول کسی طرح غیر ابلغ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہیوں کے قول سے چونکہ بے اعتقادی اور عدم یقین بر وعدہ خداوندی کا ظہور ہو چکا تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام اس جواب میں ناراضی کے ساتھ یہ بات ظاہر فرماتے ہیں کہ جب تمہارے اعتقاد و یقین کی یہ حالت ہے تو فقط میرے ہی ساتھ معیت حق شامل ہے تمہارے ساتھ معیت حق نہیں تو آپ کا مقصود حصر بیان فرمانا ہے اور قاعدہ بلاغت مشہور ہے۔ "تقدیم ماحقه التاخیر یفید الحصر" (جس کا حق مؤخر کرنے کا اس کو مقدم کر دینا حصر کا فائدہ دیتا ہے) اس لیے آپ نے لفظ معی کو ربی سے مقدم فرمایا تو حصر کے لیے کسی لفظ متاخر کو مقدم کر دینا یہ تو عین بلاغت ہے اس سے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی کامل بلاغت باقی رہی یا کم ہوئی اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ حصر مقصود نہ تھا اس لیے آپ نے اپنے ذکر کو مقدم نہ فرمایا چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی معیت حق میں شامل کرنا تھا کیونکہ ان سے جس جاں نثاری کا ظہور ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ اس قابل تھے کہ ان

کو معیت حق میں شریک کیا جائے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حصر مقصود ہوتا تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی با قاعدہ بلاغت اپنے ذکر کو مقدم فرماتے تو یہ غیر ابلغ کیا ہوا۔

غرض معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی آپ کے مقابلہ میں تنقیص کی جائے۔ ایسی عظمت سے نہ خدا تعالیٰ راضی ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہیں ایک بار اسی قسم کا واقعہ دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش ہوا کہ ایک صحابی کے ساتھ کسی یہودی کی گفتگو ہوئی' مسلمان صحابی نے ضمن قسم میں یہ فرمایا تھا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ وہ یہودی قسم ہی کے ضمن میں کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابی نے غصہ میں آ کر یہودی کے ایک طمانچہ مارا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی پر غصہ ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ **"لاتفضلوا بین انبیاء اللّٰہ"**[1] (انبیاء علیہم السلام کے درمیان اپنی رائے سے ایک کو دوسرے پر فضیلت مت دو) اگر چہ اس یہودی کا قول حقیقت میں غلط تھا اور صحابی حق پر تھے جو بات وہ کہہ رہے تھے غلط نہ تھی فی الواقع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل ہیں مگر اس وقت ان صحابی کے فعل سے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کا شبہ ہو سکتا تھا (اگر چہ ان کی نیت یہ نہ تھی) اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گفتگو سے منع فرما دیا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ طرز جو بعض حضرات علماء نے اختیار فرمایا ہے اچھا نہیں ہے اس میں بڑا خطرہ ہے اگر چہ ان کی نیت تنقیص کی نہ ہو مگر اس قسم کی تقریروں سے جو کہ مقابلہ کی صورت سے محض رائے سے ہوں تنقیص لازم آ ہی جاتی ہے۔

یہ گفتگو تھی حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کے ایک گروہ کے باب میں اور ان حقیقی عظمت نہ کرنے والوں کا ایک گروہ اور بھی ہے یعنی آج کل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت وہ یہ کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت کو جانتے ہی نہیں۔ گو ظاہر میں عظمت کرتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بوجہ ملکیت اور سلطنت کے کرتے ہیں

---

[1] (الصحیح للبخاری ۴: ۱۹۴' الصحیح لمسلم الفضائل ب ۴۲' رقم: ۱۵۹)

انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات میں سے صرف انتظام مملکت اور تمدن و سیاست کو منتخب کر لیا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کریں گے تو ان سب کا خلاصہ یہ نکلے گا کہ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑے بیدار مغز بادشاہ اور ریفارمر تھے کہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت سے عرب جیسی جاہل قوم کو مہذب بنا دیا اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کر کے سب کو متحد و متفق بنا کر حکمرانی اور سلطنت کے قابل ان کو بنا دیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی کمالات وہ ہیں جو بحیثیت نبوت کے ہیں گو آپ میں اور شیون وکمالات بھی تھے مگر وہ دوسرے کمالات اس کمال نبوت کے تابع ہیں ان میں سے ایک ملک وسلطان ہونا بھی ہے مگر آج کل کی نئی تعلیم یافتہ جماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فضائل میں صرف شان ملکیت و بادشاہت کی وجہ سے آپ کی عظمت کرتے ہیں آپ کی نبوت ورسالت کے کمالات سے بحث نہیں کرتے کہ آپ کی معرفت وعلم کے ساتھ آپ سے معجزات وخوارق کیسے کیسے صادر ہوئے بلکہ اکثر تو مغربی تعلیم کے اثر سے مغلوب ہو کر معجزات کا انکار ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ آج کل ایک جدید سیرت نبویہ چھپی ہے جس پر تمام نئی تعلیم یافتہ جماعت غش ہے مگر اس کو اول سے آخر تک دیکھنے سے جو خلاصہ نکلتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت بڑے مدبر و بیدار مغز بادشاہ تھے یا ایک مصلح قوم ریفارمر تھے اور اس سیرت کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بادشاہ کی سیرت ہے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی اولوالعزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات رسالت کی بحث ہی نہیں۔

میں جب ضلع فتح پور گیا تو ایک صاحب میرے ملنے والے ہیں انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ وہ سیرت میرے پاس بھیجی کہ ذرا اس کو دیکھ لو اور یہ بتلا دو کہ یہ سیرت دیکھنے کے قابل ہے یا نہیں؟ میں نے یہ عذر کیا کہ بھائی میں اس وقت سفر میں ہوں اس وقت ساری کتاب کا دیکھنا دشوار ہے اور دو تین مواقع دیکھ کر میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا خوبی ہے اور کیا خرابی ہے۔ جب میں وطن پہنچوں گا وہاں بھیج دی جائے تو میں وہاں دیکھ کر اس کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اسی مجلس میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ آپ کو اس ساری کتاب

کے دیکھنے کی ضرورت نہیں میں ایک موقع دکھاتا ہوں بس اسی کو دیکھ لینا کافی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک موقع نکال کر دکھایا اس جگہ مصنف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کمالات کو ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ عیسٰی علیہ السلام میں انتظام سلطنت کی قابلیت نہ تھی۔ نوح علیہ السلام میں رحمت وشفقت کا مضمون نہ تھا' میں نے کہا لو بھائی اس کتاب کا حال تو اسی موقع سے معلوم ہوگیا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کی گئی ہے آپ کے بھائیوں کو عاری عن الفضائل (فضائل سے خالی) بتلا کر۔ اسی سے قیاس کرلو کہ جب مصنف کے دل میں انبیاء علیہم السلام کی یہ وقعت ہے تو اور کیا کچھ گل کھلائے ہوں گے۔

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

(میرے چمن ہی سے میری بہار کا اندازہ کرلو)

میرے نزدیک وہ سیرت ہرگز قابل دیکھنے کے نہیں جس میں انبیاء علیہم السلام کی تنقیص کی گئی ہو۔

ملکہ سلطنت حضرت عیسٰی علیہ السلام

صاحبو! یہ کتنا بڑا غضب ہے کہ عیسٰی علیہ السلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان میں سلیقہ ملک داری نہ تھا حالانکہ احادیث صحاح میں وارد ہے کہ حضرت سیدنا عیسٰی علیہ السلام آخر زمانہ میں نزول فرمائیں گے اور اس وقت وہ بادشاہت بھی کریں گے اور انتظام سلطنت بہت خوبی کے ساتھ انجام دیں گے تو جس شخص کے انتظام سلطنت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدح فرمائیں' اب کسی کا کیا منہ ہے جو ان پر یہ الزام لگائے کہ ان میں سلیقہ ملک داری نہ تھا۔ عیسٰی علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں چونکہ ساری عمر زہد وپارسائی کے ساتھ بسر کی اس لیے اس سے یہ قیاس کرلیا گیا کہ ان کو انتظام سلطنت آتا ہی نہ تھا سو خود یہ قیاس کتنا غلط قیاس ہے۔ بھلا بادشاہت نہ کرنے سے یہ کیونکر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں قابلیت ہی نہ تھی قابلیت نہ ہونا تو یوں معلوم ہوسکتا ہے کہ بادشاہت کرتے اور اچھے طریقے سے نہ کرتے۔

اس باب میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے کہ عیسٰی علیہ السلام آخر زمانہ میں نازل ہوں گے اور مسلمانوں پر بادشاہت کریں گے اور نہایت عدل وخوبی کے ساتھ

بادشاہت کریں گے اوران میں ایسی قابلیت ہوگی کہ ایک بہت بڑے قانون کا انتظام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سپرد فرماتے ہیں وہ یہ کہ جزیہ کو موقوف کردیں گے جس پر بظاہر یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تو شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہوکر تشریف لائیں گے پھر وہ شریعت کے کسی حکم کو کیونکر منسوخ کریں گے مگر میری تقریر سے جواب نکل آیا۔ اگرچہ صورتاً خبر ہے مگر معنًا انشاء ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو امر فرما گئے ہیں کہ اپنے زمانہ میں آپ جزیہ کو موقوف فرمادیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اتنا بڑا مدبر تسلیم فرماتے ہیں کہ ان کے سپرد اتنا بڑا قانون فرماتے ہیں کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دیتے۔ بات یہ ہے کہ ان میں ملکہ سلطنت کامل ہے۔ مگر جب تک حق تعالیٰ نے اس سے کام لینے کو نہیں فرمایا اس سے کام نہیں لیا اور جب اس سے کام لینے کا حکم ہوگا کام لیں گے۔

ترحم سیدنا حضرت نوح علیہ السلام

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ ان میں ترحم کم تھا۔ افسوس کہ یہ لوگ قرآن کو بھی تو نہیں دیکھتے۔ قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی موجود ہے:

"واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون واصنع الفلک باعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انهم مغرقون."

ترجمہ: ان آیات کریمہ کا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ بس اب آپ کی قوم میں سے بجز ان لوگوں کے جو کہ ایمان لاچکے ہیں اور کوئی بھی ایمان نہ لائے گا تو آپ ان کے افعال سے رنجیدہ نہ ہوجائیے۔ معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کے افعال سے رنج ہوتا تھا اور رنج ہونا شفقت کی دلیل ہے۔ شفقت نہ ہوتی تو ان کے افعال کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی۔ یہی سمجھتے کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے مگر نہیں ان کو بوجہ شفقت کے رنج ہوتا تھا ہاں جب تو حق تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ بس اب مت رنج کرو تو پھر رنج نہیں کیا اور ان کی طرف سے دل کو خالی کرلیا۔ اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ تم ایک کشتی ہمارے

سامنے اور ہمارے حکم سے بناؤ اور ان ظالموں کی بابت اب کوئی بات ہم سے نہ کیجیو یہ بالیقین غرق ہوں گے۔

بھلا جب حق تعالیٰ نے صاف صاف منع فرمادیا کہ اب ان لوگوں کی بابت مجھ سے بات نہ کیجیو تو حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیسے ظاہر کر سکتے تھے مگر انہوں نے پھر بھی جہاں ذرا سی گنجائش پائی شفقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمہارے اہل کو غرق نہ کریں گے جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے لگا تو حق تعالیٰ سے اس کی سفارش کی "**ونادیٰ نوح ربه فقال رب ان ابنی من اهلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین**" یعنی نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ یا اللہ میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے اور آپ کا وعدہ سچا ہے یعنی آپ وعدہ فرما چکے ہیں کہ تمہارے اہل کو ہم غرق نہ کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں تھا اس کے اعمال برے تھے اور تمہارے اہل سے مراد وہ لوگ تھے جو کہ آپ کے خاندان کے ہوں اور متبع بھی ہوں تو دیکھئے شفقت نہ ہوتی تو بیٹے کے واسطے عرض نہ کرتے۔ شاید آپ یہ کہیں کہ اپنے بیٹے کے لیے دعا کرنا اور سفارش کرنا یہ تو دلیل شفقت نہیں ہو سکتی کیونکہ اپنے بیٹے سے تو باپ کو شفقت ہوا ہی کرتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو نوح علیہ السلام پیغمبر تھے اور انبیاء علیہم السلام مثل اپنی اولاد کے دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں مگر چونکہ دوسروں کی سفارش کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی تھی اس لیے نہ کر سکے اور بیٹے کے بارے میں چونکہ عرض معروض کی گنجائش تھی بوجہ وعدہ سابق کے اس لیے ذرا سی گنجائش پر بھی نہ چوکے اور فوراً عرض کر ہی دیا اس سے ہم یہی سمجھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو دوسروں پر بھی شفقت تھی مگر بوجہ گنجائش باقی نہ رہنے کے ان کے لیے عفو کی دعا نہ کر سکے۔

دوسرے یہ کہ یہ تو مسلم ہے کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت و شفقت ہوا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب بیٹا انتہا درجہ کا سرکش و نافرمان ہو تو وہ شفقت جاتی رہتی ہے۔ چنانچہ امتحان کے طور پر ان والدین کا حال دیکھ لیا جاوے جن کی اولاد نافرمان ہے کہ وہ کس قدر اپنی اولاد سے بیزار رہتے ہیں۔ خصوصاً مذہبی مخالفت یہ تو ایسی مخالفت ہے

کہ اس کے بعد تو شفقت رہا ہی نہیں کرتی۔ خصوصاً انبیاء علیہم السلام کو ان کی محبت و بغض تو سب فی اللہ ہوتی ہے۔ خیر! ابراہیم علیہ السلام کے والد ابراہیم علیہ السلام کو مخالف فی الدین اور بتوں کی برائی کرتے ہوئے دیکھ کر غصے میں آ کر کہتے ہیں: "قال اراغب انت عن الھتی یا ابراھیم لئن لم تنتہ لارجمنک واھجرنی ملیاً" کہ اے ابراہیم کیا تم میرے بتوں سے بے رخ ہوا گر تم اس بے رخی سے باز نہ آؤ گے تو میں تم کو پتھر مار مار کر قتل کر دوں گا اور میرے پاس سے مدت العمر کے لیے دور ہو جاؤ تو انبیاء کا تو مخالف فی الدین کے ساتھ کیا حال ہوگا اور ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام کا وہ بیٹا ان کا نہایت نافرمان اور سرکش بیٹا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین میں مخالف تھا۔ اس کے بعد بھی نوح علیہ السلام کی یہ شفقت کہ یہ طوفان آیا تو اس نافرمان سے آپ فرماتے ہیں کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ تو بھی کشتی میں سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ مت رہ نہیں تو غرق ہو جائے گا۔ اس نے اس بات کو بھی منظور نہ کیا یہاں تک کہ اس کو بھی موج طوفان نے غرق کر دیا۔ اس قدر سرکشی کے بعد بھی جب وہ غرق ہو گیا تو نوح علیہ السلام پھر بھی حق تعالیٰ شانہ سے اس کی بابت عرض معروض کرتے ہیں۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ کم بخت اپنے ہاتھوں تباہ ہوا میں کیا کروں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام میں شفقت بہت ہی زیادہ تھی ورنہ اس قدر سرکشی کے بعد کیسا ہی باپ ہو اس کو بھی شفقت نہیں رہا کرتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کی صفت شفقت و مرحمت میں ذرا کمی نہ تھی۔ پس پھر جو قوم کے لیے بددعا کی معلوم ہوا کہ بامرِ حق تھی۔ تیسری بات یہ تھی کہ نوح علیہ السلام نے جو بددعا اپنی قوم کے حق میں کی تھی اگر وہ دعا بے رحمی کی تھی تو حق تعالیٰ شانہ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے مگر جب حق تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا تو معلوم ہوا کہ وہ بددعا بے رحمی کی نہ تھی اگر اس بددعا کی وجہ سے نوح علیہ السلام بے رحم ہوتے تو پھر حق تعالیٰ کو بھی بے رحم کہو کہ انہوں نے ایسی بے رحمی کی بددعا کو قبول فرمالیا اور ایک نوح علیہ السلام ہی کی دعا کو نہیں۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کو بھی اسی طرح قبول فرمایا تھا۔ "ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم" (ہمارے پروردگار ان کے اموال کو ہلاک کرا اور ان کے دلوں پر سختی کر پس وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ کے دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں)

تو اے جنٹل مینو! یہ الزام تم نوح علیہ السلام کو کیا دیتے ہو کہ وہ بے رحم تھے صاف یوں ہی کہہ دو نا کہ خدا تعالیٰ بھی (معاذ اللہ) بے رحم ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ کے دربار میں ممکن ہے کہ جا بجا درخواستیں منظور ہو جایا کریں جس کا نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی قانون۔ اگر یہ ہے تو حق تعالیٰ کا دربار کیا ہوا۔ شان اودھ کی کچہری ہوئی کہ جو کسی نے کہہ دیا بس ہو گیا چاہے حق ہو چاہے ناحق تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار میں اندھیر کھاتہ ہے کہ کچھ قاعدہ ہی مقرر نہیں کہ کس دعا کو قبول کرنا چاہیے کس دعا کو قبول نہ کرنا چاہیے بس جس کی دعا چاہی منظور کر لی خواہ وہ کیسی ہی بے رحمی کی دعا ہو اور جس کی چاہے رد کر دی خواہ وہ اچھی ہی ہو کیا (نعوذ باللہ) خدا کا دربار اس آنریری مجسٹریٹ کے دربار جیسا ہوگا جس کو بوجہ ریاست کے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا مگر لیاقت خاک نہ تھی جب آپ کے پاس مقدمات آنے شروع ہوئے تو بڑی فکر ہوئی کہ کیا کروں' مقدمات کس طرح فیصل کروں' تو آپ ایک دوسرے آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے کہ دیکھوں وہ کس طرح مقدمات فیصل کرتا ہے تو اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک مقدمہ کی مثل آئی اس کے بارے میں انہوں نے پڑھ کر کہا کہ منظور پھر ایک دوسری مثل آئی اس کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ نامنظور۔ یہ اناڑی مجسٹریٹ بہت خوش ہوئے کہ بس ہم کو فیصلہ کرنا آ گیا۔ اب آپ عدالت کرنے بیٹھے مقدمات کی مثلیں پیش ہوئیں' پس جو اول ہاتھ میں آ گئی اسے کہہ دیا منجور جو اس کے بعد ہاتھ میں آ گئی وہ نامنجور' نامنظور۔ بس اب کیا تھا دو منٹ میں مقدمات طے ہونے لگے منجور نامنجور دو لفظوں میں قصہ پاک ہوا۔ نہ مثل کا پڑھنا نہ سننا نہ یہ خبر کہ یہ قابل منظوری کے ہے یا نہیں۔ بس طاق سلسلہ میں آ جانا چاہیے وہ منظور ہو گئی کوئی جو جفت عدد کے سلسلہ میں پڑ گئی وہ نامنظور ہو گئی تو کیا معاذ اللہ خدا کے دربار کو بھی ایسا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہاں بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ درخواست قابل منظوری کے ہے یا نہیں فقط منظور و نامنظور سے فیصلہ کیا جاتا ہے (استغفر اللہ العظیم) خدا کی کیا عظمت ہے اور اگر یہ احتمال نہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی کی وجہ سے ہرگز نہ تھی ورنہ حق تعالیٰ شانہ اس کو ہرگز قبول نہ فرماتے کیا حق تعالیٰ کے ذمہ رسول کی ہر بات ماننا ضروری ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کی دعا کو قبول نہیں فرمایا تو اگر نوح علیہ السلام کی بددعا قابل قبول نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اس کو بھی رد فرما دیتے۔

معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کی قوم اسی قابل تھی کہ ان کو بالکل تباہ کر دیا جائے وہ ہرگز قابل رحم نہ تھی یہاں تک کہ تنگ آ کر نوح علیہ السلام نے ان پر بددعا کی۔ ساڑھے نو سو برس تک تو ان کو سمجھایا نصیحت کی مگر وہ ہمیشہ ان پر سختیاں ہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اکثر وعظ و نصیحت کے وقت ان کو اس قدر تکلیف پہنچاتے تھے کہ وہ بیہوش ہو جاتے تھے جب نو سو برس تک ان کی یہی حالت رہی تب ان کے حق میں بددعا کی اس قدر ایذا شاید ہی کسی نبی کو اپنی قوم سے پہنچی ہو پھر حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے ان کے بارے میں ہم سے بات نہ کیجئے نہ ان کے افعال سے رنج کیجئے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ رحم کے قابل ہی نہ تھے مگر ایک نئے مجتہد صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل بیان کر رہے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی اہانت کی جارہی ہے اور پھر آپ کی بھی اگر تعظیم کی تو بحیثیت بادشاہ ہونے کے۔

غرض اس طرح لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی کر رہے ہیں کہ کوئی صرف اطاعت کو ضروری سمجھتا ہے محبت و عظمت سے ان کو تعلق نہیں' کوئی محبت کا دم بھرتا ہے اطاعت و عظمت سے اس کو واسطہ نہیں کوئی آپ کی عظمت کرتا ہے تو اس طرح کہ محض بادشاہت کی حیثیت سے اور یا اس طرح کہ جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جاتی ہو بلکہ بعض مرتبہ حق تعالیٰ شانہ کی بے ادبی ہو جاتی ہے اس لیے اس کی تلافی کی ضرورت ہے اور تلافی ہوتی ہے کوتاہیوں کا سبب دریافت ہونے سے اور سبب ان سب کوتاہیوں کا یہ ہے کہ لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض ضابطہ کا تعلق ہے' کوئی خصوصیت کا تعلق نہیں حالانکہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق بھی ہونا چاہیے اور خاص تعلق پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات بیان کیے جائیں۔

اہل معرفت کا مذاق

دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ انعامات و احسانات بیان کیے جائیں جو ہمارے حال پر آپ نے فرمائے ہیں تو یہ دو امر ضروری ہوئے پھر ان میں بھی باہم ایک تفاوت ہے وہ یہ کہ فضائل و کمالات سن کر خاص تعلق بہت کم لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں اکثر

یہی دیکھا جاتا ہے کہ "الانسان عبد الاحسان" انسان احسان کا غلام ہے جب کسی کے احسانات اپنے اوپر بہت دیکھتے ہیں اکثر خاص تعلق اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جو خاص اہل معرفت ہیں ان کا تو مذاق یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو کوئی بھی نفع نہ پہنچے جب بھی وہ جان و مال سے آپ پر فدا ہیں۔ جیسا عارف شیرازی محبت للنفس کا مذاق بقاء محبت کے باب میں فرماتے ہیں:

ہر چند آز مودم ازوے نبود سودم من جرب المجرب حلت به الندامه

(میں نے ہر چند آزمایا مجھ کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا جو شخص تجربہ کار کا تجربہ کرتا ہے اس کو ندامت اٹھانا پڑتی ہے)

تو محب اللہ کا تو کیا پوچھنا ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان کو وحی قطعی سے بھی معلوم ہو جاوے کہ ہماری قسمت میں ابدالآباد کے لیے جہنم میں رہنا مقدر ہے تب بھی ان کی محبت میں ذرا کمی نہ ہوگی، نفع نہ ہونے کی صورت میں جمیع عاشقین یہی کرتے ہیں کہ محبوب کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرتے ہیں اور اپنی محرومی پر بھی دل خوش رہتے ہیں۔

میل من سوئے وصال و میل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف میں نے اپنی مراد کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے)

مگر یہ خاص ہی عاشقین کا مذاق ہے سب کا یہ مذاق نہیں ہوتا۔

عاشق احسانی

اسی لیے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں عاشق ذاتی یا صفاتی نہیں (کیونکہ عاشق کی تین قسمیں ہیں ایک عاشق ذاتی' ایک عاشق صفاتی' ایک عاشق احسانی۔

عاشق ذاتی تو محض محبوب کی ذات ہی کو محبت کے قابل سمجھتا ہے چاہے اس میں کوئی بھی کمال نہ ہو اور عاشق صفاتی محبوب سے بوجہ اس کے کمالات کے محبت کرتا ہے اور عاشق احسانی وہ ہے جو بوجہ محبوب کے احسانات کے اس سے محبت کرتا ہے۔ تو فرمایا کہ بھائی ہم

لوگ عاشق احسانی ہیں جب تک راحت سے گزرتی رہے تو محبت قائم رہتی ہے اور اگر ذرا ادھر سے عطا میں کمی ہو جائے تو ہماری محبت کمزور ہو جاتی ہے اسی لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترک لذات امر نہ فرماتے تھے بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ خوب کھاؤ پیو اور کام بھی خوب کرو۔ اس کا راز یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگوں میں قوت تھی اس لیے راحت و تکلیف دونوں حالت میں ان کو حق تعالیٰ سے تعلق یکساں رہتا تھا اور اب ضعف ہے اگر مزیدار نعمتیں ملتی رہیں تب تو حق تعالیٰ سے محبت بڑھتی رہتی ہے اور نہیں تو مشقت و تکلیف میں وہ حالت نہیں رہتی اور فرمایا کہ یہی راز ہے کہ شریعت نے حج کے واسطے زاد و راحلہ کی شرط لگائی کیونکہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں جب راحت کے ساتھ حج کریں گے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی اور اگر زاد و راحلہ نہ ہوا اور سفر میں کلفت درپیش ہوئی تو بجائے محبت کے اور دل میں رکاوٹ پیدا ہوگی مگر یہ زاد و راحلہ کی قید ان ہی ضعفاء کے لیے ہے جو کہ عاشق احسانی ہیں ورنہ اقویاء کی بابت تو خود نص میں ذکر ہے۔ "واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق" حق تعالیٰ شانہ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ آپ کے پاس پیدل اور دبلی اونٹنیوں پر سوار ہو کر آویں گے۔ معلوم ہوا کہ بعض لوگ پیدل بھی آویں گے جن کے پاس زاد و راحلہ نہ ہوگا اور ان کو پیدل جانے میں گناہ بھی نہ ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ اس مقام پر ان آنے والوں کی مدح فرما رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ پیدل آنے والے بھی حق تعالیٰ کے یہاں ممدوح ہوں گے تو یہ لوگ ضعفاء نہیں ہیں یہ لوگ اقویاء ہیں جن کے واسطے زاد و راحلہ کی کوئی قید نہیں ان کو اس سفر کی کسی کلفت سے پریشانی نہیں ہوتی۔

ایک ایسے ہی عاشق کا قصہ یاد آ گیا کہ وہ حج کے لیے چلے مگر بالکل آزاد تھے کہ وضع داری رسمی سے بھی آزاد کبھی گاتے کبھی دف بجاتے، لوگ ان کو مسخرہ سمجھتے تھے کسی کو بھی نہ معلوم تھا کہ یہ کوئی عاشق ہے۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے اور بیت اللہ کا طواف کرنے چلے تو دروازہ کے باہر ہی سے خانہ کعبہ نظر آیا، مطوف نے کہا کہ یہ کعبہ ہے پس بیقرار ہو گئے اور بے ساختہ زبان پر جاری ہو گیا:

چہ رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　　　که مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب پر جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اس پر فدا کر دو شاید پھر تمنائے دلی پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

اور فوراً بیہوش ہو کر گرے اور جاں بحق ہو گئے تو بھلا جو ایسے عاشق ہوں کہ وصال کی تاب بھی نہ لا سکیں سفر کی مشقت سے ان کی محبت میں کمی ہو سکتی ہے ان کی تو اگر بوٹی بوٹی بھی کر دی جاوے تب بھی محبت میں زیادتی ہی ہوتی رہے مگر ہم لوگ زیادہ تر چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لیے شریعت نے زاد و راحلہ کی شرط پر حج کو واجب کیا ہے۔ گو بعض وقت ہم لوگوں کو بھی شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم بھی عاشق ذاتی ہیں مگر بات یہ ہے کہ اس وقت احسانات خداوندی ذہن میں حاضر نہیں ہوتے اور محبت دل میں پاتے ہیں اس لیے یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ہم عاشق ذات ہیں ورنہ واقع میں وہ محبت مسبب ان احسانات ہی سے ہوتی ہے البتہ عشق ذات جب ہوتا کہ اگر سچ مچ بھی تمام احسانات و انعامات بند ہو جاتے حتیٰ کہ نہ باطن میں کچھ نور محسوس ہو نہ ظاہر میں کوئی راحت ہو تب بھی محبوب کی رضاء کو اپنی رضا پر مقدم کر کے اس حال میں بھی محبت میں کمی نہ آنے دے اور زبان حال و قال سے یوں کہتا رہے:

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست　　　　تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا رہنا کافی ہے)

رحمت مجسم

الغرض ہم لوگ چونکہ عاشق احسانی ہیں اس لیے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تعلق آپ کے وہ احسانات سن کر پیدا ہونے کی زیادہ توقع ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے اوپر فرمائے ہیں۔ پس اس لیے ایک وجہ تو یہ ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کرنے کی جن کا ذکر اس آیت کے اخیر میں ہے "بالمؤمنین رؤف رحیم" (ایمان داروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں) اور اس وقت اسی جزو کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے۔ دوسری وجہ اس کا اختیار کرنے کی ایک یہ بھی ہوئی کہ فضائل تو اکثر لوگ

بیان کر دیتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا ذکر لوگ بہت کم کرتے ہیں تو یہ مضمون نیا مضمون ہوگا۔ نیز اس بیان کا جو اصل محرک ہے وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بندہ پر ایک خاص عنایت اور انعام ہی ہے جس کا ذکر اجمالاً اوپر بھی آیا ہے اس لیے بھی جی چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات بیان کروں اسی واسطے اس وعظ کا نام (شکر النعمه بذکر رحمة الرحمه) رکھتا ہوں جس کے یہ معنی ہیں کہ شکر ایک نعمت کا رحمت مجسم کی صفت رحمت کے ذکر کے ذریعہ سے پس لفظ رحمت اول سے مراد معنی لغوی اور دوسری سے ہمارے حضور صلی اللہ علی وسلم ہیں کیونکہ آپ کا ایک نام مقدس رحمت بھی ہے۔

احسانات رسول اکرمؐ

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نسبت خود ارشاد فرمایا ہے: "انا رحمة مهداة" کہ میں ایک رحمت ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے آپ کو رحمت فرمایا۔ دوسرے قرآن شریف میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: "وما ارسلنک الا رحمة للعالمین" کہ ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ غرض حدیث وقرآن دونوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس مقام پر ایک شبہ بھی ہوسکتا ہے وہ یہ کہ "وما ارسلنک الا رحمة للعالمین" (ہم نے تمام جہان والوں پر آپ کو رحمت بنا کر بھیجا ہے) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم کے لیے رحمت ہونا معلوم ہوتا ہے اور "بالمؤمنين رؤف رحيم" (مسلمانوں پر بڑے شفیق اور مہربان ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں پر رحمت فرماتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ "بالمؤمنين رؤف رحيم" میں رحمت خاص مراد ہے کہ وہ مسلمانوں کے سوا کسی پر نہیں اور "وما ارسلنک الا رحمة للعالمین" میں رحمت عامہ مراد ہے رحمت عامہ کفار کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام رحمت ایک تو ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کی برکت سے ہوا کہ آپ کے نور کی شعاعوں کی برکت سے تمام عالم کا مادہ بنا۔ دوسری رحمت عامہ یہ ہے کہ یوم میثاق میں تمام جہان کو توحید کی تعلیم فرمائی۔ اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ جس وقت حق تعالیٰ

نے تمام مخلوق کو پشت آدم علیہ السلام سے ظاہر فرما کر ان سے یہ ارشاد فرمایا کہ "الست بربکم" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) تو سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی طرف تکنے لگے کہ آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی ہاں (بیشک ہمارے رب ہیں) فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب نے بلی کہا۔ تیسرے یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے آپ ہی کی برکت سے نجات پائی۔ یہ بھی تمام عالمین پر رحمت ہے کیونکہ نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں کہ ان کے بعد سلسلہ بنی آدم انہیں کی اولاد سے جاری ہوا۔ اس وقت جس قدر انسان ہیں وہ سب ان کے تین بیٹوں ہی کی نسل سے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: "وجعلنا ذریته هم الباقين" کہ ہم نے نوح علیہ السلام ہی کی اولاد کو دنیا میں باقی رکھا (باقی سب کو ہلاک کردیا)۔

تو اس وقت عام عالم گویا اپنے آباء کی پشت میں تھا اور اس کشتی کو نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہوئی تو یہ احسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام عالم پر ہے کہ آپ ہی کی برکت سے سب فناء سے محفوظ رہے۔ حیوانات موجودہ بھی انہی حیوانات کی نسل سے ہیں جو کشتی میں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نار سے نجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے ہوئی یہ بھی تمام عالم پر رحمت تھی کیونکہ انبیاء علیہم السلام بکثرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے اور اس وقت ان کی اولاد بھی بہت کثرت سے موجود ہے تو وہ ایک بڑے حصہ عالم کے یا پدر نسبی ہیں یا پدر روحانی تو اس طرح یہ فیض بھی ایک عالم کو پہنچا۔ ان دونوں واقعات کو مع دیگر برکات کے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند اشعار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا تھا وہ اشعار اس وقت مجھے یاد نہیں ہیں۔ "نشر الطیب" میں لکھے ہیں (جامع وعظ احقر ظفر عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ ان اشعار کو مع ترجمہ حضرت حکیم الامت نقل کردوں تا کہ ناظرین کے لیے زیادہ موجب لذت ہو)

نعت حضرت عباسؓ

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے مدینہ منورہ میں واپس تشریف لائے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے عرض لیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت

دیجئے کہ کچھ آپ کی مدح کروں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح خود طاعت ہے اس لیے) آپ نے ارشاد فرمایا کہ کہو اللہ تعالیٰ تمہارے منہ کو سالم رکھے۔ انہوں نے یہ اشعار آپؐ کے سامنے پڑھے:

من قبلها طبت فی الظلال وفی مستودع حیث یخصف الورق
ثم هبطت البلاد لابشر انت ولا مضغة ولا علق
بل نطفة ترکب السفین وقد الجم نسرا وّ اهلها الغرق
تنقل من صالب الیٰ رحم اذا مضی عالم بد اطبق
وردت نار الخلیل مکتتماً فی صلبه انت کیف یحترق۔
حتّٰی احتوی بیتک المهیمن من خندف علیاء تحتها النطق
و انت لما ولدت اشرق الارض وضاء ت بنورک الافق
فنحن فی ذالک الضیاء وفی النور سبل الرشاد تخترق

ترجمہ: زمین پر آنے سے پہلے آپ جنت کے سایہ میں خوش حالی (اور راحت) میں تھے اور نیز (اس) ودیعت گاہ میں تھے جہاں (جنت کے درختوں کے) پتے اوپر تلے جوڑے جاتے تھے (یعنی آپ صلب آدم علیہ السلام میں تھے) سو زمین میں آنے سے پہلے جب آدم علیہ السلام جنت کے سایوں میں تھے آپ بھی تھے اور پتوں کا جوڑنا اشارہ ہے اس قصہ کی طرف کہ جب آدم علیہ السلام نے اس منع کیے ہوئے درخت سے کھالیا اور جنت کا لباس اتر گیا تو درختوں کے پتے ملا ملا کر بدن ڈھانکتے تھے یعنی اس وقت بھی آپ ان کی پشت میں تھے (اور آپ ہی کی برکت سے آدم علیہ السلام کی یہ خطا معاف ہوگئی اور حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی) اس کے بعد آپ نے بلاد (زمین) کی طرف نزول فرمایا اس وقت آپ نہ بشر تھے نہ مضغہ نہ علقہ (کیونکہ یہ حالتیں پیدائش کے بہت قریب ہوا کرتی ہیں اور اس وقت آپ کی پیدائش قریب کہاں تھی اور یہ زمین کی طرف نزول فرمانا بواسطہ آدم علیہ السلام کے ہوا کہ جب وہ زمین پر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے ساتھ زمین پر نزول فرمایا مگر اس وقت آپ نہ بشر تھے اور نہ مضغہ نہ علقہ) بلکہ (پشت آباء

میں محض ایک مادہ مائیہ بصورت نطفہ تھے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح بصورت نطفہ تو تمام انبیاء بلکہ تمام عالم آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں کونسی فضیلت ثابت ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود دوسروں کے وجود سے ممتاز تھا کہ دوسرے تو محض بصورت نطفہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کی پشت میں بصورت نطفہ تشریف فرما ہوئے تھے اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو بھی کچھ تعلق ہوتا تھا کہ اس تعلق روحی کی برکتیں آپ کے ان اجداد میں ظاہر ہوتی تھیں۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگلے شعر میں ابراہیم علیہ السلام کے سوزش نار سے بچ جانے کی نسبت یہ بات فرمائی ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت میں تھے وہ کیونکر جل سکتے تھے تو یہ برکتیں اس تعلق روح ہی کی وجہ سے تو ظاہر ہوئیں) کبھی وہ مادہ کشتی نوح میں سوار تھا اور حالت یہ تھی کہ نسر بت اور اس کے ماننے والوں کے لبوں تک طوفان غرق پہنچ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ بواسطہ نوح علیہ السلام کے وہ مادہ راکب کشتی تھی' مولانا جامیؒ نے اسی مضمون کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

زجودش گر نگشتے راہ مفتوح   بجودی کے رسیدے کشتی نوح

حدیث تقریری

یعنی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا سے راہ کشادہ نہ ہوتا تو سلامتی کے ساتھ کوہ جودی پر نوح علیہ السلام کی کشتی کس طرح پہنچتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے وہ کشتی پار ہوگئی اور وہ مادہ (اسی طرح واسطہ در واسطہ ایک صلب سے دوسرے رحم تک منتقل ہوتا رہا جب ایک طرح کا عالم گزر جاتا تھا دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک اسی سلسلہ میں آپ نے نار خلیل علیہ السلام میں ورود فرمایا چونکہ آپ ان کی پشت میں مختفی تھے تو وہ کیسے جل سکتے تھے (پھر آگے اسی طرح آپ منتقل ہوتے رہے) یہاں تک کہ آپ کا خاندانی شرف جو کہ (آپ کی فضیلت پر) شاید ظاہر ہے اولاد خندف میں سے ایک بلند چوٹی پر جا گزیں ہوا جس کے تحت کے اور حلقے (یعنی دوسرے خاندان مثل درمیانی حلقوں کے) تھے (خندف لقب ہے آپ کے جد بعید مدرکہ بن الیاس کی والدہ کا) اور آپ جب پیدا ہوئے تو زمین

روشن ہوگئی اور آپ کے نور سے آفاق منور ہوگئے سو ہم اس ضیاء اور نور میں ہدایت کے رستوں کو قطع کر رہے ہیں (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعار پر سکوت فرمایا اس لیے حدیث تقریری سے ان مضامین کا صحیح اور رحمت ہونا ثابت ہوگیا)" انتھی ترجمة مع بعض حذف و زيادة رِوما للاختصار و الا يضاح ۱۲" (پورا ہوگیا اس کا ترجمہ مع بعض حذف کرنے اور زیادہ کرنے کے ساتھ ایضاح اور اختصار کا قصد کر کے)

رحمت عامہ

ایک رحمت عامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے وہ سخت سخت عذاب ٹل گئے جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں، کسی کا تختہ الٹ گیا، کسی پر آسمان سے پتھر برسے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے اور اس رحمت کو عام اس لیے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ اُمت اجابت میں داخل ہیں۔ ایک رحمت عامہ یہ ہے کہ آپ کی امت میں سے جو کوئی ایک نیک کام کرے اس کا ثواب کم از کم دس گناہ ضرور ملے گا اور اگر زیادہ خلوص ہو تو سات سو تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے اس کا عام ہونا اس اعتبار سے ہے کہ حدیث "اسلمت اسلفت من خير"[1] (اسلام لایا تو اپنی گزشتہ نیکیوں کے ساتھ) سے ثابت ہے کہ کافر جب مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کی گزشتہ نیکیاں بھی اس کو ملتی ہیں تو ان نیکیوں میں یہ مضاعف ہوگا تو اس طرح یہ رحمت بھی کفار کو شامل ہوئی۔ ایک عام رحمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کے اوپر وہ سخت سخت احکام نازل نہیں فرمائے جو پہلی امتوں پر تھے۔ مثلاً بعض معاصی سے توبہ کا طریقہ یہ تھا کہ مجرم اپنی جان دے دے اس کے بدون توبہ قبول نہیں ہوتی، ناپاکی کپڑے میں لگ جائے تو کپڑا کاٹ دینے کا حکم تھا، اس شریعت میں احکام نہ بہت سخت ہیں کہ عمل دشوار ہو نہ ایسے آسان کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے۔

اب یہاں یہ ایک سوال ہوسکتا ہے کہ دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہوگیا مگر آخرت میں کفار کے لیے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ کفار تو

---

[1] (مسند احمد ۳: ۴۰۲، مسند ابو عوانۃ ۱: ۷۲)

ابدالآباد کے لیے جہنم میں رہیں گے ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا اسی طرح جن مؤمنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔

اس کے جواب کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو تو اگر حاکم اس میں سے دس سال کم کردے تو یہ رحمت ہوگی یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں، ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں۔

کفار کے حق میں رحمت

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کے لیے جو کہ جہنم میں جائیں گے سفارش فرمائیں گے اگر یہ شفاعت نہ ہوتی تو ان کی میعاد اور زیادہ ہوتی تو میعاد کی کمی یہ رحمت ہوئی کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کردی جائے۔ مثلاً پانچ سو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جائے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میعاد میں کمی کردی جائے عذاب تو ان کو ابدالآباد تک ہوگا مگر بقول شیخ عبدالحق محدثؒ جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا تو ابوطالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکے گا اور اس پر بھی وہ یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ ابولہب کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزاد کردیا تھا ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو مل جاتا ہے باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت

مجھے کسی حدیث سے تو نہیں معلوم ہوئی مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی ان میں ایک شفاعت یہ بھی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام کفار کے لیے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس سخت عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کردی جائے۔ چنانچہ آپ کی برکت سے ان کے عذاب میں کمی کردی جائے گی گو کم ہونے کے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے۔ خدا محفوظ رکھے وہاں کا تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں۔

شفاعت کی دس قسمیں

چنانچہ ابوطالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا۔ آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی اور چونکہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث ہیں اس لیے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث ہی سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے اس لیے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے اور ایک ضروری بات استطرادا یاد آگئی کہ جیسا کفار کو عذاب کی کمی کا احساس نہ ہوگا اسی طرح جنتیوں کو اپنے درجہ کی کمی کا احساس نہ ہوگا حالانکہ وہاں مدارج بہت مختلف ہوں گے کوئی اعلیٰ کوئی ادنیٰ مگر ہر شخص یہی سمجھے گا کہ میرے پاس جس قدر نعمتیں ہیں اتنی کسی کے پاس نہیں ہیں اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے۔ قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے:

"لایخفف عنھم العذاب ولاھم ینظرون" (نہ ہلکا کیا جاوے گا ان سے عذاب اور وہ نہ ڈھیل دیئے جائیں گے) کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جائے گا اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے دونوں میں تعارض ہوگیا' بات یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب آخر میں ان کے لیے طے ہو جائے گا پھر اس سے کمی نہ کی جائے گی اور یہ اس لیے ارشاد فرمایا گیا تا کہ کوئی

آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلے پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے ایسی ہی جہنم کی آگ بھی ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن تیز ہوگی ہمیشہ ویسی ہی رہے گی اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اس میں کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب ان کے لیے طے ہو کر قرار پا جائے گا وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا۔ زمانہ دراز گزر جانے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی۔ واللہ اعلم تو نفی اس تخفیف کی ہے اور اگر کوئی اس تخفیف کی نفی پر یہ شبہ کرے کہ زمانہ دراز گزر جانے کے بعد اگرچہ عذاب کم نہ ہوگا مگر ان کا بدن تو سن ہو جائے گا تو ان کو عذاب محسوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بدن جب ایک کیفیت کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اس کا احساس نہیں ہوتا جیسا کہ آج کل بعض جنٹل مین انگریزوں کی تقلید سے سخت سردی میں بھی ننگے سر رہتے ہیں مجھے بڑی حیرت تھی کہ یہ لوگ ننگے سر کس طرح رہتے ہیں ان کو تکلیف ہوتی ہے پھر بدن سن ہو جاتا ہے سردی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تب سمجھ میں آیا کہ واقعی یہی ہوگا۔

انگریزوں کی تقلید

اس انگریزی تقلید پر بطور جملہ معترضہ کے ایک مضمون ذہن میں آ گیا کہ گو یہ لوگ قصد کرتے ہیں تقلید کا مگر تقلید بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دونوں کے فعل کی وجہ الگ الگ ہیں چنانچہ انگریز لوگ ننگے سر رہنے کو شوقیا اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ سخت سرد ملک کے رہنے والے ہیں ان کو ہندوستان کی سردی زیادہ نہیں ستاتی۔ علاوہ ازیں وہ لوگ غذائی بہت گرم کھاتے رہتے ہیں اس لیے وہ اگر ننگے سر رہیں تو کچھ تعجب نہیں مگر جو لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہیں ان کے لیے تو یہاں کی سردی بھی بہت کچھ ہے وہ خواہ مخواہ ان کی نقل کرتے ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ریل میں ایک جنٹل مین سوار تھے جو بوجہ کم وسعتی کے کبرون کا کوٹ پتلون پہنے ہوئے اور ساتھ میں نہ رضائی نہ چادر اور سردی کا سخت موسم ایک اسٹیشن پر کسی انگریز نے برف منگا کر پیا جنٹل مین صاحب کو بھی تقلید سوجھی آپ نے بھی

برف والے سے برف خرید کر پیا۔ انگریز لوگ تو چونکہ گرم غذاؤں کے عادی ہیں ان کو تو سردی کے موسم میں برف پینے سے تکلیف نہیں ہوتی اور وہ لوگ شراب بھی پیتے ہیں مگر جنٹل مین صاحب کی تو برف پی کر یہ حالت ہوئی کہ سر سے پیر تک لگے تھر تھر کانپنے وہ شخص بیان کرتے تھے کہ جب وہ بہت ہی کانپنے لگے تو میں نے اپنی رضائی ان کو اوڑھائی جب ذرا ان کی کانپنی بند ہوئی اس وقت ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ رضائی، کمبل وغیرہ ساتھ لینے میں یہ راحت ہے۔

اسی طرح گرمی کے زمانہ میں یہ لوگ لوٹا وغیرہ تک ساتھ رکھنے کو بدتہذیبی سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ جو کہ کالج بہاولپور میں پروفیسر ہیں بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ گرمی کے زمانہ میں میرا بہاولپور سے سفر ہوا، میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی صراحی وغیرہ بھی تھی کیونکہ سفر لمبا تھا راستہ میں پانی کہیں ملتا ہے کہیں نہیں ملتا، اسی گاڑی میں ایک جنٹل مین بھی سوار تھے۔ صراحی وغیرہ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے، میں نے کچھ جواب نہ دیا اور ایک تختہ پر لیٹ رہا، وہ صاحب بھی ایک اوپر کے تختہ پر لیٹ گئے اب ان کو پیاس لگی اور شدت کی لگی، تھوڑی دیر صبر کیا، آخر بے تاب ہو کر صراحی کی طرف دیکھنے لگے، میں نے جب دیکھا کہ ان کا پیاس سے برا حال ہے اور صراحی پر ان کی نیت ہے مگر عار کے مارے مانگتے نہیں تو میں قصداً لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ سمجھیں کہ یہ سو گیا ہے اور پانی پی لیں۔ چنانچہ جب ان کا خیال یہ ہوا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ صاحب تختہ پر سے اتر دیئے، دبے پاؤں صراحی کے پاس آئے مگر بار بار مجھے دیکھتے بھی جاتے تھے کہ یہ کہیں جاگ نہ گیا ہو، آخر کو صراحی منہ سے لگائی جب خوب پانی پی چکے اور اٹھنے لگے میں نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن میں سے کیوں پانی پیا ہے۔ اب نہ پوچھئے کہ ان کا مارے ندامت کے کیا حال ہوا، سیروں پانی ان کے اوپر پڑ گیا، پھر میں نے خوب ہی ان کی خبر لی۔

پھر ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ پروفیسر کالج بہاولپور ہیں تو بہت ہی معافی چاہی مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ سر کو تو کھلا رکھتے ہیں اور پیروں کی بہت حفاظت کرتے ہیں ہر وقت موزے چڑھے رہتے ہیں کسی وقت بھی نہیں اترتے خیر یہ لوگ پیر کی تعظیم کرتے ہیں اور ہم سر کی کہ عمامہ وغیرہ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں ہم پیر کی اتنی تعظیم نہیں کرتے نہ اس کی حفاظت

کرتے ہیں ہم کو تو موزے پہن کر اور زیادہ پریشانی ہوتی ہے اگر کبھی سخت سردی میں پہن بھی لیتے ہیں تو جہاں ذرا گرمی ہوگئی پھر بدون نکالے چین نہیں آتی اور سر کو بدون ڈھانکے ہم کو چین نہیں آتی یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ سردی یا گرمی کی جب عادت ہوجاتی ہے تو بدن سن ہوجاتا ہے تو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اگرچہ جہنم کا عذاب ہمیشہ ایک حال پر رہے مگر بدن سن ہوجانے کے بعد جب اس کا احساس نہ ہوگا تو خود بخود عذاب میں کمی ہوجائے گی تو اس تخفیف کی نفی صحیح نہ ہوئی۔ اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے قرآن میں خود ارشاد فرمایا ہے: "کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلودا غیرھا" کہ جب ان کی ایک کھال گل جائے گی تو ہم ان کو دوسری کھال پہنادیں گے تاکہ اچھی طرح ہمیشہ عذاب کا احساس پورا ہوتا رہے تو اب یہ شبہ بھی زائل ہوگیا۔ غرض بعد شفاعت جس قدر عذاب ان کے لیے طے ہوجائے گا اس میں تخفیف نہ ہوگی نہ ذاتاً نہ حساً۔

رحمت خاصہ ورحمت عامہ رسول ﷺ

پس شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق "لایخفف عنھم العذاب" (ان سے عذاب کم نہ کیا جائے گا) کے مخالف نہیں۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لیے رحمت ہیں یہاں تک کہ کفار کے لیے بھی رحمت ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ بادشمناں نظر داری

(دوستوں کو کب محروم کروگے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے) اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے:

نماند بعصیاں کسے در گرو   کہ دارو چنیں سید پیشرو

(وہ شخص گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہ رہے گا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا پیشوا اور سردار رکھتا ہو) اور

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا   من العنایۃ رکنا غیر منھدم

(مسلمانو! ہمارے لیے خوشخبری ہے کہ عنایت ربانی سے ایک ایسا مضبوط رکن جو منہدم ہونے والا نہیں ہے)

اس تمام تقریر سے "رحمة للعالمین اور بالمؤمنین رؤف رحیم" میں شبہ تعارض مرتفع ہوگیا۔ پس رحمة للعالمین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا ذکر ہے اور بالمؤمنین رؤف رحیم میں رحمت خاصہ کا جو مؤمنین کے ساتھ خاص ہے جس کا ثمرہ ہے رضاء حق وقرب حق ونجات ابدی کہ یہ صرف مسلمانوں کے لیے ہے کفار کو اس سے حصہ نہیں ملے گا۔ اے صاحبو! اس تقریب سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپ کو ہم نا کاروں سے کتنی محبت ہے تو اب تو طبعاً بھی آپ سے محبت کرنا لازم بلکہ آپ کے احسانات کا تو مقتضا یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آپ لوگوں سے محبت نہ ہوتی۔ تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے ذمہ فرض تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو محسن ہیں سو محسن کے ذمہ محسن الیہ کی محبت ضرور نہیں ہوا کرتی لیکن محسن الیہ کے ذمہ محسن کی محبت بوجہ اس کے احسان کے ضروری ہوتی ہے مگر باایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے اس قدر محبت ہے کہ آپ لوگوں کو اس قدر نہیں بلکہ ہماری محبت جس قدر بھی ہے یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت کا پرتو ہے اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے محبت ہوئی پھر آپ کی کشش سے ہم کو آپ کے ساتھ محبت ہوئی۔ چنانچہ مشہور مقولہ ہے:

عشق اول در دل معشوق پیدا مے شود

(عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے)

اگر از جانب معشوق نباشد کشتے ۔۔۔ طلب عاشق بیچارہ بجائے نہ رسد

(اگر معشوق کی جانب کچھ کشش نہ ہو تو بیچارہ کی طلب کمال کو نہیں پہنچ سکتی)

اور راز اس کا یہ ہے کہ محبت ہوتی ہے معرفت سے اور ہم کو آپ کی معرفت کامل نہیں اور آپ کو ہماری معرفت کامل ہے ہم نے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کمالات مجملاً سن لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگئی مگر ان کمالات کی کنہ وحقیقت نہیں سمجھتے۔

وکیف یدرک فی الدنیا حقیقته ۔۔۔ قوم نیام تسلوا عنه بالحلم

یعنی وہ لوگ آپ کی کنہ حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں جو کہ خواب ہی میں زیارت سے مشرف ہونے کو تسلی کے لیے کافی سمجھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کی کنہ و حقیقت نہ سمجھنے کا راز یہ ہے کہ کمالات حقیقت میں وجدانی ہیں اور وجدانی ادراک وجدان ہی سے ہوتا ہے اور وجدان کا حصول موقوف ہے اتصاف بالوجدانی پر۔ پس ادراک کمالات نبوت کا متصف بالنبوت ہی کو ہوسکتا ہے اور ہم میں نہیں۔ اس لیے ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاملہ حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ جن مقامات کو ہم نے دیکھا بھی نہیں ہم ان کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح حاصل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری کنہ حقیقت معلوم ہے اس لیے جتنی محبت ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہے اور اس تقریر سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی ہوگی کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت غیر نبی کو نہیں ہوسکتی اس لیے ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام میں موازنہ کرنا بھی رائے سے جائز نہیں کیونکہ جب ہم کو مقامات انبیاء علیہم السلام کی معرفت نہیں تو ہم ان کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہم سے اس میں غلطی کا واقع ہونا بعید نہیں۔

شیخ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ امت میں بہت بڑے صاحب کشف ہیں اور کشف میں ان کا بڑا پایہ ہے مگر پھر بھی انہوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مقامات انبیاء علیہم السلام میں گفتگو کرنا نہ چاہیے کیونکہ غیر نبی کو نبی کے مقامات کا علم نہیں ہوسکتا. مثلاً آپ کا خوف وخشیت انبیاء علیہم السلام کے خوف وخشیت کے ساتھ محض لفظی مناسبت رکھتا ہے باقی دونوں کی حقیقت یوں تعبید ہے وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے۔ غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ہم کو کماحقہ حاصل نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری معرفت پوری طرح ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی محبت ہمارے ساتھ زیادہ ہوئی یہ تو دلیل کلی سے اثبات تھا اس کے علاوہ واقعات بھی شاہد ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ لیجئے اور بتلایئے آپ نے کتنی راتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں بیدار رہ کر گزاری ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کی سفارش کے لیے ایک ایک آیت میں صبح کردی۔ چنانچہ آپ ایک

مرتبہ رات کو تہجد میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے "ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم" (اگر آپ ان کو عذاب دیں آپ کے بندے ہیں اگر آپ ان کو بخش دیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں) تو امت کو یاد کر کے بار بار اسی آیت کو دہراتے رہے یہاں تک صبح ہوگئی۔ اللہ اکبر اُمت کا کس قدر خیال تھا۔ بتلایئے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کو یاد کر کے کتنے فاقے کیے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فقط آپ کی خاطر فاقہ سے گزار دی شاید کوئی یہ کہے کہ ہماری خاطر کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روپیہ پیسہ ملتا ہی نہ ہوگا جو آپ نے فاقہ سے زندگی بسر کی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ آپ کو ملتا نہ تھا حق تعالیٰ شانہ کے حکم سے ملائکہ نے حاضر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے لیے پہاڑوں کو سونا بنا دیا جائے اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز پیٹ بھر کر کھایا کروں تو آپ کا شکر یہ ادا کروں دوسرے روز بھوکا رہوں تو صبر کروں تو یہ فاقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اختیار فرمایا یہ نہ تھا کہ آپ کو دنیا نہ مل سکتی تھی اب رہی یہ بات کہ باوجود ملنے کے کیوں نہ لی سو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ دنیا کی کثرت سے کچھ آپ کو باطنی ضرر پہنچتا جس کی وجہ سے آپ نے فاقہ اختیار کیا۔ دنیا مردار آپ کے دل کو کیا مشغول کر سکتی تھی۔ جب آپ کے غلامان غلام ایسے ہوئے ہیں کہ ان کے دل کو باوجود کثرت مال کے اس سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہوا۔ نیز انبیاء علیہم السلام میں بعض نے سلطنت کی خواہش کی تھی تو کیا معاذ اللہ انہوں نے ایک مضر چیز کی درخواست کی تھی ہرگز نہیں' انبیاء علیہم السلام کے دل میں دنیا کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہو سکتی تو پھر اگر آپ کے پاس مال و دولت بکثرت بھی جمع رہتا تب بھی آپ کو اس سے کچھ ضرر نہ تھا مگر پھر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاقہ کشی کو اختیار فرمایا تو اس کی کیا وجہ تھی صرف امت کا خیال کہ اگر میں ذرا بھی دنیا کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا تو میری امت اس کو بھی سنت سمجھے گی اور میری سنت سمجھ کر مال و دولت جمع کرنے کی طرف جھک جائے گی' میرے واسطے تو اگرچہ مال و دولت مضر نہیں

ہو سکتا مگر اُمت کو اس سے ضرر پہنچے گا تو محض ہماری خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فاقہ کی تکلیف برداشت کی۔ حتیٰ کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین برتن پیش کیے گئے ایک شہد کا ایک شراب کا ایک دودھ کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا یہ بھی اُمت کے حال پر رحمت تھی۔ حالانکہ اگر آپ شراب کو اختیار فرما لیتے تو چونکہ وہ دنیا کی شراب نہ تھی جنت کی شراب تھی حلال اور پاکیزہ تھی کچھ آپ کا ضرر نہ ہوتا' نہ آپ کو گناہ ہوتا۔ اسی طرح اگر شہد کو لے لیتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر ذرا بھی لذات کی طرف میلان فرماتے تو اُمت کو اس سے حصہ ملتا اور اُمت کے لیے وہ میلان مضر ہوتا اسی لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے خوش ہو کر عرض کیا "اخترت الفطرة ولو اخذت الخمر لغوت امتک" یعنی آپ نے دین کو اختیار فرمایا اور اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ عالم برزخ میں دودھ دین کی صورت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خواب میں دودھ پیتے ہوئے یا پلاتے ہوئے دیکھے تو اس کی تعبیر دین ہو گی جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعبیر اپنے اس خواب کی ارشاد فرمائی جس میں خود دودھ نوش فرما کر بچا ہوا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمانا دیکھا تھا۔ اس کی مناسبت سے اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔

میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع ہے جس میں لوگوں کو چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے میرے سامنے بھی پیش ہوئی تو میں نے انکار کر دیا' میں نے نہیں پی' جب میں بیدار ہوا تو تعبیر خود بخود دل میں یہ آئی کہ جس طرح دودھ کے معنی عالم میں دین کے ہیں چھاچھ کی تعبیر صورت دین ہے جس میں معنی نہیں سو یہ مجمع بھی عمل بالحدیث کا مدعی ہے۔ گویا اس خواب میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں دین کی صورت ہی صورت ہے' روح دین کی نہیں ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شب معراج میں دودھ کو اختیار فرمایا اس کی برکت یہ ہوئی کہ اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا خیال بہت ہے۔ کاملین کے سامنے ناقصین چاہے کیسے ہی معلوم ہوتے ہوں مگر مجموعی طور پر اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیگر اقوام یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دین کے اہتمام میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اُمت محمدیہ

(صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناقص بھی یہود ونصاریٰ کے مقابلہ میں دینداری میں کامل ہیں۔ سو دیکھا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کی کیا کیا رعایتیں اور ان پر کیا کیا عنایتیں فرمائی ہیں۔ اللہ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت اور یہ محبت دیکھ کر تو ہم کو بدرجہ اولیٰ عاشق اور جان نثار ہو جانا چاہیے اور یوں کہنا چاہیے:

گر بر سر و چشم من نشینی ناز بکشم کہ نازنینی

(اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اُٹھاؤں اس لیے کہ تو نازنین ہے)

بلکہ اگر آپ قتل بھی کرنا چاہیں تو زبان قال وحال سے یہ کہنا چاہیے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ ان پر آپ کا خنجر چلے)

اور ہم تو کیسے محبت نہ کریں آپ کی تو محبوبیت میں یہ شان ہے کہ جانوروں تک نے آپ کو سجدہ کیا ہے اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی تو سو اونٹ نحر فرمائے تھے ایسے غریب بھی کہیں نہ دیکھے ہوں گے بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو بہت کچھ دیا تھا مگر آپ جمع نہیں فرماتے تھے آپ کا فقر اختیاری تھا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں سو اونٹ نحر فرمائے تھے۔ نحر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک پیر اونٹ کا ران سے ملا کر تسمہ سے باندھ دیا جاتا ہے اور اونٹ تین پیروں پر کھڑا رہتا ہے پھر گلے کے نیچے جو گڑھا ہے اس میں برچھا مارا جاتا ہے۔ اونٹ کو اس طرح ذبح کیا جاتا ہے اس کا ذبح اسی طرح آسان ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سو میں سے تریسٹھ اونٹ خاص اپنے دست مبارک سے ذبح کیے تھے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ بہت ہی قوی ہاتھ تھا جو تریسٹھ اونٹ کھڑے کھڑے ذبح کر دیئے۔ غرض احادیث میں یہ قصہ مذکور ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ نحر فرمائے ہیں تو ہر اونٹ آہستہ آہستہ باوجود پیر بندھا ہوا ہونے کے آپ کی طرف بڑھتا تھا یعنی پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ حدیث میں یہ لفظ ہیں "کلھن یزد لفن الیہ" (ہر ایک ان میں سے آپ کی طرف بڑھتا تھا) بالکل اس شعر کا مصداق تھا۔

ہمہ آہوان صحرا سرِ خود نہادہ بر کف ۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد
(صحرا کے تمام ہرنوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید میں کہ کسی دن شکار کو آئے گا)

پس ہم پر عقلاً نقلاً ہر طرح فرض ہوا کہ آپ سے محبت کریں اور محبت کا مقتضا ہے کثرت ذکر اور اس ذکر کی ایک بہت اچھی اور مقبول اور محبوب فرد دُرود شریف ہے خصوص جبکہ اس میں بھی ہمارا ہی نفع زیادہ مقصود ہو اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دُرود شریف کی فضیلت بتلائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اُمت کو بہت کچھ برکات و درجات عالیہ و ثواب عطا ہوں۔ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ دُرود تعلیم فرمانے کا نفع تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہوتا ہے کہ اُمت آپ کے لیے دعا کرتی ہے امت کو کیا نفع سو یہ شبہ غلط ہے کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک آقا ہے اس کے ایک لڑکا ہے جس کی وہ بہت چاہتا ہے وہ لڑکا اپنے باپ کے نوکر سے کہتا ہے کہ ابا جان سے کہہ دو کہ آج عید ہے ہم کو ایک روپیہ دے دیں۔ وہ لڑکا جانتا ہے کہ باپ کو خود میرا خیال ہے وہ عیدی کا روپیہ خود ہی دیتے مگر پھر جو نوکر کے ذریعہ سے کہلواتا ہے اس میں اس کا خود کوئی نفع نہیں بلکہ اس وساطت سے وہ نوکر آقا کی نظر میں بلند مرتبہ ہو جائے گا کہ یہ ہمارے بیٹے سے محبت کرتا ہے۔ اب اگر وہ نوکر بیوقوف یہ سمجھنے لگے کہ میں بیٹے سے بھی بڑھا ہوا ہوں کہ میں نے اس کو روپیہ دلوایا ورنہ اس کو نہ ملتا۔ یہ اس کی حماقت ہوگی یا نہیں بلکہ اس کو تو اس وساطت سے خود ایک شرف حاصل ہو گیا۔ بیٹے کو تو روپیہ ملتا ہی۔ بلاتشبیہ اسی طرح اس جگہ سمجھئے کہ آپ کے دُرود پڑھنے سے جو درجات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوں گے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ آپ کی ضرورت نہیں وہ درجات تو حق تعالیٰ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرماتے ہیں البتہ یہ رحمت ہے کہ ہم کو اس وساطت سے مشرف فرما دیا کہ اس واسطہ سے ہم کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے قرب حاصل ہو جاتا ہے اور میرے پاس اس دعوے کی کہ ان مراتب کا عطا فرمانا تو حق تعالیٰ کو منظور ہی تھا دلیل موجود ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے جس آیت میں ہم کو دُرود شریف کا امر فرمایا ہے۔

صیغہ تجدد

اس میں امر سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہے: "ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی"
(حق تعالیٰ اور ملائکہ علیہم السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) "یصلون علی النبیّ"
(نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) صیغہ تجدد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ
ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں چاہے کوئی درود بھیجے یا نہ بھیجے اور
ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کس کا درود ہو سکتا ہے اور حق تعالیٰ ہمیشہ درود نازل فرماتے
رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو درجات عالیہ عطا ہونے والے ہیں وہ تو حق تعالیٰ خود ہی
حضور صلی اللہ کو ضرور ہی عطا فرمائیں گے اگر تم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درود پڑھو گے
تو اس سے تم کو بھی نفع ہوگا باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں اور درود
شریف میں علاوہ اس کے کہ وہ ایک ذکر ہے جو مقتضا محبت کا ہے اور بھی فضائل ہیں۔

فضائل درود شریف

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: "من صلی علی واحدا صلی اللہ علیہ عشرا"[۱] جو
میرے اوپر ایک بار درود بھیجے گا حق تعالیٰ اس پر دس بار درود بھیجیں گے۔ ایک فائدہ درود میں
بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کے دوسرے طرق کے یہ ہے کہ ذکر بسیط ہے
اور ذکر بسیط متفرق اذکار سے زیادہ سہل و دلچسپ ہوتا ہے۔ پھر اس میں ایک خصوصیت یہ ہے
کہ اس میں ذکر اللہ بھی ہے اور ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیونکہ درود شریف میں اللہ
کا نام بھی ضرور ہوتا ہے تو خلوت میں اس سے زیادہ دلچسپ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
کوئی طریقہ نہیں۔ البتہ جلوت میں اگر مجمع مشتاق ہو تو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات
اخلاق وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا جائے یہ ذکر ولادت سے بھی افضل ہے کیونکہ ولادت بھی تو اسی
کے واسطے ہوئی تھی یہ کمالات مقصود بالولادت ہیں ان کا ذکر اس کے ذکر سے افضل ہوگا۔
درود کی اور فضیلت بھی آئی ہے چنانچہ ایک صحابی نے چند اوراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
سامنے پیش کیے کہ میں چند وظائف پڑھتا ہوں جن میں درود شریف ربع کے قریب ہے

---

[۱] (الصحیح لمسلم، الصلوٰۃ: ۷۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۹۱۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لو زدت لکان خیراً لک" (اگر اس سے زیادہ کرتا تو تیرے لیے یہ بہتر تھا) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف کے قریب درود شریف پڑھا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی فرمایا کہ اگر اور بڑھاؤ گے تو بہتر ہوگا۔ یہاں تک کہ انہوں نے عرض کیا کہ میں سارا وظیفہ درود شریف ہی کا رکھوں گا اور کچھ نہ پڑھوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اذا یلفی همک ویغفر ذنبک" کہ اگر ایسا کرو گے تو تمہارا تمام فکر دور ہو جائے گا اور گناہ بخش دیے جائیں گے۔

ارشاد حضرت ذوالنون مصریؒ

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسا ہی کریں کہ تمام اوراد چھوڑ کر درود شریف ہی کا وظیفہ اختیار کر لیں اس کے بارے میں ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ بہت عمدہ ہے ان سے پوچھا گیا کہ استغفار افضل ہے یا درود شریف انہوں نے فرمایا کہ اُجلے کپڑوں میں تو عطر اچھا ہوا کرتا ہے اور میلے کپڑوں میں صابن غرض ہر ایک کی حالت کا جدا مقتضا ہے اس لیے کوئی یہ نہ کرے کہ تمام اوراد چھوڑ دے اور صرف درود شریف کو اختیار کر لے یہ اپنے شیخ سے پوچھ کر کرنا چاہیے۔

زیارت روضۂ اقدس کی فضیلت

ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو خصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضۂ اطہر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برکات حاصل کر لیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت حیات کے برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں۔ حدیث میں ارشاد موجود ہے: "من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی"[1] جس شخص نے میرے مرنے کے بعد زیارت میری قبر کی کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔
اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود بھی قابل توجہ ہے اگر آپ کا تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی کیونکہ اس

---

۱ (کنز العمال: ۲: ۱۲۳۷۲، الترغیب والترہیب ۲: ۲۲۴)

وقت تبلیغ کہاں ہے۔افسوس کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کی فضیلت کونہیں مانتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجواز کے قائل ہیں۔

کان پور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا۔جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی۔"من حج ولم یزرنی فقد جفانی"[1] (جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا) فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا بھی نہیں نہ اس کو جواب معلوم تھا وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا۔خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی آگے یہ حدیث تھی کہ "من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی"[2] (جس نے میرے مرنے کے بعد زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی) جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا لیجئے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب منجانب اللہ ہو گیا' بس خاموش رہ گئے بعضے لوگ زیارت قبر شریف پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں یہ عجب لغو اشکال ہے۔میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لیے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہؓ نابینا تھے۔عبداللہ بن ام مکتوم صحابیؓ ہیں یا نہیں؟ مستورات کے بارے میں کیا کہو گے جس طرح صحابیت کے لیے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا' یعنی ایسی جگہ پہنچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہو تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے ایک قول کا مفہوم

تیسرا شبہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالک کا قول ہے

---

[1] (الدر المنثور ۱: ۲۳۷' کشف الخفاء ۲: ۳۳۸)
[2] (کنز العمال: ۱۲۳۷۲' الترغیب والترھیب ۲: ۲۲۴)

"یکرہ قول الرجل زرت قبر النبی علیہ السلام" (یعنی امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی تو جب زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعل زیارت تو کیسے مکروہ نہ ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ امام مالک کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو ورنہ ان کو اس قدر پھیر پھار کی کیا ضرورت تھی وہ صاف یہی نہ فرماتے کہ "یکرہ زیارۃ قبر النبی علیہ السلام" (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت مکروہ ہے) یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لیے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ غرض دنیا میں ایسے بھی خشک مذاق موجود ہیں جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا اس کو حرام کر کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں مگر جو زیارت کر چکے ہیں ان سے پوچھو کہ کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔

حکایت حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی

بس اب بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔ سید احمد رفائی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے عرض کیا "السلام علیک یا جدی" (دادا صاحب السلام علیک) جواب ہوا "وعلیک السلام یا ولدی" (بیٹا! وعلیک السلام) اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے:

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلھا   تقبل الارض عنی وھی نائبتی

فھذہ دولۃ الاشباح قد حضرت   فامدد یمینک کی تحظی بھاشفتی

(یعنی دوری میں تو روح کو قدم بوسی کے لیے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تاکہ میں اس کو بوسہ دوں)

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے روبرو آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا انہوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے۔

ایک بزرگ سے جو کہ اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا۔ فرمایا ہم تو کیا تھے اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ تتمہ قصہ کا یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ مجھ کو نظر قبول سے دیکھ رہے ہیں آپ اٹھ کر ایک دروازہ میں جا پڑے اور حاضرین کو قسم دے کر کہا کہ سب میرے اوپر سے گزریں۔ چنانچہ عوام تو گزرنے لگے اور اہل بصیرت دوسرے راستہ سے نکلے سبحان اللہ کیا نوازش ہے۔

رؤف رّحیم کا معنی

اب اس بیان کو ایک نکتہ پر ختم کرتا ہوں کہ اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے رؤف رحیم دو لفظ ارشاد فرمائے اس میں کیا نکتہ ہے مجھ کو اس وقت لغت سے رجوع کرنے کا موقعہ نہیں ملا کیونکہ وعظ کا ہونا جمعہ کی نماز کے لیے آتے ہوئے راستہ ہی میں طے ہوا پہلے سے خیال ہوتا تو میں کتب لغت دیکھ کر آتا مگر جو بات اس وقت ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ رؤف کا مصدر ہے رافت جس کے معنی ہیں شدت رحمت اور شدت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفاً ہے اور رحیم میں بھی مبالغہ ہے اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں مبالغہ ہو۔ کماً پس مجموعہ حاصل یہ ہوا کہ آپ کی رحمت کیفاً بھی زیادہ ہے اور کماً بھی۔ اب دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ شانہ ہم کو ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی توفیق دیں اور آپ کی محبت و اطاعت و تعظیم ہی میں وفات دیں اور قیامت میں آپ کا قرب نصیب ہو۔ آمین۔

التماس جامع

اس وعظ کے جلد صاف کر دینے کا اکثر احباب کو بہت تقاضا تھا اور واقعی یہ انمول جواہر جو اس وعظ میں ہیں ایسے ہی اشتیاق کے قابل ہیں مگر کیا کہوں تعلیم کی مشغولی کی وجہ سے بہت دیر ہوگئی تاہم بحمد اللہ بہت جلد صاف ہوگیا۔ احباب سے تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں اور اللہ واسطے درخواست کرتا ہوں کہ جو صاحب اس سے منتفع ہوں میرے واسطے بھی دعائے خیر فرمائیں کہ حق تعالیٰ اپنی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کامل اور

اتباع کامل عطا فرمائیں اور بیت اللہ و بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بعافیت تامہ ظاہریہ و باطنیہ نصیب ہو۔ آمین

یا رب العالمین وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا و مولانا محمّد وعلىٰ اله واصحابه وامته عدد خلقه ورضى نفسه ومداد كلماته صلوٰة لاغاية لها ولا انتها ولا امدلها ولا انقضاء صلوٰة تدوم بدوامک و تبقى ببقائک صلوٰة ترضيک و ترضيه وترضىٰ بها عنا يارب العالمين. آمين

الحبور لنور الصدور

نوٹ: اس وعظ کا لقب رأس الربیعین ہے۔
جامع مسجد تھانہ بھون میں ۳۰ ربیع الاول ۱۳۳۴ ہجری کو بیٹھ کر ۲ گھنٹہ ۴۰
منٹ تک بیان فرمایا۔ ماہ ربیع الاول و ربیع الثانی کے موضوع پر یہ وعظ ایک سو
افراد نے سنا جبکہ مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ۔ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

ویوم تقوم الساعة یومئذٍ یتفرقون فاما الذین امنوا وعملوا الصلحت فھم فی روضة یحبرون و اما الذین کفروا و کذبوا بایتنا ولقاء الاخرة فاولئک فی العذاب محضرون۔ (الروم آیت نمبر ۱۴ تا ۱۶)

ترجمہ: ”جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کیے تھے وہ تو باغ میں مسرور ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔“

یہ آیتیں جو میں نے پڑھی ہیں ان میں الفاظ کا مدلول تو صرف اعمال صالحہ وعقائد صالحہ کا ثمرہ ثواب جنت ہونا اور اعمال غیر صالحہ وعقائد باطلہ کا ثمرہ عذاب جہنم ہونا ہے اور عجب نہیں کہ سننے والے اس ظاہری مدلول سے یہی سمجھے بھی ہوں گے کہ اس وقت مقصود اعمال صالحہ کی ترغیب اور اعمال غیر صالحہ سے ترہیب کا بیان کرنا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے مگر مجھے اس وقت اس پر اکتفا کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور دوسری باتیں اور بعضے خاص مسائل بھی بیان کرنا مدنظر ہیں جن کی وجہ خصوصیت ایام ہے۔

یہ بات اکثر احباب کو معلوم ہے کہ ان ہی ایام ربیع الاول میں کبھی تو ربیع الاول سے پہلے اور کبھی خاص اسی مہینے میں چند سالوں سے میرا یہ معمول ہو گیا ہے کہ ان اعمال وعقائد کی بابت کچھ بیان کیا کرتا ہوں جو ان ایام میں اکثر لوگ آج کل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد میں چند وعظ النور الظہور وغیرہ شائع بھی ہو چکے ہیں۔ پارسال بھی ایک مضمون السرور کے نام سے بیان ہوا تھا۔ اس وقت آئندہ سال کے لیے یہ نیت تھی کہ اس مضمون کو بعنوان دیگر بیان کر دیا جاوے گا مگر بزرگوں کا مقولہ ہے: "عرفت ربی بفسخ العزائم" (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) یہ نیت بعد میں بدل گئی چونکہ مضامین جدیدہ ذہن میں تھے نہیں اور اعادہ کو جی نہ چاہا اس لیے ارادہ امسال فسخ ہو چکا تھا۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے کو بھی آ گیا اور اب تک اسی لیے کہ مضمون جدید ذہن میں نہ تھا کوئی بیان ان امور مروجہ کے متعلق نہیں ہوا مگر حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اس ارادہ کا پھر حشر ہوا چونکہ وہ ارادہ پہلے موجود ہوا تھا پھر فنا ہو گیا پھر اب موجود ہے اسی لیے یہ گویا اس کا حشر ہوا حشر کے معنے ہیں' مردہ کا زندہ ہو جانا۔ یہ مضمون اگرچہ پہلے ہفتہ میں ذہن میں آ چکا تھا مگر اس وقت ایک دوسرے مضمون کو مقدم کرنا مناسب معلوم ہوا وہ یہ کہ اس وقت قحط سالی کی عام طور پر شکایت ہو رہی ہے تو اس میں بتلایا گیا تھا کہ اس کا اصلی سبب کیا ہے پھر یہ خیال ہوا کہ جس طرح اس ارض ظاہری کی حیات کا سبب بیان کیا گیا ہے تو ارض باطنی جو کہ قلب ہے اس کی حیات کا طریقہ اور راز بھی کیوں نہ بیان کیا جائے۔ ان دونوں مضامین کو پہلے ہفتہ میں الگ الگ بیان کر کے مجموعہ کا نام اساس الربیعین رکھ دیا گیا اور چونکہ وہ دونوں مضامین مستقل مستقل تھے اس لیے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ لقب حیات الجدوب وحیات القلوب بھی مقرر کر دیا۔ لفظ جدوب کے معنے میں نے لغت میں تلاش کیے تو جدب کی جمع معلوم ہوئی جس کے معنے قحط کے ہیں۔ جیسے قلوب قلب کی جمع ہے اب چونکہ وہ مضمون جس کا مقدم کرنا مناسب تھا بیان ہو چکا تو اس ہفتہ میں اس معمول کو پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا کیونکہ مانع بھی مرتفع ہو گیا اس لیے اس سال بھی اس معمول کو پورا کیا گیا اور اس کا نام پارسال ہی ذہن میں الحبور آ چکا تھا۔

حضورؐ کی بعثت کی اصل غایت ایمان اور اعمال صالحہ

اس میں یہ بیان کیا جاوے گا کہ ایمان اور اعمال صالحہ آپ کی بعثت کی اصل غایت ہے جس کا ثمرہ جنت کی راحت ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قابل فرح دراصل اس لیے ہے کہ آپ کی بدولت اعمال صالحہ اور ایمان کی نعمت ہم کو نصیب ہوئی یہ مضمون تو گزشتہ مضامین کی مانند ہے جو آیت کے دو جملوں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ اگرچہ اس کی تفصیل بہت کچھ کی جا سکتی ہے مگر اس وقت کا بیان زیادہ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ ایک دوسرا مضمون بھی ذہن میں آ گیا جو زیادہ تر اس وعظ میں مذکور ہوگا اور پہلا مضمون بقدر ضرورت واختصار ذکر ہوگا۔ زیادہ حصہ دوسرے ہی مضمون کا ہوگا اور وہ مضمون ہر سال ذہن میں آتا تھا مگر بیان سے رہ رہ جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ بعد وقت گزر جانے کے اس کا خیال آتا تھا اب بھی وہ مضمون وقت کے بعد ہی ذہن میں آیا کیونکہ مہینہ بالکل قریب ختم آ گیا ہے اور اس ضرورت کا موقع اوائل ماہ ہے مگر اس سال پھر بھی اس کو بیان کرنا ضروری معلوم ہوا تاکہ رہ نہ جاوے اور آئندہ ایسے ہی موقع پر کام آوے اور وہ مضمون تبرکات کا ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اس لیے تعلق ظاہر ہے کہ آپ تمام تبرکات کے سردار اور سب کی اصل ہیں اور اسی لیے اس وقت صرف ان ہی تبرکات کا بیان نہ ہوگا جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تعلق ہے بلکہ عموماً تمام تبرکات کے متعلق بیان کیا جاوے گا خواہ وہ تبرکات انبیاء کے ہوں یا تبرکات اولیاء کے۔ خصوصیت وقت و مقام یہ ہے کہ ہمارے قصبہ کے قریب ایک تبرک بھی موجود ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جبہ کا بیان

اور وہ جبہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی سند مثل احادیث کے تو متصل نہیں مگر ہمارے بزرگوں نے اس کا انکار نہیں کیا اور جی کو بھی یہ بات لگتی ہے کہ وہ صحیح ہے اور اس کی زیارت اسی ماہ ربیع الاول میں ہوتی ہے اس لیے اس ماہ سے بھی اس مضمون کو تعلق ہے مگر چونکہ ہم لوگ عرس وغیرہ کرتے نہیں اس لیے مثل اہل عرس کے کبھی وقت پر یہ مضمون خیال میں نہ آیا

کیونکہ آج کل ایک جماعت درویشوں کی ہے جو صرف عرسوں ہی میں شریک ہونے کے لیے پیدا ہوئے ہیں جس وقت دیکھئے ان کا بستر کسی نہ کسی عرس کے لیے بندھا رہتا ہے اور یہ ان کے نزدیک بڑا سرمایہ آخرت ہے۔ یہ اللہ کے بندے گھبراتے بھی تو نہیں نہ معلوم روز کے روز ان سے سفر کس طرح ہوتا ہے ہمیں تو ذرا سے دور کے سفر سے بھی پریشانی ہوتی ہے۔ اب یا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ وہ لوگ بڑے باہمت ہیں اور ہم لوگ کم ہمت ہیں یا یہ کہ وہ لوگ نکمے ہیں اور ہم لوگ کام کے ہیں خیر وہ اپنے آپ کو باہمت سمجھتے رہیں اور ہم لوگ اپنے کو باکار سمجھتے رہیں۔ غرض ایسے لوگوں کو عرسوں کی تاریخیں خوب یاد رہتی ہیں مگر ہم لوگوں کو اس واسطے یاد نہیں رہتیں کہ اس کا ہمارے یہاں کسی قسم کا چرچا نہیں ہوتا۔ نیز زیادہ چرچا ان باتوں کا بچوں سے بھی ہوا کرتا ہے۔ ہمارے یہاں ان باتوں کے لیے مدرسہ میں بچوں کو تعطیل ہی نہیں ہوتی اور نہ طلبہ کو اس میں شریک ہونے کی اجازت ہے بلکہ سخت ممانعت ہے ان وجوہ سے اس مرتبہ بھی یہ مضمون وقت پر ذہن میں نہیں آیا بلکہ اس وقت اس کا خیال آیا مگر احکام شرعیہ کے لیے وقت ہی کیا جب یاد آ جاوے وہی وقت ہے اور چونکہ یہ مضمون اخیر وقت میں ذہن میں آیا اس لیے ایک دوسرا مضمون بھی اس کے ساتھ بیان کرنا مناسب ہو گیا۔ یہ دن چونکہ ربیع الاول و ربیع الثانی کے وسط میں ہے کہ یا تو آج ربیع الاول کی ۳۰ تاریخ ہے یا ربیع الثانی کی پہلی ہے اس لیے ربیع الثانی کے متعلق گیارہویں کا مضمون بھی ذہن میں آ گیا۔

تو اب اس وعظ کے بھی دو جزو ہو جائیں گے۔ ایک جزو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کے متعلق جو کہ اصل ہے دوسرا گیارہویں اور تبرکات کے متعلق یہ سب مضامین الگ الگ بیان کروں گا ہر چند کہ ان تینوں جزووں کے متعلق جو مضامین ہیں اس کے لیے ایک حدیث ذہن میں ہے جس کا تعلق اس مضمون سے بے تکلف واضح طور پر ہے اور سارا بیان قریب قریب اسی حدیث پر متفرع ہوگا چونکہ آیت شریفہ اول ذہن میں آ چکی تھی اس لیے اس کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا نیز وہ حدیث اس آیت کی شرح ہے اس لیے آیت کو حدیث کی اصل قرار دیا گیا اور حدیث کو تمام وعظ کی اصل پس حدیث آیت پر متفرع ہے اور وعظ حدیث کی فرع ہے اس طرح اس بیان کو حدیث اور آیت دونوں سے تعلق ہوگا۔ اول

آپ آیت کا مطلب سنئے حق تعالیٰ شانہ اس مقام پر قیامت کا ذکر فرما رہے ہیں۔

"یوم تقوم الساعة یبلس المجرمون ولم یکن لهم من شرکائهم شفعاء وکانوا بشرکائهم کفرین ویوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون"

جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم ناامید ہوں گے۔ پھر ایک آیت کے بعد "یوم تقوم الساعة" کا اعادہ فرماتے ہیں "ویوم تقوم الساعة یومئذ یتفرقون" جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے اس لفظ کے اعادہ میں نکتہ زیادت تہویل ہے۔ چنانچہ اردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر اسی طرح کلام کیا جاتا ہے کہ فلاح روز یوں واقعہ ہوا اس روز اس طرح حادثہ پیش آیا' اس روز کے لفظ کو بار بار اعادہ کرتے ہیں۔ نیز اس طرز کلام سے حق تعالیٰ شانہ کی رحمت صاف صاف ٹپکتی ہے کہ جس روز کے ساتھ قیامت کے متعلق کفار کا حال ابلاس بیان فرمایا عین اسی بیان ابلاس میں جو کہ ظاہراً اس کے مقابل کی طرف توجہ کے ضعف کا سبب متوہم ہوتا تھا اسی روز کے ساتھ مؤمنوں کی حالت بھی بیان فرمائی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت سے لوگ رحمت خداوندی سے مایوس ہو جاتے کیونکہ جن کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام کا فہم اور اثر عطا فرمایا ہے جب وہ نہایت بلاغت وفصاحت اور شدومد کے ساتھ یہ مضامین وعید و تہدید کے کفار کی بابت سنتے تو ان پر غلبہ خوف کی وجہ سے وہی حالت طاری ہو جاتی جو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کے اثر میں بیان فرمائی ہے۔ "لوانزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته خاشعاً متصدعاً من خشیة الله" کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو اللہ کے خوف سے پست اور پھٹنے والا دیکھتے اگر قرآن میں وعید کے ساتھ ساتھ بشارت نہ ہوتی تو بہت سے قلوب مارے خوف کے شکستہ ہو جاتے سو اس طرز سے حق تعالیٰ شانہ نے یہ ظاہر فرما دیا کہ ہم کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو کہ غصہ کے وقت رحمت نہ ہو سکے۔ جیسا کہ انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غصہ کے وقت اگر کوئی دوست سامنے آ جائے تو اس سے بھی اسی سختی کے لہجہ میں گفتگو کی جاتی ہے۔ انسان سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ عین شدت غضب میں اگر کوئی دوست سامنے سے آ جائے تو لہجہ بالکل بدل جائے اور دل میں سکون ہو جائے' چہرہ کی حالت بالکل بدل جائے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اوپر جب کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو ہم اس سے

مغلوب ہو جاتے ہیں اگر اس وقت دوسری حالت کے اسباب پیدا بھی ہو جائیں تو دفعتاً حالت کا بدلنا قریب قریب محال ہے تو شاید کوئی شخص آیات وعید کو شدومد کے ساتھ حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرنے کی غلطی قرآن میں دیکھ کر خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگتا کہ ایسے غصہ کے وقت اگر کسی مطیع بندے کا خیال آ گیا تو کہیں اس پر بھی سختی نہ ہونے لگے کیونکہ لوگوں نے ہمیشہ حق تعالیٰ شانہ کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں تین شخصوں کا واقعہ آتا ہے کہ وہ تینوں اس بات میں مشورہ کرنے بیٹھے کہ حق تعالیٰ ہماری باتوں کو سنتے ہیں یا نہیں۔

ایک اور صاحب بولے کہ جب ہم زور سے بولتے ہیں تو سنتے ہیں آہستہ بولتے ہیں تو نہیں سنتے۔ دوسرے صاحب بولے کہ نہ زور سے بولنے میں سنتے ہیں نہ آہستہ بولنے میں سمجھے کہ جس قدر بعد ہے اس نسبت سے آواز بلند نہیں ہے۔ تیسرے صاحب بولے جو ان میں ذرا عقلمند اور بوجھ بجھکڑ تھے کہ اگر سنتے ہیں تو ہر طرح کی بات سنتے ہیں آہستہ کی بھی اور زور کی بھی اور جو نہیں سنتے تو کوئی سی بھی نہیں سنتے اس لیے کہ حق تعالیٰ سے ہم اس قدر دور ہیں کہ اتنی دوری میں زور کی آواز بھی آہستہ ہی کے حکم میں ہے۔ چنانچہ ہم یہاں بیٹھے ہوئے کس قدر آواز سے باتیں کرتے ہیں۔ اس پر آیت نازل ہوئی:

وما کنتم تستترون ان یشھد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودکم ولکن ظننتم ان اللہ لایعلم کثیراً مما تعلمون وذالکم ظنکم الذی ظننتم بربکم ارداکم فاصبحتم من الخاسرین. اس ان اللہ لایعلم کثیراً مما تعلمون پر ایک قصہ یاد آیا۔

(اور تم اس بات سے تو اپنے کو چھپا ہی نہیں سکتے تھے کہ تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں گی لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں اور تمہارے اس گمان نے جو کچھ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا پھر تم خسارہ میں پڑ گئے)۔

ایک نیم ملا کا غلط معنے سمجھنے کے سبب حافظ کو لقمہ دینا

بنگلور میں ایک حافظ صاحب نے یہ آیت نماز میں پڑھی ''ولکن ظننتم ان اللہ لایعلم کثیراً مما تعلمون'' (لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے

اعمال کی خبر نہیں) ان کے پیچھے ایک نیم ملا بھی تھے انہوں نے حافظ کو لقمہ دیا۔ "ان اللّٰہ یعلم کثیراً مما تعملون" (بے شک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو) حافظ صاحب نے پھر آیت کا اعادہ کیا چونکہ اس کو اچھی طرح "لایعلم کثیراً مما تعملون" (تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو نہیں جانتے) یاد تھا اس نے پھر یہی پڑھا اور ان مولوی صاحب کے لقمہ کی پرواہ نہ کی بعد نماز کے مولوی صاحب نے حافظ صاحب سے سخت لہجہ میں کہا کہ ہم نے تم کو لقمہ دیا تم نے لیا کیوں نہیں، سب کی نماز خراب کی۔ حافظ کو چونکہ خوب یاد تھا اس نے صاف کہہ دیا کہ قرآن میں "لایعلم" ہی ہے دیکھ لیا جائے۔ قرآن کو دیکھا تو واقعی اس میں بھی "لایعلم" نکلا۔ اب تو مولوی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ "ان اللّٰہ لایعلم" کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عدم علم تو محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے غلطی ہوگئی۔ ایک عالم بھی وہاں تھے انہوں نے سمجھایا کہ "ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعملون" ہی صحیح ہے اور یہ تو ظن کفار کا معمول ہے کہ تم یوں گمان کرتے ہو کہ خدا کو ہمارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں کہ "ان اللّٰہ لایعلم ظننتم" کے تحت میں داخل ہے۔ جب ان نیم ملا صاحب کی حیرت ہوئی اور سمجھے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی کہ "ظننتم" پر خیال نہ کیا۔ دوسرے اس بھلے مانس کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ "ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعملون" (بے شک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو) میں کثیراً کی قید کے کیا معنی ہوں گے اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت اعمال کو جانتے ہیں یعنی سب کو نہیں جانتے مگر خیر چونکہ بے چارے کسی قدر ذی علم تھے اس لیے تنبیہ سے سمجھ گئے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ نیم ملا ہونا تو برا ہے پھر اسے اچھا کیوں کہا گیا کہ ذی علم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیم ملا ہونا اس وقت برا ہے جبکہ وہ اپنے کو مستقل سمجھے اور جو نیم ملا محقق کا تابع ہو کر رہے تو ایسا نیم ملا تو اچھا ہے یہ تو "ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعملون" (بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو نہیں جانتے؟) کے متعلق ایک لطیفہ تھا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ تو حدیث کا بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ مرض لوگوں میں قدیم سے ہے آج کل بھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں۔

ایک بوڑھی نادان عورت کی حکایت کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا

خود ہمارے اسی قصبہ میں ہمارے محلہ کی ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئیں' اب تو اس بے چاری کا انتقال ہو چکا مگر ان کی اولاد موجود ہے آ کر کہنے لگی کہ مولوی جی میں یوں پوچھوں کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہیں' ان کی اس بات پر گھر میں جو مستورات تھیں سب ہنسنے لگیں' میں نے منع کیا کہ ہنسو مت اس کو اس کی فہم کے مطابق جواب دو تا کہ یہ سمجھ جائے۔ غنیمت ہوا کہ اس نے یہ اعتقاد قائم نہیں کیا تھا کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ زندہ نہیں بلکہ کم فہمی کی وجہ سے ہی تردد میں رہی' میں نے اس کی سمجھ کے موافق اس سے کلام کیا اور یہ پوچھا کہ بڑی بی آخر تم دیکھتی ہو کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں مرتے ہیں' دنیا میں اولاد ہوتی ہے تو یہ کام کون کرتا ہے کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ' میں نے کہا اچھا بارش کون برساتا ہے کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ' میں نے کہا جب یہ سارے کام حق تعالیٰ کرتے ہیں اور یہ سب کام بدستور جاری ہیں تو اس سے تو خود معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ زندہ ہیں زندہ نہ ہوتے تو یہ کام کیسے ہوتے' کہنے لگیں کہ اب سمجھ میں آ گیا۔ تو اس بیچاری بڑھیا نے بھی حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا کہ اتنے زمانہ طویل سے موجود ہیں معاذ اللہ بوڑھے ہو گئے ہوں نہ معلوم زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ یہ حکایت تو محلہ محلت کی ہے۔

مثل سابق کئی نادانوں کی حکایتیں

ایک قصہ محلہ نوگانوے کا ہے کہ وہاں سے ایک بڑی بی آئیں اور مجھ سے کچھ اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کی' پھر کہنے لگیں کہ مولوی جی میں زیادہ کہتی بھی نہیں کہیں اللہ تعالیٰ خفا ہوں کہ میرے عیب کھولتی پھرتی ہے۔ ایک قصہ بنت کا ہے کہ وہاں ایک بڑی بی کہنے لگیں کہ میں یوں کہوں جب قیامت میں سب مر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کا اکیلے جی نہ گھبرائے گا۔ اب اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی عادت ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے' خدا کو بھی لوگ اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ ایک قصہ کان پور میں پیش آیا' وہاں ایک صاحب پوچھنے آئے تھے کہ توبہ توبہ حق تعالیٰ کے والدین کس جزیرے میں رہتے ہیں میں نے اس سوال کو سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے سائل طالب ہے مگر جاہل ہے بے چارہ کو حق تعالیٰ

کے والدین کی سکونت دریافت کرنے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں مغفرت کے لیے ان کا وسیلہ پکڑے جبکہ حق تعالیٰ نے بندوں کو والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو خود بھی ضرور اس پر عمل کریں گے اور اپنے والدین کے حکم کے خلاف نہ کریں گے تو اس خیال کا منشاء تو محض محبت ہے مگر بوجہ جہالت کے حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کیا اور یہ نہ سمجھا کہ حق تعالیٰ والدین سے پاک ہے۔

حافظ عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ نے اس سوال کے جواب میں سورہ اخلاص کا ترجمہ سنا دیا مگر یہ باتیں ان جاہلوں کی اس لیے بری نہیں معلوم ہوتی کہ محبت سے کہی گئی ہیں محبت کے ساتھ سب باتیں پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ شبان موسیٰ علیہ السلام کی سب باتیں حق تعالیٰ کو پسند ہوئیں کیونکہ سب کا منشاء محبت تھی اس نے بھی خدا کو اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان خدا کو اپنے اوپر قیاس کرتا ہے تو شاید آیات وعید کو دیکھ کر جہلاء حق تعالیٰ کے غصہ کو اپنے غصہ پر قیاس کرتے جس سے ضعفاء کے دل ٹوٹ جاتے اس لیے حق تعالیٰ نے "یوم تقوم الساعة یبلس المجرمون" فرما کر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا "ویوم تقوم الساعة یومئذٍ یتفرقون" یعنی گو جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم ناامید ہو جائیں گے مگر سب کا یکساں حال نہ ہوگا جس دن قیامت آئے گی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ ایمان والے ہیں اور انہوں نے اچھے عمل کیے ہیں وہ ایک بڑے باغ میں خوش کیے جائیں گے۔ "یوم تقوم الساعة" کے بعد (یومئذٍ) پھر زیادت تہویل کے لیے مکرر لایا گیا "فی روضة" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے یعنی بڑے باغ میں خوش کیے جائیں گے۔ یحبرون احبار سے ہے جو باب افعال کا مصدر ہے بمعنی سر جس کے بے تکلف معنی اردو محاورہ کے موافق یہ ہوئے کہ وہ بڑے باغ میں مسرور ہوں گے کیونکہ سر بھی لازمی نہیں متعدی ہے۔

دیکھیے حق تعالیٰ نے اس مقام پر یفرحون نہیں فرمایا کیونکہ فرح لازم ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایمان والے جنت میں خوش ہوں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر طبعی خوشی انسان کو ہو سکتی ہے اس قدر ان کو خوشی حاصل ہوگی۔ سو یفرحون سے طبعی خوشی پر زیادتی سمجھ میں نہ آتی۔ یحبرون سے یہ بات بتلا دی گئی کہ ان کو طبعی خوشی سے بہت

زیادہ خوشی حاصل ہوگی کیونکہ ان کو خوش کیا جائے گا یعنی ان کے خوش کرنے کا اہتمام ہوگا' کوئی خوش کرنے والا ان کو خوش کرے گا۔ جیسا کہ علماء نے یہی نکتہ مطہرۃ میں بیان فرمایا ہے کہ ازواج مطہرات کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو پاک کیا ہے یہی نہیں کہ وہ خود بخود پاک ہیں کیونکہ جو پاکی خود بخود حاصل ہوتی ہے وہ کم ہوتی ہے دیکھئے اگر ایک کپڑے کو نہر میں دن رات ڈالے رکھیں تو وہ خود بخود پاک ہو جائے گا مگر جو خوبی اس وقت حاصل ہوگی کہ اس کو کسی شخص کے سپرد کیا جائے اور وہ پانی میں ڈال کر تختہ پر اسے کوٹ پیٹ کر صاف کرے وہ صرف نہر میں ڈالے رکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی نکتہ یحبرون میں ہو سکتا ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ خوش ہوں گے بلکہ خوش کیے جائیں گے اور ان کو حق تعالیٰ شانہ خوش کریں گے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کتنے بڑے ہیں ان کی عظمت کے موافق ان کی دی ہوئی خوشی بھی عظیم ہوگی۔ اتنا فرق ہوگا کہ حق تعالیٰ شانہ کی عظمت تو بالفعل بھی غیر متناہی ہے اور اہل جنت کی خوشی بالفعل اگر چہ متناہی ہوگی مگر **لاتقف عند حد** کے اعتبار سے وہ بھی ایک طرح غیر متناہی ہوگی اور اس فرق کی یہ وجہ ہے کہ عظمت الٰہی داخل مشیت نہیں اور عظمت و سرور اہل جنت داخل مشیت ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار کو اس میں دخل ہے اور حادث کی لا متناہی بالفعل محال اور **لاتقف عند حد** جائز غرض غیر متناہی دونوں ہیں۔ ایک غیر متناہی بالفعل دوسرا غیر متناہی بمعنی **لاتقف عند حد** حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے "**الا ماشاء ربک**" (مگر جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار چاہے) کی تفسیر بھی یہی لکھی ہے کہ خلود اہل جنت و اہل نار داخل تحت القدرت ہے اگر چہ منقطع کوئی بھی نہ ہوگا ورنہ بدون اس توجیہ کے بظاہر اس استثناء پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت و اہل جہنم کے خلود کے ساتھ "**الا ماشاء ربک**" (مگر جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار چاہے) کے کیا معنی کیونکہ بظاہر اس کا یہ ترجمہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ جنت اور دوزخ میں رہیں گے مگر جبکہ چاہیں حق تعالیٰ تو اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی نکالے بھی جائیں گے سو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب تفسیر فرمائی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے مگر خدا جب چاہے تو ان کو نکالنے پر بھی قادر ہے اگر ایسا کیا کبھی نہ جائے تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر خدا تعالیٰ اس پر

مجبور نہیں بلکہ یہ سب اسی کی مشیت سے ہوگا۔ وعلیٰ ھذا اہل نار بھی۔ پس جس طرح کہ اہل جنت و اہل نار کا خلود بوجہ داخل تحت القدرت ہونے کے غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد ہے اسی طرح اہل جنت کی خوشی بھی غیر متناہی اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس دقیق مضمون کو اپنی تفسیر میں بہت ہی سلیس الفاظ میں بیان فرمایا ہے جس سے ہر شخص کا ذہن اس معنی کی طرف منتقل بھی نہیں ہوتا اور ظاہر میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ یہ کسی بڑے اشکال کا جواب ہے البتہ جو لوگ مدرس ہیں اور مواقع اشکالات سے واقف ہیں وہ اس کی قدر کر سکتے ہیں اور یہ شاہ صاحب کا اور بھی بڑا کمال ہے کہ ایسے دقیق مضمون کو معمولی لفظوں سے تعبیر فرما دیتے ہیں اس کی قدر بھی پڑھانے والے ہی جانتے ہیں کہ کم فہم لوگوں کے لیے مضمون کے سہل کرنے میں کس درجہ تعب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ غرض اس تقریر سے یہ معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ مذکور ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ والے جنت میں خوش ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے نہیں معلوم ہو سکتے اسی لیے حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ وہ لوگوں کو ایمان و اعمال صالحہ کا رستہ بتلا دیں اور اس وقت میں اول تو کسی اور نبی کی شریعت موجود نہیں اور اگر پہلے انبیاءؑ میں سے کسی کی کوئی شریعت ہے بھی تو محرف ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر اگر غیر محرف بھی ہوتی تو منسوخ تھی اس لیے اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے بالکل محروم رہتے۔ حق تعالیٰ شانہ کا بہت بڑا احسان ہمارے اوپر ہوا کہ آپ کی برکت سے ہم کو اس دولت سے سرفراز فرمایا' اسی کو حق تعالیٰ شانہ نے بطریق امتنان احسان جتلا کر جابجا قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے۔ کہیں فرماتے ہیں: "ولولا فضل اللہ علیکم و رحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلاً" (اگر اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل و رحمت نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرتے سوائے تھوڑے لوگوں کے) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لکنتم من الخاسرین" (پس اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو ضرور تم تباہ ہو جاتے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان مواقع میں فضل اللہ و رحمۃ کی تفسیر بعثت محمد یہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کی ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر خدا تعالیٰ تم پر اپنا فضل و رحمت نہ فرماتے تو تم نا کام اور محروم رہتے اور اگر اللہ تعالیٰ بعثت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تم پر رحم و کرم نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے' سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے۔

اس جگہ ایک اشکال طالب علمی ہوسکتا ہے کہ الا قلیلا کے بڑھا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بدون بعثت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی راہ مستقیم پا لیتے۔ جواب یہ ہے کہ اتباع سے مراد اتباع مطلق ہے نہ کہ مطلق اتباع۔ پس معنی یہ ہوئے کہ تم شیطان کے پورے متبع ہوتے۔ صرف بعضے لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عقل کامل و سلیم عطا فرمائی ہے وہ البتہ کامل اتباع شیطان کا نہ کرتے یعنی ایسے امور میں جن میں عقل کام دے سکتی ہے صرف ان میں اتباع شیطان کا خاص ایسے لوگ نہ کرتے گو مطلق اتباع شیطان سے یہ بھی نہ بچتے کیونکہ جن میں عقل کام نہیں دیتی ان میں کوئی مانع اتباع شیطان سے نہ تھا۔ تفصیل امور مذکورہ کی یہ ہے:

بعض احکام کا حسن قبیح عقلی بمعنی مدرک بالفعل ہونا اور بعض کا نہ ہونا

بعض احکام شریعت کے بدیہی اور ظاہر بھی ہیں جن کا حسن و قبح عقل سے بھی معلوم ہوسکتا ہے تو ایسی باتوں میں عقل سلیم سے راہ راست معلوم ہوسکتی ہے مثلاً ظلم کا قبیح ہونا انصاف کا پسندیدہ ہونا' زنا کی برائی' عفت و پارسائی کی خوبی ان باتوں میں بعض لوگ راہ مستقیم پر چل سکتے اور شیطان کے اتباع سے بچ سکتے تھے گو تفصیلی احکام بدوں نبوت کے ان میں بھی نصیب نہ ہوتے مگر خیر کسی قدر اتباع شیطان سے ان باتوں میں محفوظ رہ سکتے تھے مگر چونکہ ایسی باتیں بہت تھوڑی ہیں ان کے معلوم کر لینے ہی سے کیا کام چلتا بہت سی باتیں عبادت الٰہی کے متعلق ایسی ہیں جن کو عقل کبھی دریافت نہیں کر سکتی تھی بالخصوص صفات و ذات باری تعالیٰ و امور معاد کا تو بدون بعثت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بھی پتہ نہ چلتا اور نہ معلوم خدا تعالیٰ کے متعلق کیا سے کیا عقائد قائم کر لیتے جیسا کہ کفار نے کر لیے ہیں پھر خود وہ عقل بھی بدولت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہی کے عطا ہوئی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تمام کائنات کے۔ پس آپ کے وجود کو اس وقت بھی سلوک صراط عقل میں دخل رہتا بہرحال اصل فضل و رحمت جو قابل مسرت و خوشی ہے وہ یہ امر ہے کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود کی برکت سے ایمان و اعمال صالحہ کی توفیق ہوئی اور یہ عظیم نعمت حاصل ہوئی جس سے ہماری دنیا و آخرت سنور گئی اور ان شاء اللہ اس کی برکت سے ہم جنت میں خوشیاں منائیں گے۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس آیت کے مضمون کو مقصود کے ساتھ پورا تعلق ہے۔ اس آیت میں ایمان اور اعمال کا ثمرہ مذکور ہے اور ایمان و اعمال صالحہ وجود باجود محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثمرات ہیں تو یہ ثمرات بھی جو اس آیت میں مذکور ہیں حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے وجود باجود نور رمز بور السرور کے ثمرات ہیں۔

حضورؐ کے نور کے برکات کی دو قسم ہیں' ایک اشیاء کے ظہور سے متعلق ہیں' دوسرے اہل معرفت کے صدور سے

تو یہ ثمرات تو اس کو دوسرے دلائل کے ساتھ منضم کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک کے برکات دو قسم پر معلوم ہوئیں۔ ایک صوری جو کہ اشیاء کے وجود و ظہور کے متعلق ہیں دوسرے معنوی جو ان اشیاء میں سے خاص اہل ایمان کے صدور کے متعلق ہیں' نور کے متعلق تو آپ کے نور مبارک کی برکت یہ ہے کہ تمام عالم کا وجود آپ کے نور سے ہوا اور لوگ اسی کو آج کل زیادہ بیان کرتے ہیں۔ صدور کے متعلق آپ کی برکات یہ ہیں کہ ایمان و معرفت الٰہی سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطہ سے حاصل ہوئی ان برکات کو لوگ آج کل بیان ہی نہیں کرتے بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے کیونکہ جو اثر آپ کے نور کا ظہور کے متعلق ہے اس کے آثار تو محسوس ہیں اور جو اثر صدور کے متعلق ہے اس کے آثار یعنی خاص ثمرات مقصودہ وہ قیامت و جنت میں معلوم ہوں گے اور یہاں ان سے ذہول ہے نیز وہ رتبہ میں بھی اعظم ہیں اس لیے زیادہ ضرورت اسی کے بیان کرنے کی ہے اور اعظم ہونے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ ظہور پر تو صرف اسی قدر اثر ہوا کہ ہم موجود ہو گئے مگر صرف موجود ہو جانے سے کچھ زیادہ فضیلت نہیں

حاصل ہو سکتی، پوری فضیلت ایمان و معرفت الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو حیوانات پر شرف ہے۔ تیسرے یہ جو اثرات نور مبارک کے ظہور پذیر ہوئے وہ متناہی اور محدود ہیں کیونکہ موجودات اپنی ذات کے اعتبار سے متناہی ہیں اور صدور پر جو اثر ہوا وہ غیر متناہی ہے کیونکہ معرفت الٰہی کے مراتب اور ان کے ثمرات غیر متناہی ہیں جو ہم کو جنت میں نصیب ہوں گے۔ بس آپ کے نور مبارک کے وہ برکات زیادہ بیان کرنے کے قابل ہیں جو صدور پر متجلی ہیں۔ اس آیت شریفہ میں انہیں ثمرات کا ذکر ہے مگر یہ ثمرات اس آیت کے آخر میں مذکور ہیں اور ایک ثمرہ آپ کے تبرکات کا متعلقہ صدور کا اس آیت کے شروع ہی میں مذکور ہے جو عجیب ثمرہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

"ویوم تقوم الساعة یومئذٍ یتفرقون" (قیامت جب قائم ہوگی تو لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ یہ جدا جدا ہونا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نور مبارک کا ایک ثمرہ ہے کیونکہ ایمان و معرفت و اعمال صالحہ کا حصول آپ کی برکت سے ہوا اور ایمان و اعمال صالحہ ہی کی وجہ سے مخلوق کے دو فرقے ہو گئے بعض مومن بعض کافر تو اس تفریق کا اصل منشاء بھی نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی تفریق کے ظاہر کرنے کے لیے قیامت قائم ہوگی تو دراصل حقیقی قیامت آپ ہی کی ذات ہے اور عرفی قیادت اس کا ایک اثر اور ثمرہ اسی کو مولانا نے مثنوی میں ایک جگہ بیان فرمایا ہے:

صد قیامت بود احمد در جہاں

(حضرت احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود دنیا میں سو قیامت کا باعث ہے)

حدیث میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرق بین الناس قرآن شریف کا لقب بھی فرقان اسی وجہ سے ہے کہ وہ فارق ہے۔ غرض قیامت قائم ہونے کا سبب بھی تفریق ہے اور یہ تفریق قیامت تابع ہے تفریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کے اظہار کے لیے قیامت قائم کی جائے گی۔ غرض اصل سروران برکات محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ ہم اطاعت و معرفت الٰہی کی دولت حاصل کریں جس کے ثمرات قیامت و جنت میں حاصل ہوں گے نہ وہ باتیں جو آج کل ہم لوگ خود بخود گھڑتے ہیں۔

عید میلاد منانا بدعت وضلالت ہے

یعنی عید میلاد النبی وغیرہ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ان باتوں کی تعلیم نہیں بلکہ صراحۃً منع فرمایا ہے اور عید میلاد کے متعلق گو بہت دفعہ بیان ہو چکا ہے اور اصول شریعت سے بتلا دیا گیا ہے کہ یہ فعل بالکل ناجائز اور بدعت ضلالت ہے مگر اس دفعہ مجھے ایک حدیث اس کے متعلق بہت صریح ملی ہے جس سے صاف صاف اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے وہ حدیث یہ ہے: "لاتتخذوا قبری عیدا"[1] (میری قبر کو عید مت بناؤ) اس حدیث سے عید میلاد کی نفی نہایت واضح ہے اور میرے لیے یہ حدیث بالکل تسلی بخش ہوگئی' میں دوسروں کے لیے بھی تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کرتا ہوں کہ اس حدیث سے عید میلاد کی نفی کیونکر ہوگئی۔ حدیث کا ترجمہ ہے کہ میری قبر کو عید نہ بناؤ' اول بطور مقدمہ کے جاننے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لیے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں' صحابہ کا بھی یہی اعتقاد ہے۔

حدیث میں بھی نص ہے "ان نبی حی فی قبرہ یرزق" کہ آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق بھی پہنچتا ہے مگر یہ یاد رہے اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ کہتے ہیں باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ تو تمام جماعت مؤمنین کو حاصل ہے جس کے ذریعے سے نعیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی۔ دوسری حیات شہداء کی ہے یہ عام مؤمنین کی حیات برزخیہ سے اقوی ہوگی۔ عام مومنین کی حیات برزخیہ بہ نسبت شہید کے کمزور ہوتی ہے اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ عام مومنین کی حیات برزخیہ اس حیات دنیوی سے بھی کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقوی ہونے کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھا سکتی اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات کا پس شہید میں اس اثر کا ظاہر ہونا اور عام مؤمنین کا نہ ہونا یہ دلیل ہے

[1] (مسند احمد ۲: ۳۶۷' المصنف لابن ابی شیبہ ۲: ۳۷۵)

شہید کے حیات کی قوی ہونے کے بہ نسبت عام کی حیات کے بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو سرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے' بہت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلی نہیں اکثری ہے اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جاوے گا باقی مطلقاً انکار تو صحیح نہیں ہوسکتا یہ تو جواب تسلیمی ہے اس تقدیر پر جبکہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید ہی تھا مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں کہ معرکہ میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لیے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں مثلاً نیت کا خاص لوجہ اللہ ہونا جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہوسکتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور یہ حیات کا قوی درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہو کہ اس کی لاش گل گئی مثلاً اس جگہ کی مٹی تیز ہو ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی تو اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کردیا جائے جیسا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریت زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی بعینہ محفوظ رہے گی۔

انبیاء کی حیات برزخیہ شہداء کی حیات سے قوی ہے

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کے حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو شہید کے لیے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی۔ حدیث میں ہے "حرم اللہ اجساد الانبیاء علی الارض"[1] (اللہ تعالیٰ نے زمین کے لیے اجسامِ انبیاء علیہم السلام کو کھانا حرام کردیا ہے) اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور وہ حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام

---

[1] (تهذيب تاريخ دمشق لابن عساكر ۳:۵۷ ا بلفظ آخر)

ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہراتؓ سے بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ میں تقسیم نہیں ہوتی۔ "نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکنا صدقۃ"[1] (ہم حضرات انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہیں، ہم میراث میں ترکہ نہیں چھوڑتے) انبیاء علیہم السلام کا تمام ترکہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لیے شریعت نے مشروع نہیں کیں تو اگرچہ شریعت نے اس کا خاص کوئی راز نہیں بیان کیا مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں امروں سے اور گو ازواج نبی سے بعد وفات نبی کے نکاح حرام ہونا تمام انبیاء کے بارے میں منقول نہیں ہوا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء حکم میراث پر قیاس کر کے اس حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لیے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم نہ ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لیے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عام مؤمنین سے اقویٰ ہونا ثابت ہوا۔ بہرحال غرض یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے۔ چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہو جائے گا۔

تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدس کی طرف دو شخص ملعون کی سرنگ کھودنے کا واقعہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یاد نہیں رہا کس بادشاہ کے وقت میں) دو شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نکالنے کے لیے آئے تھے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے، لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے، زاہد مشہور ہو گئے تھے، وہ کم بخت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے اور جس قدر سرنگ کھود لیتے

---

[1] (فتح الباری ۱۲: ۸، زاد المسیر ۵: ۲۰۹)

راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ برابر کر دیتے تھے تا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا' خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر حزن وغم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرمارہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے جلد مجھے ان سے نجات دو' خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی۔ خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا' وزیر نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں' بادشاہ نے فوراً فوج لے کر بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر شروع کیا اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا' اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاخیر ہو جاتی تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے' بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازہ سے باہر نکلنے کا حکم کیا اور خود دروازہ پر کھڑے ہو کر ہر شخص کو خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا اس لیے بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی اور لوگوں سے کہا کہ کیا سب لوگ باہر آ گئے' لوگوں نے کہا کہ اب کوئی اندر نہیں رہا' بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا' ضرور کوئی اندر رہا ہے' لوگوں نے کہا کہ دو زاہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں' بادشاہ نے کہا مجھے ان ہی سے کام ہے۔ چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو وہ بعینہ وہ دو صورتیں نظر پڑیں جو خواب میں دکھلائی گئی تھیں ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے۔

چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر کے نکالنے کے لیے سرنگ کھودی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہنچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کرا دی اور زمین کو پانی کی تہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تا کہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح و سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کئی سو برس کے بعد بھی اس کے نکالنے کی کوشش کی اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ کیوں لگاتے' محض وہم وشبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتے جو لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی' وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے مگر بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے اور مع روح ہے جیسا کہ بیان کیا گیا تو ظاہر ہے اور علماء نے بھی تصریح کی ہے۔

جس بقعہ سے جسم اقدس مس کیے ہوئے ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے

وہ بقعہ جس سے جسم مبارک خصوص مع الروح مس کیے ہوئے ہے عرش سے بھی افضل ہے کیونکہ عرش پر معاذ اللہ حق تعالیٰ شانہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو بیشک وہ جگہ سب سے افضل ہوتی' خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہیں اس لیے عرش کو مستقر خداوندی نہیں کہا جا سکتا اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ استویٰ علی العرش کے معنی استقرار کے نہیں ہو سکتے کیونکہ بیٹھنے کی جگہ وہ ہو سکتی ہے جو بیٹھنے والے سے زیادہ یا کم سے کم اس کی برابر تو ہو مثلاً اگر ہم تخت یا کرسی پر بیٹھیں اور اس کے اوپر ایک تنکا پڑا ہوا ہو تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم تنکے پر مستقر ہوئے کیونکہ اس کو ہم سے کچھ بھی نسبت نہیں اس لیے وہ ہمارا مکان نہیں بن سکتا۔

استویٰ علی العرش کی تفسیر بدیع

پس اسی طرح عرش خدا تعالیٰ کا مکان نہیں بن سکتا کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے وہ نسبت بھی نہیں جو رائی کے دانہ کو ہم سے ہے اس دلیل سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ استویٰ علی العرش کے معنی بیٹھنے کے ہرگز یہاں نہیں ہو سکتے۔ اب سوال ہوگا کہ پھر کیا معنے مراد ہیں اس میں سلف کا مسلک تو یہ ہے کہ سکوت کرو اور واقعی سلامتی اسی میں ہے مگر متاخرین نے بمصلحت وقت کی مناسب تاویل کر دینے کی اجازت دے دی ہے۔ جب مصلحت کی بناء پر باب تاویل مفتوح ہو گیا تو ہر شخص کو مناسب تاویل کر دینے کا حق ہے۔ ایک تاویل میرے ذہن

میں اس کی آئی ہے جو دوسری تاویلوں کی بہ نسبت اقرب اور بہت صاف ہے اگرچہ میرا مذاق طبعی اس بارہ میں سلف کے موافق ہے لیکن جو لوگ بضرورت تاویل کرنا ہی پسند کرتے ہیں وہ میری اس تاویل کو بھی ان ہی تاویلوں میں جگہ دے دیں۔ میرے ذہن میں استویٰ علی العرش کے متعلق یہ بات آئی ہے کہ بعض آیات میں استویٰ علی العرش کے بعد یدبر الامر بھی آیا ہے جس کو استویٰ علی العرش کا بیان قرار دیا جائے تو یہ محاورہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے کہ ولی عہد تخت نشین ہو گیا عرف میں تخت نشین ہونے کے معنی حکمراں ہونے کے ہیں خاص تخت پر بیٹھنا ضروری نہیں' اسی طرح استویٰ علیٰ العرش کے معنی تدبیر و حکمرانی فرمانے کے ہیں یعنی زمین و آسمان کو پیدا فرما کر حق تعالیٰ شانہ ان آسمان و زمین میں حکمرانی و تدبیر و تصرف کرنے لگے۔ پس اگر تاویل کی جاوے تو یہ تاویل بھی عمدہ اور لطیف تاویل ہے۔ پس یہ کنایہ ہوگا' غرض حق تعالیٰ شانہ پر بوجہ مانعات عقلیہ کے استواء متعارف کا حکم نہیں کیا جا سکتا تو عرش کو محل استقرار حق کی وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ بقعہ شریفہ سے وہ افضل ہوتا بلکہ اس کو صرف اس وجہ سے اور اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلی گاہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون تجلی گاہ الٰہی ہوگا۔ پس اس حیثیت کے اثر سے بھی بقعہ شریفہ خالی نہ رہا اس لیے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں سب سے زیادہ اشرف ہوئی کیونکہ تجلیات حق بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائض ہوتے ہیں۔ بہرحال اس مسئلہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے یہ تو ایک مقدمہ تھا کہ بقعہ شریفہ و قبر شریف تمام اماکن سے افضل ہے اب اس مقدمہ کے بعد یہ سمجھنا چاہیے کہ قبر شریف تو بلا اختلاف بعینہ باقی ہے اس میں کسی کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا اور یوم الولادت و یوم المعراج و یوم البعث وغیرہ یقیناً باقی نہیں کیونکہ زمانہ غیر قار ہے وہ دن جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی اب یقیناً نہیں لوٹتا بلکہ اس کا مثل عود کرتا ہے ایک مقدمہ یہ ہوا اس کے بعد سمجھو کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو عید بنانے سے منع فرما دیا اور اس کا عید بنانا حرام ہو گیا جو کہ یقیناً باقی ہے تو ان چیزوں کو عید بنانا جو کہ بعینہ باقی نہیں کیونکر جائز ہو سکتا ہے میرے نزدیک تو اس حدیث سے عید میلاد کی صراحۃً نفی ہوتی ہے اب بھی کسی کو اس کی حرمت

میں شک ہوتو وہ جانے اوراس کا کام جانے اس تقریر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت اور کلام کی جامعیت بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر قبر ہی کو عید بنانے سے کیوں منع فرمایا سواس لیے منع فرمایا کہ اس کی فضیلت وشرافت تو بوجہ معین اور یقینی ہونے کے سب کو مسلم ہوگی جب ایسی چیز کی بابت کوئی حکم بیان کر دیا جائے گا اس پر ادنیٰ کو قیاس کر کے بقیہ سب چیزوں کا حکم معلوم ہو جائے گا۔ جب ان چیزوں کا عید بنانا معلوم ہو گیا کہ حرام ہے اور قرآن میں نعیم جنت کا ایمان و عمل صالحہ پر ترتب صاف صاف مذکور ہے اور عمل صالحہ میں حرام امور کے ترک پر موقوف ہے تو اگر نعیم جنت حاصل کرنے کا اشتیاق ہے اور یقیناً ہر مسلمان کو ہے تو ان غیر مشروع کاموں کو چھوڑنا چاہیے کیونکہ نجات کلی بغیر اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ قرآن میں جابجا امنوا کے بعد "عملوا الصلحت" ضرور مذکور ہے اگر بدرجہ اتم واکمل نجات چاہیں تو ان چیزوں کو ترک کریں' بدرجہ اتم واکمل اس لیے کہا کہ کسی نہ کسی وقت تو یہ اہل بدعت بھی نجات پا ہی لیں گے۔ اگر چہ وہ ہمیں کافر کہیں مگر ہم ان کو کافر نہیں کہتے کہ محروم عن النجات سمجھیں۔

فرق غیر ناجیہ کے عدم خلود پر ایک شبہ کا جواب

اس پر ایک طالب علم کا شبہ ہے جس کو میں دفع کر دینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں بجز ایک فرقہ کے سب ناری ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ ناجیہ صرف ایک ہی ہے باقی ناجی نہیں کیونکہ اگر باقی فرقے بھی کچھ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں تو ان فرقوں میں اور فرقہ ناجیہ میں کیا فرق ہوگا کیونکہ فرقہ ناجیہ جو کہ اہل حق ہیں ان کے لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب کے سب بدون حساب کتاب اور بدون کسی قدر مواخذہ کے جنت میں جائیں گے۔ جیسا اہل حق میں بھی عصاۃ کو بھی نجات اولیٰ حاصل نہیں تو دونوں میں فرق کیا ہوا' پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا کہ ان میں ناجی صرف ایک فرقہ ہے۔ معلوم ہوا کہ فرقہ ناجیہ کو تو کبھی نہ کبھی نجات حاصل ہو جائے گی اور باقی بہتر فرقوں کو نجات حاصل نہ ہوگی تو یہ اہل بدعت نجات کیونکر پاسکتے ہیں اگر اس کا التزام کیا جاوے تو اہل بدعت کی عدم تکفیر کے کیا معنی۔ جواب یہ ہے کہ مراد

حدیث میں یہ ہے کہ وہ بہتر فرقے بوجہ فساد عقیدہ کے جہنم میں جائیں گے اور اہل حق جو کہ فرقہ ناجیہ ہے فساد عقیدہ کی وجہ سے جہنم میں نہ جائیں گے دونوں میں مابہ الفرق دخول لفساد العقائد ہے باقی دخول للعمل یہ دونوں میں مشترک ہے۔ پس اس تقریر کے بعد اہل بدعت کا خلود ثابت نہ ہوا اور اس تقریر کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ نص قطعی "فمن یعمل مثقال ذرة خیراً یره ومن یعمل مثقال ذرة شراً یره" سے معلوم ہے کہ جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کو بھی دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا تو جس شخص میں کچھ ایمان ہے اگرچہ فساد عقیدہ ہی کے ساتھ ہے تو اگر وہ بھی ناجی نہ ہو تو وہ اس کی جزاء کب پائے گا' آیا قبل دخول نار یا بعد دخول نار قبل دخول نار تو محال ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ وہ اول جنت میں جاوے اور پھر وہاں سے خارج کر کے جہنم میں جاوے اور نصوص سے معلوم ہے کہ بعد دخول جنت کسی کو عذاب نہ ہوگا اور اگر جنت کے سوا اور کہیں ثواب پاوے تو جنت سے پہلے کوئی اور موقع ثواب کا نہیں بس یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے ایمان قلیل کلی جزا بعد دخول نار پائے کہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو ورنہ اگر کہیں جزاء نہ ملے تو لازم آئے گا کہ کوئی عمل صالح ایسا بھی ہوا جس کا کوئی صلہ کرنے والے کو نہ ملے اور یہ اس آیت کے خلاف ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اہل بدعت کو خلود ہوگا کبھی نجات نہ ہوگی بلکہ کبھی نہ کبھی تو نجات ضرور ہو جائے گی۔ گو اس سے پہلے عذاب بھی بھگتنا پڑے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو عذاب فساد عقائد سے ہو وہ اشد ہے اس عذاب سے جو فساد عمل سے ہو چنانچہ احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدعت کو دوسرے فساق سے زیادہ سخت عذاب ہوگا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک جگہ میرا گزر ہوا تو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ اہل قبور کو عذاب ہو رہا ہے ہم نے ان کے لیے دعا کی تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت کے سوا سب کی اس وقت مغفرت ہو گئی۔ اسی لیے یوں تو سب گناہوں سے مسلمان کو بچنا چاہیے کیونکہ مقصود اعلیٰ نجات اکمل ہی ہے اور وہ بدون گناہوں سے بچے حاصل نہیں ہو سکتی مگر بدعت سے بہت زیادہ اجتناب ضروری ہے کیونکہ بدعت حق تعالیٰ شانہ کو بہت مبغوض ہے اس لیے کہ دیگر اعمال تو لوگ حرام اور گناہ سمجھ کر کرتے ہیں اور افعال بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں اس سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی ان ہی میں سے منکرات متعلقہ رسم مولد بھی ہے یہاں تک تو پہلا مضمون تھا

جس کا ہمیشہ سے بیان کرنے کا معمول ہے یعنی رسم میلاد کا جو کہ ختم ہو چکا۔ اس جزو کا نام الحبور لنور الصدور ہونا چاہیے کیونکہ جو نور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صدور یعنی قلوب میں ہے اور وہ قیامت میں معلوم ہوگا اور اس سے جنتیوں میں خوشی حاصل ہوگی۔ یہ اس کا تذکرہ تھا۔

وعظ دوم ملقب بہ الحبور لنور الصدور

اب دوسرا مضمون جو بعد میں منضم ہوا ہے یعنی بیان تبرکات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی جو کہ ربیع الاول کے متعلق ہے اور گیارہویں کا بیان بھی جو کہ ربیع الثانی کے متعلق ہے شروع کرتا ہوں لوگوں سے ان دونوں میں زیادتی ہو رہی ہے' میں ہر ایک کو الگ الگ بیان کروں گا' تبرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک تو وہی زیادتی کی جا رہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک کہ بعض طلبہ بھی شک میں ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے۔ جبہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باعث برکت ہے اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ سے ایک طالب علم جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دکان ہے۔ سوال کیا کہ میں دکان پر بیٹھ کر جبہ کی زیارت کرلوں گا' مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں عرسوں کی طرح ہوتا ہے تاریخ کی تعیین ہوتی ہے' دعوت ہوتی ہے' دور سے آدمی آتے ہیں' عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے زیارت کرنے آتے ہیں حالانکہ زیارت جبہ شریف نماز روزہ کی برابر کبھی نہیں ہو سکتی۔ حدیث "لاتتخذوا قبری عیدا"[1] سے اس کی نفی بھی ہوگئی کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کی برابر نہیں ہو سکتی گو اس میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مثل یوم ولادت وغیرہ کے اس میں بھی تبدل ہو گیا' اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی نہیں مگر خیر جو بات دل میں نہیں اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہیے مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسد اطہر صلی اللہ علیہ وسلم مماس نہیں اور قبر شریف کو تماس حاصل ہے اسی لیے جبہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔

---

[1] (مسند احمد ۲: ۳۶۷، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲: ۳۷۵)

پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا' کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا اس کی بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ خیال کر کے کہ موئے مبارک جزو بدن ہے قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے مگر قبر میں اتصال اور تماس کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موئے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں اس لیے دونوں غیر مساوی ہوئے' موئے مبارک جزو ہے مگر اب مماس نہیں اور قبر شریف جزو نہیں مگر مماس ہے تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہوسکتا ہے۔ پس حدیث "لاتتخذوا قبری عیداً"[1] (میری قبر کو عید مت بنانا) سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہوگیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بلاغت ہے کہ آپ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا جس سے ملبوس و شعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہوگئے۔

صحابہؓ وسلف کا تبرکات کیساتھ معاملہ

علاوہ ازیں صحابہؓ اور سلف صالحین نے تعید کو کبھی اختیار نہیں کیا حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی۔ اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابہؓ میں عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا تو اس کے لیے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں کیونکہ ان کا بلفظہ یاد رکھنا دشوار تھا اس وقت ان کو نقل کیے دیتا ہوں۔

عن عثمان بن عبداللّٰہ بن وھب قال فارسلنی اھلی الی ام سلمۃ بقدح من مآء وکان اذا اصاب الانسان عین اوشئی بعث الیھا مخصنۃ لھا فاخرجت من شعر رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسکہ فی جلجل من فضۃ فخضخضتہ فشرب منہ قال فاطلعت فی الجلجل فرایت شعرات حمراء. (رواہ البخاری)

عثمان بن عبداللہ بن وہب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دے کر بھیجا اور

---

[1] (مسند احمد ۲: ۳۶۷ المصنف لابن ابی شیبۃ ۲: ۳۷۵)

یہ قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہوتی تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے چاندی کی نلکی میں رکھ رکھا تھا پانی میں ان بالوں کو ہلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر نلکی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ایک صحابیہؓ کے پاس نلکی میں بال رکھے ہوئے تھے جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بیماروں کی شفاء کے لیے اس کا غسالہ پلا دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہوا ہے صحیح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال پکنے لگے تھے جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب کبھی نہیں کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سفید بال قریب بیس کے تھے یا کچھ زائد۔

نلکی میں فاتحہ

نلکی پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک تھانیدار کے یہاں ایک شخص نے رپٹ لکھوائی کہ میری فاتحہ چوری ہو گئی' داروغہ صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا اللہ فاتحہ کیا اور اس کا چوری ہونا کیسا' پوچھا تو قصہ بیان کیا کہ ہمارا ایک پیر ہے جب وہ آیا کرے ہے تو ہمارے کھانے کی فاتحہ دیا کرے ہے اور جب جاوے ہے ایک نلکی میں فاتحہ بند کر دے ہے کہ سال بھر تک اس سے کام لیتے رہیو پھر میں آ کر دوبارہ پڑھ دوں گا تو وہ نلکی چوری ہو گئی۔

عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللّٰہ تعالٰی عنہما انہا اخرجت جبتہ طیالسیة کسروانیة لبنة دیباج و فرجیہا مکفوفین بالدیباج وقالت ھذہ جبة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و کانت عند عائشہ فلما قبضت قبضتہا وکان النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یلبسہا فنحن نغسلہا للمرضی نستشفی بہا۔ (رواہ مسلم)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک جبہ طیلسانی کسروی نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر ریشم کی سنجاف لگی ہوئی تھی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد

میں نے اسے لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفاء حاصل کرنے کے لیے اس حدیث پر شاید بادی النظر میں کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت اسماءؓ کے پاس کیونکر رہا اور جب تک ترکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم نہ ہو جائے ان کو اس کے استعمال کا کیا حق تھا تو بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ آپ کے مال میں تمام مسلمانوں کا حق تھا تو آپ کا ترکہ وقف تھا اور یہ حضرات اس کے متولی تھے پھر ان کے اذن سے سب مسلمانوں کو بطریق برکت اس کے استعمال کا حق حاصل ہے اور باذن متولی کی قید اس لیے بڑھا دی کہ شاید کسی کو یہ سن کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مال وقف ہے اس جبہ متعارفہ کے لینے کی فکر ہوئی ہو۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ وقف ہے مگر وقف میں بدون اذن متولی کسی کو تصرف کرنا جائز نہیں۔ پس جبہ شریف کو اس کے خدام سے چھیننا یا بلا اجازت استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں اور اس قسم کی باتوں کی ضرورت ہی کیا پڑی وہ خدام تو بیچارے خود ہی اپنے سر پر رکھ کر ہر شخص کے گھر لیجا کر زیارت کرا دیتے ہیں۔ البتہ روٹی ان لوگوں کو دینا پڑے گی اس سے زیادہ وہ تم سے کچھ نہیں مانگیں گے یہ بھی جبہ شریف کی برکت کھلی ہوئی ہے کہ اس کے خدام بے طمع ہیں۔

خواب بابت جبہ شریف

احقر نے ایک بار یہ دیکھا کہ کوئی شخص اس کے چرانے کی فکر میں ہے میں نے خدام سے کہلا بھیجا کہ گو میرا خواب کوئی چیز نہیں مگر احتیاط کا مقتضا یہ ہے کہ جبہ شریفہ کی زیادہ حفاظت کی جاوے۔

ثم وعن انس قال ان النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اتی منی فاتی الجمرۃ فرماھا ثم اتی منزلہ بمنی ونحرلسکہ ثم دعا بالحلاق و ناول الحاق شقہ الایمن فحلقہ ثم دعا اباطلحۃ الانصاری فاعطاہ ایاہ ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقہ فاعطاہ اباطلحۃ فقال اقسمہ بین الناس.

---

۱ (الصحیح لمسلم' الحج: ۳۲۶' سنن الترمذی: ۹۱۳)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے تو جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے اور اس کی رمی کی پھر منیٰ میں جو مکان آپ کے لیے مقرر تھا اس میں تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا پھر حلاق کو بلایا اور اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا اس نے داہنے حصہ کو مونڈا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ انصاری کو بلایا وہ بال ان کو عطا کیے پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا اور فرمایا مونڈو اس نے بائیں حصہ کو بھی مونڈا آپ نے وہ بال بھی ابوطلحہ انصاری کو دیے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کردو۔ یہاں سے ایک بات پر تنبیہ کر دینا مناسب ہے وہ یہ کہ نائی کو آج کل حجام کہتے ہیں یہ لفظ غلط ہے حجام اصل میں پچھنے لگانے والے کو کہا جاتا ہے۔ نائی کو عربی میں حلاق کہتے ہیں مگر ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں یہ قوم پچھنے لگانے کا پیشہ بھی کرتی ہو اس وجہ سے اس وقت اس کام کی مناسبت سے حجام لقب پڑ گیا ہوگا پھر اس پیشہ کے چھوڑ دینے کے بعد بھی لقب باقی رہا۔ ایک شاعر نے حجام کو خوب دھمکایا ہے کہ تو بڑا بے ادب ہے خط پروردگار میں اصلاح کر دیتا ہے یعنی ڈاڑھی وغیرہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں تو ان میں اصلاح دیتا ہے تو خط پروردگار کو درست کرتا ہے۔ یہ شاعر بھی کسی کو نہیں چھوڑتے۔ شعر یہ ہے:

حجام بر دو دست ترا قطع واجب است | اصلاح می دہی خط پروردگار را

(اے حجام تیرے دونوں ہاتھ کاٹنا واجب ہے اس لیے کہ تو خدا کی پیدا کی ہوئی چیز (ڈاڑھی) میں اصلاح کرتا ہے)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابہؓ میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہؓ شرقاً وغرباً منتشر ہو گئے تھے تو اگر کہیں موئے مبارک پایا جائے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تب تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افتراء و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

قال علیه السلام لا تصدقوا اهل الکتاب ولا تکذبوهم وقولوا امنا باللّٰه وما انزل الینا رواه البخاری قال فی المرقاة وفیه اشارة الی التوقف فیما استشکل من الامور و العلوم.[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو بلکہ کہو کہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر جو کہ ہماری طرف نازل ہوئی ایمان لاتے ہیں۔ ملا علی قاری مرقاۃ میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر اشارہ ہے کہ جو امر اور جو مضمون علمی مشتبہ ہو اس میں توقف کرنا چاہیے جرأت کر کے ایک جانب کو بلا تیقن معین نہ کرنا چاہیے اہل کتاب کے اقوال میں توقف اس لیے واجب ہے کہ قرآن سے توریت وانجیل کا کتاب اللہ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب نے اس میں تحریف بھی کی ہے اب جو مضمون وہ بیان کریں اس میں یہ بھی شبہ ہے کہ کلام الٰہی ہو اور یہ بھی خدشہ ہے کہ اہل کتاب کے محرفات میں سے ہو۔ پس بلا دلیل مستقل کسی ایک جانب کی تعیین دشوار ہے اس لیے توقف واجب ہے یہی حال موئے مبارک کا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے بال صحابہؓ کو تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بال جہاں بھی ہوگا اس کی حفاظت کی گئی ہے اس لیے عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس میں سے کچھ بقایا ضرور موجود ہوگی مگر آج کل جھوٹ کا بھی بازار گرم ہے یہ بھی شبہ ہے کہ طمع دنیا سے کہیں جھوٹ موٹ دعویٰ نہ کیا گیا ہو اس لیے اس کے بارے میں بھی توقف واجب ہے نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب مگر سنا ہے مدینہ شریف میں موئے مبارک بسند معتبر موجود ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موئے مبارک کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے موئے مبارک پایا نہیں مگر اتنی خبر سنی ہے کہ دنیا میں موجود ہے سو تسلی کے لیے ہمیں اتنا بھی کافی ہے پھر اوپر یہ شعر فرماتے ہیں:

مرا از زلف تو موئے پسند ست　　　　ہوس را رہ مدہ بوئے پسند است

(مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کا ایک بال بھی پسند ہے' ہوس کو اس باب میں گنجائش نہ دے یہ پسند ہے خوشبو ہے)

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳:۷ ۲۳' مشکوۃ المصابیح: ۱۵۵)

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ اشعار خوب موقع سے لاتے ہیں۔ ایک مقام پر جہاں حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کا حال آیا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ شریفہ کا پردہ اٹھا کر صحابہؓ کو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا اور آپ مسرور ہوئے صحابہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک دیکھ کر قریب تھا کہ ہم نمازیں توڑ دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے سب کو سکون کا حکم فرمایا۔ اس جگہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شعر بہت اچھا لکھا ہے:

در نمازم خم ابروئے تو چوں یاد آمد　　حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

(عین نماز کی حالت ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ منور کا خیال آجاتا ہے تو میری حالت بگڑ جاتی ہے کیونکہ مسجد کے محراب کا خم دیکھ کر آپ کی آبرو کا خم یاد آتا ہے)

بجز مکتوبات محترمہ کے دوسرے تبرکات کا قبر میں رکھنا جائز ہے

وعن ام عطية في قصه غسل زينب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وتكفينها انها قالت فالقى حقوه فقال اشعرنها اياه قال الشيخ في اللمعات وهذا الحديث اصل في البركة بآثار الصالحين ولباسهم[1]

حضرت ام عطیہ حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل وکفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہبند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے مماس کر کے پہناؤ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو (تاکہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے) حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار وملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے۔ معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی کا

---

[1] (الصحیح للبخاری ۲: ۹۳، الصحیح لمسلم، جنائز: ۳۶)

اتصال حرام ہے اور بدن میت چند روز کے بعد پھولے پھٹے گا وہ نجاست قرآن کو بھی لگے گی اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں ہیں اور اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام جابجا ہے قابل احترام بلکہ الفاظ وحروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آلہ علم ہونے کے قابل احترام ہے بعض لوگ فرعون وہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں۔ یہ بالکل لغو ومہمل حرکت ہے اس پر تو بس نہ چلا الفاظ ہی کی بے حرمتی پر بہادری دکھلائی' یہ لوگ وہ تھے جو فرعون کے لفظ کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ان کے مقابل بعض وہ لوگ ہیں جو اس لفظ کی ایسی حرمت کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے احسان وانعام کے تذکرہ کا ایک صنعت سے اس کو عنوان بناتے ہیں۔ چنانچہ مثنوی کے ایک محشی نے موسیٰ علیہ السلام کی فتح کے قصہ کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے لفرعون الٰہی فرعون بدریائے نیل غرق شد بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ فرعون الٰہی یہ ترکیب کتنی فصیح ہے مگر مقصود تو یہ تھا کہ فرعون کے قصہ میں خدا کی مدد کا بیان بھی اسی کے نام سے ہوا۔ (استغفر اللہ العظیم) یہ سخت واہیات ہے۔ اسی طرح آج کل یہ دستور شائع ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے احسانات وانعامات کا عنوان پیر کے نام سے قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے مریدین اپنے اوپر فضل واحسان خداوندی کے تذکرے کریں گے تو سارے الفاظ چھوڑ کر یوں لکھیں گے کہ "بفضل رحمان" اسی طرح ہمارے سلسلہ میں بعض لوگ خطوط میں "بامداد اللہ" لکھتے ہیں مجھے تو اس سے سخت نفرت ہے اور اس میں شرک کی بو آتی ہے۔ اب تو یہ صرف عادت ہے مگر یاد رکھو کہ چند روز کے بعد عبادت ہو جائے گی۔ غرض اس حدیث سے تبرکات وغیرہ کا قبر میں رکھنا جائز معلوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ملبوس شریف تبرکاً کفن میں رکھنے کے لیے عطا فرمایا ہے مگر ہم کو تبرک کی نیت سے کسی کو کوئی چیز اپنا ملبوس وغیرہ دینا جائز نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے اور اپنی برکت کو وحی سے جانتے تھے ہمارے اوپر کونسی وحی اتری ہے کہ ہم بھی بزرگ اور صاحب برکت ہیں خاتمہ ایمان پر ہو جائے تو بسا غنیمت ہے۔ میں نے ایک بار ایسی نادانی کی کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ اپنے کچھ حالات بطور سوانح کے لکھوا دیجئے' آپ نے جواب دیا کہ کیا خوب اپنے ہی منہ میاں مٹھو بنوں۔

واقعی اپنے کو بزرگ سمجھنا کیسے ہوسکتا ہے اور تبرک ہوتا ہے بزرگوں کا پس اتنا تبرک کیسے دیا جائے یہاں پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ مشائخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بعض دفعہ خود بخود بدون درخواست کے اپنے متعلقین کو اپنے تبرکات دیئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات تبرکا نہیں دیتے تھے کہ مرید کو یہ معلوم ہو جائے کہ شیخ کی میرے حال پر توجہ بہت ہے یا اس خیال سے دیتے ہیں کہ لینے والے کو اس میں برکت کا گمان ہوگا تو اس کو اس خیال سے نفع ہوگا۔ چنانچہ واقعی نفع ہوتا ہے۔ ایک نفع تو میں نے خود محسوس کیا ہے کیرانہ میں ایک گوجر تھے۔ حاجی عبداللہ بڑے بزرگ آدمی تھے انہوں نے مجھے ایک چھینٹ کا جبہ دیا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ جب تک میں اسے پہنے رہتا تھا معاصی کا خیال نہ آتا تھا بلکہ معاصی سے نفرت رہتی تھی شاید پیروں کے کوئی معتقد یہ سوال کریں کہ شیخ کے تبرک کو پہن کر پاخانہ میں جانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ جائز ہے البتہ اگر غلبہ ادب ہو تو واجب بھی نہیں اور ہر جائز کام کا کرنا ضروری ہی کیا ہے خود میری یہ حالت ہے کہ جب جب شریف تھانہ بھون میں آتا ہے تو اگرچہ اس مکان کی طرف جہاں وہ رکھا جاتا ہے پیر کرنا جائز ہے مگر غلبہ ادب کی وجہ سے مجھ سے اس طرف پیر نہیں کیا جا سکتا ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس سے احکام نہیں بدل سکتے۔ حکم شرعی وہی ہے کہ پیر کرنا اس کی طرف جائز ہے اور تبرکات کو پہن کر پاخانہ میں بھی جانا جائز ہے اور یوں کسی کو غلبہ ادب ہو وہ ایسا نہ کرے مگر حکم یہی ہے شرعی حکم کے سامنے نہ الہام کوئی چیز ہے نہ خواب نہ کشف کچھ ہے۔

حضرت نظام الدینؒ وقاضی ضیاء الدینؒ سنامی کی حکایت

شاہ نظام الدین اولیاء و قاضی ضیاء الدین سنامی رحمۃ اللہ علیہما کا قصہ ہے کہ حضرت سلطان جی سماع سنا کرتے تھے اور قاضی صاحب ان کو روکتے تھے۔ حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اچھا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں کہ میں حق پر ہوں جب بھی مانو گے' انہوں نے کہا کہ اچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادو' حضرت سلطان جی نے اپنی چادر اتار کر ان کو اوڑھادی' دیکھتے کیا ہیں کہ دربار رسالتؐ قائم ہے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مجمع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تشریف فرما ہیں اور ارشاد

فرمارہے ہیں کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ قاضی صاحب نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مجھے معلوم نہیں کہ میں کس حال میں ہوں ہوش میں ہوں یا بیہوش ہوں ایسی حالت کا سنا ہوا حکم معتبر نہیں ہوسکتا حکم وہی ہوگا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوش و حواس کی حالت میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے نقل فرمایا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ حضور سلطان جی نے چادر اتار لی اور کہا دیکھا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا' قاضی صاحب نے جواب دیا کہ سنا بھی ہم نے کیا عرض کیا تو صاحبو! شریعت کے احکام کے سامنے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت منامیہ کے وقت کی سنی ہوئی باتیں بھی حجت نہ ہوں گی کیونکہ احکام شرعیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح منقول ہیں جن میں ذرا شبہ کو گنجائش نہیں اور خواب یا کشف کی زیارت میں غلطی کا احتمال باقی ہے۔

عن كبشة قالت دخل علی رسول الله صلى الله عليه وسلم فشرب من ماء في قربة معلقة قائما فقمت الى فيها فقطعتها.

حضرت کبشہ صحابیہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے اور ایک لٹکے ہوئے مشکیزہ سے منہ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا میں کھڑی ہوئی اور دہانہ مشک کو کاٹ کر تبرکاً اپنے پاس رکھ لیا۔

قال القاضي عياض رحمة الله عليه في الشفاء ومن اعظامه صلى الله عليه وسلم اعظام جميع اسبابه واكرام مشاهده وامكنة من مكه والمدينة و معاهده و ملامسه عليه الصلوٰة والسلام وايضاً قال كانت في قلنسوته خالد بن الوليد شعرات من شعره صلى الله عليه وسلم فسقطت قلنسوته في بعض حروبه فشد عليها شدة انكسر عليه الصحابه لكثرة من قتل فقال لم افعلها بسبب القلنسوة بل لما تضمنت من شعر النبي صلى الله عليه وسلم لئلا اسلب بركتها وتقع في ايدى المشركين. الخ

خاص تبرکات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاملہ

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ شفاء میں لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں سے یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام متعلقات کی تعظیم کی جائے اور جس جگہ آپ تشریف لے گئے ہیں اس کا اکرم کیا جاوے اور مکہ مکرمہ مدینہ منورہ میں جن مکانات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کا انتساب ہے ان کا احترام کیا جاوے۔ ویسی ہی جن چیزوں کو آپ نے لمس کیا ہے نیز شفاء میں حضرت خالد بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ بعض لڑائیوں میں ان کی کلاہ سر پر سے گر پڑی تو اس کے لیے انہوں نے ایسا سخت حملہ کیا جو ان کے ساتھوں کو غیر معمولی معلوم ہوا کیونکہ اس حملہ میں بہت آدمی قتل ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے یہ حملہ ٹوپی کی وجہ سے نہیں کیا تھا بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے ان کی وجہ سے کیا تھا کہ مبادا کہیں میں ان کی برکت سے محروم نہ ہو جاؤں اور یہ مبارک بال کفار کے ہاتھ میں پہنچ جائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ چند کھجوریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دم کر دی تھیں جس کو انہوں نے ایک توشہ میں رکھ لیا تھا اور ان میں ایسی برکت ہوئی کہ ہمیشہ ان میں سے کھاتے رہے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ شہادت میں وہ ان کے پاس سے کھوئی گئیں جس کا ان کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ ان کا شعر بھی اس بارے میں مشہور ہے:

للنّاس هم ولي في اليوم همان   فقد الجراب وقتل الشيخ عثمانؓ

کہ لوگوں کو ایک ہی غم ہے اور مجھے آج دو غم ہیں توشہ دان کے کھوئے جانے کا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شہید ہونے کا' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس برکت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت ہو جانے کا غم تھا جو ان چھواروں میں تھی' عشاق کی یہی حالت ہوتی ہے کہ محبوب کی ذرا ذرا سی چیز پر جان دیتے ہیں۔

درمنزلے کہ جاناں روزے رسیدہ باشد   باخاک آستانش داریم مرحبائے

(کسی گھر میں میرا محبوب جس دن آ جائے تو میں اس کی مٹی کو روز روز مبارک کہوں)

عشاق کو تو اسی حب منزل محبوب کی بناء پر جنت کی بھی تمنا اسی طرح واشتیاق میں ہوگی کہ وہاں جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔ جنت میں گو راحت تو انشاء اللہ ملے ہی گی مگر عشاق کو جنت کی اصل تمنا اور آرزو زیادہ اسی لیے ہوتی ہے کہ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوگی تو گویا جنت بھی آپ ہی کی ذات بابرکات سے مقصود ہوگئی اور جنت تو جنت آپ کی تو یہ شان ہے کہ دنیا میں بھی جس حصہ زمین پر آپ ہوں وہ مقصود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "لااقسم بھذا البلدو انت حل بھذالبلد" اس کی تفسیر میں بعض مفسرین نے واؤ حالیہ قرار دیا ہے بس معنی یہ ہوں گے کہ میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اس حال میں کہ آپ اس میں مقیم ہیں یعنی آپ کی اقامت کی وجہ سے یہ شہر اس درجہ مکرم ہوگیا کہ خدائے تعالیٰ اس کی قسم کھاتے ہیں پس اس بناء پر کہ جب جنت میں داخل ہو جاؤ گے تو ایک خوشی تو ہوگی راحت ملنے اور غم کے زائل ہونے کی کہ اللہ کا شکر ہے دنیا کے مصائب سے نجات ہوگئی۔ چنانچہ حق تعالیٰ جنتیوں کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اہل جنت کہیں گے: "الحمدللہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکورا ن الذی احلنا دارالمقامة من فضله لایمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب" یعنی حمد وشکر کرتے ہیں ہم اللہ کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔ بیشک خدا تعالیٰ بڑے بخشنے والے بہت قدردان ہیں جس نے اپنے فضل سے ہمیں اقامت کی جگہ میں پہنچا دیا (یعنی جنت مثل دنیا کے دارالارتحال نہیں بلکہ دارالاقامۃ ہے) نہ ہمیں اس میں مشقت پہنچتی ہے نہ تھکن یہ خوشی تو طبعی ہوگی دوسری خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہوگی اور یہ خوشی عشقی ہوگی۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ کے ضمن میں تبریز کا ذکر فرماتے ہوئے مولانا شمس تبریز کو یاد کر کے تبریز کے حق میں کہتے ہیں:

ابرکی یا ناقتی طاب الامور	ان تبریزا مناجات الصدور
اسرحی یا ناقتی حول الریاض	ان تبریزا لعاالنعم المفاض
ساربانا بار بکشاز اشتراں	شہر تبریز ست و کوئے گلستاں

یہ اشعار زبان حال سے جنت میں جانے کے وقت پڑھنے کے قابل ہوں گے۔ پس ابرکی اور اسرحی یا ناقتی جب جنت میں پڑھیں گے تو وہاں ناقہ سے مراد جسم ہوگا یعنی اے بدن ٹھہر جا اور خوب کھا پی اب تعب نہیں رہا۔ مشقت کے دن گئے اب تبریز حقیقی آ گیا تو یہ جسم اونٹنی ہے جو روح کا مرکب ہے اور اس پر سوار ہو کر ہم اعمال کرتے ہیں اور اس مرکب ہونے کے لحاظ سے یہ اعضاء بھی قابل قدر ہیں کہ اعمال صالحہ کا ذریعہ ہیں۔ عارفین کو اپنے بدن کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک عارف کہتے ہیں:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　　کو دامت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(میں اپنی آنکھوں پر ناز کرتا ہوں کہ تیرے جمال کو دیکھتی ہیں اپنے پاؤں پر فدا ہوں کہ تیرے کوچے میں پہنچاتے ہیں، اپنے ہاتھوں کو ہر وقت ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ تیرے دامن کو میری جانب کھینچتے ہیں)

یعنی محبوب تک رسائی ہونے میں چونکہ ان کو دخل ہے اس وجہ سے یہ رتبہ ان اعضاء کا ہو گیا کہ یہ قابل بوسہ کے ہیں اور باعث ناز ہیں اور جب اس تعلق سے قطع نظر کر لی جائے تو اس حالت میں یہ اس کے مصداق ہیں جو دوسرے صاحب حال کہتے ہیں:

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود　　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ آپ کے حسین چہرے کی طرف بلا حائل کھینچتی ہیں)

یا جیسے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(تجھے دیکھنے کے لیے مجھے آنکھ کا سہارا لینا پڑتا ہے جو کہ اصل میں تیرا غیر ہے کہ وہ تیرے دیکھنے میں ایک طرح کا حائل ہے اسی طرح کان بھی تیری بات سننے نہیں دیتے)

یعنی میری نظر ہونے کے لحاظ سے یہ بھی غیر ہے اور قابل غیرت ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ کا عطیہ ہے قابل قدر و باعث فخر ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی بیتم کا مقصود ہونا

اسی اعتبار سے فرماتے ہیں:

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد ۔ تانہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میرے پاس آئیں اور کہیں کہ جان سپرد کرو تو جب تک تیرا دیدار نہ کرلوں جان سپرد نہ کروں)

پس ناقہ بدن کو من حیث آلۃ الوصول گویا جنتی بلسان حال خطاب کرتا ہے ابرکی یا ناقتی اور اسرجی یا ناقتی اور عجیب بات ہے کہ ان اشعار میں بھی حول الریاض آیا ہے اور جس آیت کا بیان ہو رہا ہے اس میں بھی فی روضۃ وہی مادہ واقع ہے۔ پس یہ عجیب تطابق ہے لفظاً بھی معنیً بھی اور فی روضۃ کے بعد جو یحبرون آیا ہے مضمون مقصود کا نام الحبور بھی اسی لیے رکھا گیا ہے۔ بہر حال جنت میں جانا حبور ہے تو جنت میں جانے کا سبب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم واتباع کی برکت ہے اصل الحبور رہے پھر بقیہ مضمون تبرکات کا معروض ہے۔ وایضاً۔

" قال القاضي وحكي عن عبدالرحمٰن السلمي عن احمد بن فضلويه الزاهد وكان من العزة الرماة انه قال مامست القوس بيدى الاعلىٰ طهارة منذبلغني ان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اخذ القوس بيده"

(قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تابعی کی حکایت بیان فرمائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان کو اپنے دست مبارک میں لیا ہے اس وقت سے بے وضو کمان کو میں نے کبھی ہاتھ میں نہیں لیا' اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے ادب کا کہ جس چیز کا ہاتھ میں لینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گیا اس کی مثل کو بھی بے وضو کبھی نہ چھوا' یہ تو سب کر سکتے ہیں کہ جس چیز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مس فرمایا ہے اس کو بے وضو ہاتھ میں نہ لیا جائے مگر یہ بات کہ اس کی نوع میں سے بھی کسی کو بے وضو نہ چھوا جائے یہ غایت ادب ہے۔

بعض محبین کی حکایت

"وايضاً قال القاضي عياض راى ابن عمر رضى اللّٰه تعالىٰ عنهما واضعاً يده على مقعد النبى صلى اللّٰه عليه وسلم من المنبر ثم وضعها علىٰ جبهته"

قاضی عیاض حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ منبر نبوی صلی اللہ علیہ

وسلم پر نشست گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مس کر کے اپنی پیشانی کو ملتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز ملبوس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مس کی گئی ہو اس میں بھی برکت ہوتی ہے مگر اس سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہیے کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لیے ہے اسی لیے تاکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہیں ان کی بھی تو قدر کرنا چاہیے ان میں بھی تو برکت ہے اس برکت کو بھی تو لینا چاہیے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیا برتاؤ تھا ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گیا ان ہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہیے اس سے زیادہ تعدی نہ کرنا چاہیے۔

بدعات کے لیے وقف ناجائز و باطل ہے

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریفہ کے لیے نذریں مانتے ہیں فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے نہیں ہو سکتی' عبادت خالق جل شانہ کے لیے خاص ہے۔ بحرالرائق میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لیے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہو گی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہو گا اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے' مجاوروں کو اس کا لینا' کھانا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ اصل عبارت یہ ہے:

"فی البحر النذر للمخلوق لا یجوز الا انه عبادة والعبادة لایکون للمخلوق وفیه الاجماع علی حرمة النذر للمخلوق ولا ینعقد ولا تشتغل الذمة منه وانه حرام بل سحت ولا یجوز لخادم الشیخ اخذه ولا اکله ولاالتصرف فیه بوجه من الوجود"

بعض لوگ جبہ شریف کے عرس وغیرہ کے لیے زمینیں وقف کرتے ہیں تو یاد رکھئے اگر وقف کرنے والے کی نیت اس وقف سے یہی ہے کہ ان بدعات وخرافات میں اس کا روپیہ صرف کیا جائے تب تو یہ وقف باطل ہے جائز نہیں اور وقف کرنے والا گنہگار ہے۔ "وفی العالمگیریة ومنها ان من شرائط صحته ان یکون قربة من ذاته وعندالتصرف الخ" یعنی صحت وقف کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس کام کے لیے وقف کیا گیا ہے وہ فی نفسہ بھی قربت ہو اور وقت تصرف کی بھی قربت ہو اور ظاہر ہے کہ عرس وغیرہ کا دلائل

شرعیہ سے حرام ہونا معلوم تو اس کی نیت سے وقف بھی صحیح نہ ہوگا اور نہ اس کے لیے چندہ دینا درست ہوگا۔ البتہ اگر اس نیت سے وقف کیا جائے کہ جو فقراء و مساکین اس کی زیارت کو حاضر ہوں ان پر صرف کیا جائے اور جو لوگ اس کے متولی ہوں وہ بھی بقدر حاجت اس میں سے لے لیا کریں تو یہ وقف صحیح ہے اور اس نیت سے خدام جبہ کو کچھ دینا بھی جائز ہے۔

جبہ شریف کیلئے نذریں ماننا حرام ہیں

غرض جبہ شریف کے لیے نذریں ماننا بالکل حرام ہیں اس سے مسلمانوں کو احتراز لازم ہے بعض لوگ نذر کے پیسے جبہ شریف کے اوپر لا کر رکھتے ہیں اور یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ معاذ اللہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں (استغفر اللہ العظیم) کیا یہ ناپاک چیزیں اسی قابل ہیں کہ جبہ شریفہ پر ان کو رکھا جائے اور یہ اعتقاد کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دست مبارک میں لیتے ہیں۔ واقعی جب ادب میں غلو ہوتا ہے تو بے ادبی ہونے لگتی ہے اور کرنے والوں کی آنکھوں پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ ان کو ذرا بھی عقل نہیں آتی' بھلا یہ گندے پیسے جو چمار اور بھنگیوں کے ہاتھوں میں بھی جاتے ہیں جبہ شریفہ پر رکھنے کے قابل ہیں' سچ کہا کسی نے توقع زوالا اذا قیل تم کو جب کوئی چیز کمال کو پہنچ جاتی ہے اب اس کے زوال کی توقع کرو کیونکہ کمال کے بعد آگے کوئی مرتبہ رہا نہیں' لامحالہ اب پیچھے کو لوٹیں گے۔ بالکل یہی حال ہو رہا ہے کہ ادب میں غلو کرتے کرتے اب بے ادبی کی طرف لوٹنے لگے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اعتدال سے ہر کام کرنا چاہیے اس مضمون کا پہلا جزو جو کہ تبرکات کے متعلق تھا ختم ہوا۔ اب دوسرا جزو کہ وہ بھی اسی مضمون کے متعلق ہے اور پھر دونوں جز مل کر ایک ہیں وہ بیان کرتا ہوں اور وہ دوسرا جزو گیارہویں کے متعلق ہے اس روز لوگ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں مناتے ہیں۔ اول تو "لاتتخذوا قبری عیداً"[1] (میری قبر کو عید نہ بناؤ) سے اس کا بھی رد ہو گیا کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا جب غیر متبدل یعنی قبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عید منانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کا عید بنانا کیسے جائز ہوگا۔

---

[1] (مسند احمد ۲: ۳۶۷، المصنف لابن ابی شیبۃ ۲: ۳۷۵)

گیارہویں کرنے والوں کو تاریخی غلطی

دوسرے یہ تاریخ حضرت کی وفات کی کسی مؤرخ نے نہیں لکھی نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کرلی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہیے' دوسرے اگر ہو بھی تو کیا تم حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے بھی خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ گیارہویں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کرتے تھے تو اس کو ہرگز وہ گوارا نہ کرسکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میری گیارہویں کی جائے۔ تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث اعظم کا میلاد بھی ہونے لگا' گویا بالکل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوات ہوگئے اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہوگی بڑے پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کردیں گے۔ گویا (نعوذ باللہ) وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں۔ نیز گیارہویں کرنے کو مال واولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں اس میں حضرت غوث اعظم سے دنیا کے لیے تعلق رکھنا ہوا یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہوگئے تھے اسی کے لیے ان سے تعلق کیا جائے۔

گیارہویں کی عملی اور اعتقادی خرابیاں

غرض گیارہویں کے اندر بھی عملی اور اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں اس کو چھوڑنا چاہیے اگر کسی کو حضرت غوث اعظم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دے یا بلا تعیین تاریخ وغیرہ غربا کو کھانا کھلا دے۔ اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں اور اس دوسرے حصہ وعظ کا نام کام الحضور الامور الصدور رکھتا ہوں اس میں صدور جمع ہے صدر کی جس کے معنے۔

ہیں عظیم الشان چونکہ اس میں تبرکات کی زیارت وغیرہ کا ذکر ہے اس لیے یہ نام مناسب ہے یہ تو ہر حصہ کا الگ الگ نام ہے پھر جی چاہتا ہے کہ مجموعہ کا نام بھی رکھ دیا جائے تو مجموعہ کا نام رأس الربیعین ہے وجہ اس نام کی یہ ہے کہ جز اول اس نام کا یعنی رأس بمعنی طرف ہے جس کا اطلاق کبھی طرف اول پر کبھی طرف اخیر پر آتا ہے اور آج کا دن ایک ماہ کا محتمل ختم اور دوسرے ماہ کا محتمل آغاز ہے اور جزو ثانی کے معنی ظاہر ہیں اور لطیفہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ نام اس سے پہلے والے وعظ کے نام کے بھی یعنی اساس الربیعین کے مناسب ہے اگر کوئی صاحب شائع کریں تو دونوں کو الگ الگ شائع نہ کریں کیونکہ میرا لطیف ربیعین کا ضائع ہو جائے گا اس کے متعلق میں نے ایک خواب کانپور میں سنا تھا۔ جب جامع مسجد کانپور کے وسیع کرنے کا خیال ہوا تو ایک مینار کو توڑنے کی رائے ہوئی تا کہ بیچ میں مینار واقع نہ ہو بلکہ مسجد کو بڑھا کر کنارہ میں نیا مینار تعمیر کیا جائے تو ایک شخص نے رات کو خواب میں دیکھا کہ دونوں مینار گلے مل کر رو رہے ہیں۔ اللہ اکبر جمادات میں بھی انس کا مادہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ دونوں وعظ باہم متناسب اور موزوں ہیں اور قریب قریب مضمون کے ہی ہیں اور ایک ہی وقت میں بیان ہوئے ہیں اس لیے ان میں بھی جدائی نہ کی جائے اگرچہ شرعاً جائز ہے۔

خلاصہ مضمون

سب مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ بڑی خوشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اس بات پر ہونی چاہیے کہ آپ کی برکت سے ہمیں ایمان اور اعمال کی توفیق ہوئی اور یہ خوشی جنت میں جا کر پوری طرح محسوس ہوگی جس کی آیت میں بشارت ہے۔ "فاما الذین امنوا وعملوا الصلحت فهم فی روضة یحبرون" اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین) اس سال یہ مضمون ربیع الاول کے بالکل اخیر میں ہوا جس میں منجانب اللہ یہ لطیفہ ہو گیا کہ وقت کا التزام نہ رہا اور ان شاء اللہ کبھی ایسا بھی ہوگا کہ اس کے متعلق بالکل ہی بیان نہ ہوگا تا کہ التزام کا بالکل وہم بھی نہ رہے۔ فقط (والحمدللہ رب العالمین)

اَلسَّلَام التّحقیق

مدرسہ سروٹ ضلع مظفرنگر میں ۱۲ شوال ۴۰ ہجری ۹ جون ۱۸۲۲ء کو ''ثمرات اسلام کامل'' کے موضوع پر تخت کے اوپر ایک کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ وعظ صبح ۶ بج کر ۳۹ منٹ پر شروع اور ۹ بج کر ۳۳ منٹ پر ختم ہوا۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ (مقیم میرٹھ محلّہ کرم علی) نے اسے قلمبند کیا جبکہ سامعین کی تعداد ۲۵۰ تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡکَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

فمن يرد الله ان يهديه يشرح صدره للاسلام ومن يرد ان يضله يجعل صدره ضيقاً حرجاً كانما يصعد فى السماء كذلک يجعل الله الرجس على الذى لايؤمنون وهذا صراط ربک مستقيماً قد فصلنا الآيات لقوم يذكرون لهم دارالسلام عند ربهم وهو وليهم بما كانوا يعملون ○ (الانعام آیت نمبر۱۲۵تا۱۲۷)

ترجمہ: ''بس جس شخص کو اللہ راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتے ہیں اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان پر چڑھنا چاہتا ہو اسی طرح اللہ ایمان نہ لانے والوں پر پھٹکار ڈالتا ہے اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہ (یعنی) اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتے ہیں ان کے اعمال کی وجہ سے۔''

یہ آیتیں جن کی تلاوت کی گئی ہے اس وقت ان میں سے اخیر آیت کا بیان مقصود ہے۔ اول کی آیتیں محض ربط کے واسطے پڑھی گئی ہیں کیونکہ ان کو مقصود کی توضیح اور تعیین میں دخل تھا۔ پرسوں کے بیان میں اسلام کی حقیقت اور اسلام حقیقی کی ترغیب دی گئی تھی اور اس کے متعلق مفصل کلام کیا گیا تھا۔

ثمرہ کا بیان موجب ترغیب ہے

ایک ذریعہ ترغیب کا یہ بھی ہوتا ہے کہ مقصود کا ثمرہ بیان کیا جاوے۔اس کے سننے سے اور اطلاع ہونے سے رغبت پیدا ہوتی ہے اس واسطے مناسب معلوم ہوا کہ جہاں اسلام کا بیان کیا گیا وہاں اس کا ثمرہ بھی بیان ہوتا کہ رغبت اسلام حقیقی کی پیدا ہو اور اس آیت میں وہ ثمرہ مذکور ہے اس واسطے اس آیت کو بیان کے لیے اختیار کیا گیا اور وہ ثمرہ اخیر کی آیت میں ہے تو مقصود بالذات وہ ہی اخیر کی آیت ہوئی اور پہلی دو آیتیں اس واسطے تلاوت کی گئیں کہ معلوم ہو کہ اس اخیر آیت میں جو ثمرہ مذکور ہے وہ اسلام کا ہی ہے۔پہلی آیت میں تو اسلام کا لفظ ہی موجود ہے اور دوسری آیت میں اسلام کا لقب صراط مستقیم ہے اور تیسری یہ اخیر کی آیت ہے جو اس وقت مقصود بالبیان ہے اس میں ثمرہ مذکور ہے۔پہلی آیت یہ ہے "فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام" (بس جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتے ہیں) اس میں صریح لفظ اسلام موجود ہے اور دوسری آیت یہ ہے "وھذا صراط ربک مستقیما" (اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے) ھذا اسم اشارہ ہے اس کے لیے مشار الیہ چاہیے وہ مشار الیہ یہاں سوائے اسلام کے کچھ نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ جو اسلام ہے وہی صراط مستقیم ہے۔ایک جگہ اس کو اسلام کہا گیا دوسری جگہ صراط مستقیم اسلام اس کا اسم ہے اور صراط مستقیم لقب تو اسم بھی مذکور ہوا اور لقب بھی۔دو آیتوں میں تو یہ ہوا اور بعد میں تیسری آیت میں تفریع کے طور پر نتیجہ بیان کیا گیا۔وہ تیسری آیت یہ ہے: "لھم دارالسلام عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون" (ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتے ہیں ان کے اعمال کی وجہ سے) اس میں ضمیریں جمع کی ہیں جو راجع ہیں من کی طرف من گو لفظاً مفرد ہے مگر معناً جمع ہے لہٰذا جمع کی ضمیر اس کی طرف پھیرنا جائز ہے جیسا کہ نحو جاننے والے سمجھتے ہوں گے۔حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جس کو ہدایت کرنا حق تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اس کو اسلام کے متعلق شرح صدر دے دیتے ہیں اور دوسرے جملہ میں اس کا مقابل مذکور ہے کہ جس کو گمراہ کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتے ہیں کہ اسلام کے متعلق اس کو

اطمینان نہیں ہوتا اور اس حالت کو رجس فرمایا اور اسلام کی یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ صراط مستقیم یعنی سیدھی راہ ہے اور اس سب کے بعد نتیجہ بیان فرمایا "لھم دار السلام" یعنی جو لوگ اس من کے مصداق ہیں یعنی جن کے ساتھ حق تعالیٰ کا ارادہ اچھا ہے اور ان کو ہدایت کی گئی ہے ان کے واسطے دار السلام ہے مجھے اس وقت مقصود اسی نتیجہ کا بیان کرنا ہے۔

آیات قرآن میں ربط ہے

اور باقی آیتوں کا ترجمہ اور جو کچھ بیان ہوا وہ ارتباط عبارت کے لیے تمہید تھی مقصود میں اس کو کچھ زیادہ دخل نہیں اسی واسطے اس تمہید کا عنوان طالب علمانہ بیان ہوا جو غالباً عام فہم نہ ہوگا۔ اس تمہید کی ضرورت یہ ہے کہ آگے چل کر مقصود کی توضیح اچھی طرح ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ قرآن شریف میں تناسق اور ارتباط ہے اور یہ بہت ظاہر ہے گو وہ ارتباط ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتا اور بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی آیتوں میں باہم ربط نہیں ہے ابھی ایک آیت میں کچھ بیان ہے اور ابھی دوسری میں کچھ بیان ہونے لگا۔ یہ خیال غلط ہے قرآن کی آیات اور الفاظ میں ایسا ربط ہے کہ کسی کلام میں نہیں ہو سکتا اور کیسے نہ ہو قرآن تمام کتابوں اور کلاموں پر بلاغت میں فوقیت رکھتا ہے اور کلام میں یہ بڑا عیب ہوتا ہے کہ بے جوڑ ہو ایک معمولی کلام میں بھی یہ عیب نہ ہونا چاہیے۔ چہ جائیکہ قرآن جیسے ابلغ الکلام میں اس ارتباط ہی کے بیان کے لیے اوپر کی آیتیں پڑھی گئیں۔

مسلمان ہونے کا ثمرہ

اب اصل مقصود بیان کیا جاتا ہے اور وہ ثمرہ ہے اسلام کا۔ وہ ثمرہ کیا ہے "**لھم دار السلام عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون**" میں اول ترجمہ کیے دیتا ہوں جس سے اجمالاً مقصود معلوم ہو جاوے گا۔ ترجمہ یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کے لیے سلامتی کا گھر ہے خدائے تعالیٰ کے پاس ایک ثمرہ تو یہ ہوا اور دوسرا ثمرہ دوسرے جملہ میں اور دونوں کا حاصل ایک ہی ہے یا یوں کہا جاوے کہ ایک نہیں ہے مگر دونوں متلازم ہیں اور وہ یہ ہے "**وھو ولیھم بما کانوا یعملون**" یعنی حق تعالیٰ کو ان سے علاقہ محبت کا ہے۔ ان اعمال کی وجہ سے جن کو وہ کیا کرتے تھے دنیا میں، یہ ترجمہ ہوا۔ اس میں دو بشارتیں ہیں اسلام والوں کے لیے ایک سلامتی کا گھر ملنا اور ایک یہ کہ اللہ جل جلالہ کو ان سے علاقہ محبت کا ہے۔

ثمرات کا اصل مقصود

غور سے دیکھا جاوے تو ان دونوں ثمروں کا حاصل ایک ہی ہے کیونکہ مقصود کا حاصل دو امر ہوتے ہیں۔ ایک مضرات سے بچنا اور دوسرا منافع کا حاصل ہونا۔ چنانچہ ساری دنیا کی کوششیں کسی مقصود کے حاصل کرنے میں اسی واسطے ہوتی ہیں کہ تکلیفوں سے بچا جاوے اور راحت کو حاصل کیا جاوے۔ ہر کام میں یہی قاعدہ ہے' تجارت میں زراعت میں' نوکری میں' سب میں دو باتیں حاصل کی جاتی ہیں' تجارت میں آدمی یہ ہی چاہتا ہے کہ مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ رأس المال محفوظ رہے اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو' یہ مضرت سے بچنا ہوا اور اس کے محفوظ رہنے کے ساتھ کچھ مال بڑھ جاوے' یہ منفعت کا حاصل ہونا ہوا۔ علیٰ ہذا زراعت میں بھی یہ ہی دو باتیں دیکھی جاتی ہیں' بیج ڈالا جاتا ہے اس غرض سے کہ اتنا یہ ہم کو لوٹ کر مل جاوے یہ تلف نہ ہو جاوے یہ دفع مضرت ہے اور اس تخم کے ساتھ کچھ اور بھی پیدا ہو جاوے یہ حصول منفعت ہے۔ ایسے ہی نوکری میں ہے کہ یہی کوشش کی جاتی ہے کہ کچھ آمدنی ہو اور تنگدستی کی تکالیف دور ہوں یہ دفع مضرت ہے اور عیش و آرام سے بسر ہو یہ حصول منفعت ہے۔ غرض جس کام میں بھی آپ غور کریں گے تو مقصود کا حاصل یہی دو امر ملیں گے دفع مضرت اور حصول منفعت بنا بریں اسلام کا حاصل بھی یہی دو امر ہوں گے دفع مضرت اور حصول راحت ان دونوں کو ایک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کہ مقصود کے دونوں جز ہیں' دونوں مل کر مقصود پورا ہوتا ہے اور ان کو دو بھی کہا جائے تو صحیح ہے کیونکہ دو چیزیں تو ہیں ہی مگر قصد میں دونوں متلازم ہیں اس وجہ سے کہ دونوں کا قصد کیا جاتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ ایک کا قصد کیا جائے اور ایک کا نہ کیا جائے' غرض ایک کہو دونوں کو یا دو کہو اور دونوں کو متلازم کہو یہ ہی ثمرے ہوتے ہیں ہر کام کے چنانچہ اسلام کے ثمرے بھی یہی دو ہیں۔ دفع مضرت اور حصول راحت لفظ سلام میں اشارہ ہے اول کی طرف یعنی ان سے تمام تکالیف دور ہو جائیں گی اور لفظ "وھو ولیھم" میں اشارہ ہے دوسرے کی طرف یعنی ان کو راحت حاصل ہوگی۔ یہ حاصل ہے دونوں ثمروں کا۔ اس سے وجہ معلوم ہوگئی دونوں آیتوں کے پڑھنے کی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ دونوں میں اسلام کے ثمرے مذکور ہیں اور اسی کا بیان اس وقت مقصود ہے۔ پہلے بیان میں اسلام کامل کی حقیقت بتلائی گئی تھی اور آج اسلام

کامل کا ثمرہ بتایا جائے گا اس ثمرہ کا بیان آیت میں اس طرح سے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمرہ علیٰ وجہ الکمال حاصل ہوگا۔ دفع مضرت ہوگا تو اس طرح کہ کوئی مضرت باقی نہ رہے گی اور حصول راحت ہوگا تو وہ بھی اس طرح کہ کوئی راحت چھوٹ نہ جائے گی۔ اس آیت میں ایسے الفاظ اور قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمرہ کامل حاصل ہوگا۔ مثلاً یہ کہ دو ثمرے حق تعالیٰ نے بیان فرمائے اور یہ دو ثمرے ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی ثمرہ ہو ہی نہیں سکتا کسی کام کا اس واسطے کہ دو ہی چیزیں مقصود ہوتی ہیں۔ دفع مضرت اور حصول راحت اور ان دونوں کا اس میں ذکر ہے اور ان کے سوا اور کوئی ثمرہ ہوتا نہیں تو حاصل یہی تو ہوا کہ پورا ثمرہ ملے گا اور کوئی ثمرہ ایسا نہ رہے گا جو نہ ملے کیونکہ ثمرہ کے دو ہی فرد ہیں اور دونوں حاصل ہوئے تو اور کیا باقی رہا اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کی نسبت کہا جائے کہ اس کے پاس سونا بھی ہے اور چاندی بھی ہے اور قیمتی مال کے فرد یہی دو ہوں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اس کے پاس ہر قسم کا مال موجود ہے اور کوئی فرد مال کا ایسا نہیں رہا جو اس کے پاس نہ ہو۔ علیٰ ہذا جب ثمرہ کے فرد یہی دو ہیں اور دونوں کے حصول کو ظاہر کر دیا گیا تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ کوئی ثمرہ ایسا نہیں رہا جو ان کو حاصل نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ جس کو اسلام حاصل ہے اس کو ایسے ثمرات آخرت میں ملیں گے کہ کوئی ثمرہ ان سے باہر نہ ہوگا اور واقعی آخرت ایسی ہی جگہ ہے جہاں کسی بات کی کمی نہیں۔ بس خدا تعالیٰ اسلام نصیب فرماویں اور اس پر خاتمہ کر دیں پھر وہاں کسی بات کی کمی نہیں۔

مختلف ثمرات آخرت پر ایک اشکال کا جواب

اب یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے کہ دعویٰ کیا گیا کہ آخرت میں اہل اسلام کو ثمرات کامل عطا ہوں گے کوئی مضرت باقی نہ رہے گی اور کوئی راحت نہ چھوٹے گی اور یہ بات مسلم ہے کہ آخرت میں اہل جنت کے درجات بھی مختلف ہوں گے کوئی اعلیٰ درجہ کا جنتی ہوگا اور کوئی کم درجہ کا۔ تو اگر یہ بات ہے کہ وہاں کے ثمرات میں کسی قسم کا نقصان نہیں تو لازم آئے گا کہ کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہ ہو بلکہ سب کے درجات کامل ہی ہوں حالانکہ فرق مراتب ہوگا اور فرق مراتب کے معنی سوائے اس کے کیا ہیں کہ ایک پاس کے پاس کوئی شے زائد ہے اور ایک کے پاس کم جس کے پاس کم ہے اس کا ثمرہ ناقص ہوا یہ اشکال ہے۔

دنیا کو آخرت کے ساتھ کیا نسبت ہے

اس کا جواب سنئے۔ پہلے ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ ہے کہ دو عالم ہیں دنیا اور آخرت' ان دونوں میں نسبت کیا ہے؟ حدیث میں ان کی نسبت ایک مثال کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک انگلی سمندر میں ڈالی جائے تو اس میں کچھ پانی سمندر کا لگ جائے گا جو نسبت اس انگلی میں لگ جانے والے پانی کو سمندر کے پانی کے ساتھ ہے یہی نسبت دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پانی کو سمندر کے پانی کے ساتھ کیا نسبت ہے کہ کچھ بھی نہیں ہے اگر اس کا حساب لگاویں تو سینکڑوں برس چاہئیں۔ مثلاً وہ پانی ایک رتی بھر ہے تو سمندر کے پانی میں سے رتی رتی بھرا الگ کیا جائے تب دونوں کی نسبت معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے عمر نوح بھی کافی نہیں ہو سکتی' اللہ اکبر سمندر کس قدر بڑی چیز ہے کہ اس نے تمام عالم کو گھیر رکھا ہے دریا کے سفر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خشکی کا حصہ بہت کم ہے اور تری کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ پیمائش کرنے والوں نے ثابت کیا ہے کہ تین حصے دنیا کو سمندر نے گھیر رکھا ہے اور ایک حصہ خشکی ہے یہ تو پھیلاؤ ہے پھر گہرائی اس قدر کہ اکثر جگہ کئی کئی میل ہے تو اتنے بڑے پانی کو خیال کیجئے اس میں سے اگر ایک ایک رتی الگ کی جاوے تو صدہا برس چاہئیں۔ آپ نے اندازہ کر لیا کہ اس انگلی میں لگے ہوئے پانی کو سمندر کے پانی کے ساتھ کیا نسبت ہے۔ تو فرماتے ہیں یہی نسبت ہے دنیا کو آخرت کے ساتھ اور یہ مثال بھی ہمارے سمجھانے کے واسطے ہے ورنہ حقیقت میں صرف تخمینی ہے اور دنیا کو آخرت کے ساتھ یہ نسبت بھی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ انگلی میں لگا ہوا پانی گو کتنا ہی قلیل اور لاشے ہے اور سمندر کے پانی کے سامنے کالعدم ہے مگر پھر بھی سمندر کا پانی اور یہ پانی ہیں تو دونوں متناہی اگر کوئی محنت کرے اور رتی رتی بھر پانی کو الگ کرے تو عقل اس بات کو مانتی ہے کہ سمندر کا پانی اس تجربہ سے کسی نہ کسی دن ختم ضرور ہو جائے گا اور کچھ نہ کچھ نسبت اس پانی کو اس پانی کے ساتھ ضرور نکلے گی' چاہے وہ کتنی ہی کم سے کم ہو بخلاف دنیا اور آخرت کے کہ ان دونوں میں نسبت متناہی اور لامتناہی کی ہے کہ دنیا ختم ہو جانے والی ہے اور آخرت کبھی ختم ہو جانے والی نہیں۔ اہل حق کا عقیدہ ہے کہ دنیا ایک دن ختم ہو جاوے گی البتہ اہل باطل

نے کہا ہے کہ دنیا ابدی ہے مگر اہل حق کا عقیدہ اس کے خلاف ہے اور آخرت اہل حق کے نزدیک ابدی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی ہر چند کہ طویل عرض مکانی آخرت کا بھی تمنا ہی ہے مگر اس کے بظاہر زمانی کی کوئی حد نہیں' نصوص میں اس کی تصریح موجود ہے۔ خلدین فرمایا ہے اور ابدا فرمایا ہے جس کا مطلب سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہاں فنا نہیں اس کے سوا اور نصوص بالکل صاف صاف اس مضمون کے موجود ہیں غرض کہ یہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ دنیا کے بعد پھر فنا نہیں نہ جنت کو نہ دوزخ کو یہ مقدمہ ہوا جس کا حاصل یہ ہے کہ آخرت کی کوئی چیز بھی فانی نہیں تو شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم ہے کہ اہل جنت میں فرق مراتب ہوگا مگر ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا اور غیر فانی ہوگا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ میں فرق ہوگا مگر ادنیٰ بھی ایسا ہوگا "تشتهيه الانفس وتلذ الاعين" (جو دل چاہے گا ملے گا اور آنکھوں کو لذت ملے گی) اس پر صادق ہوگا تو ہر شخص کے لیے ثمرہ کامل ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ ادنیٰ جنتی کو بھی ہر وہ چیز ملے گی جو وہ چاہے مگر وہ چاہے گا وہی جو اس کی مرتبہ کی موافق ہو اور اس درجہ میں بھی وہ چیزیں ہوں گی جو اس دنیا اور ہزار دنیا سے بہتر ہوں گی۔ اس اعتبار سے بھی کہ دنیا کی چیزوں سے اوران سے کچھ نسبت ہی نہیں اور اس اعتبار سے بھی کہ دنیا کی چیزیں فانی ہیں اور وہ فانی نہیں اور اسی واسطے اس کو خیر اور ابقی کہا گیا ہے جب یہ ہے تو ان میں باہم فرق ناقص کامل کا نہ ہوگا بلکہ کامل و اکمل کا ہوگا۔ پس اشکال کا جواب ہوگیا اور گو آخرت کے دو حصے ہیں ایک تکلیف کا اور ایک راحت کا یعنی جنت اور دوزخ اور دونوں کو نہیں کہہ سکتے پھر خیر و ابقی کے کیا معنی سو سمجھے یہاں صرف ایک حصہ کا بیان کرنا ہے یعنی جنت کا اور حق تعالیٰ نے بھی اکثر جگہ لفظ آخرت سے یہی مراد لی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے "والآخرہ خیر و ابقی" (اور آخرت بہتر اور باقی ہے) لفظ خیر بتلا رہا ہے کہ آخرت سے ایک ہی حصہ یعنی جنت مراد ہے کیونکہ دوسرا حصہ یعنی دوزخ تو خیر ہے ہی نہیں اس طرح بہت جگہ لفظ آخرت آیا ہے اور مراد اس سے صرف جنت ہے اب خیر اور ابقی کے معنی بھی سمجھ لینا مناسب ہے سو یہ بھی خیال کر لینے کی بات ہے کہ آخرت کے لیے ابقی سے مراد تو خلود ہے یعنی کبھی ختم ہی نہ ہوگی اور خیر سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز وہاں کی دنیا کی چیزوں کی بہ نسبت بدرجہا اچھی ہے گو نام وہاں کی چیزوں کے دنیا کے چیزوں کے سے ہیں مگر ان سے ان کو کچھ

نسبت ہی نہیں۔ مثلاً آیا ہے "فاکھة ونخل ورمان" یعنی جنت میں میوے ہوں گے اور کھجور کے درخت ہوں گے اور انار ہوں گے اور آیا ہے "فیها انهار من ماء غیر آسن" یعنی پانی کی نہریں ہوں گی اور آیا ہے کہ دودھ کی نہریں ہوں گی اور شہد کی نہریں ہوں گی اور شراب کی نہریں ہوں گی نام ان سب چیزوں کے دنیا ہی کی چیزوں کے سے ہیں مگر وہ چیزیں دنیا کی سی نہیں ہیں نہ وہاں کا میوہ دنیا کا سا میوہ ہے اور نہ وہاں کی کھجور دنیا کی سی کھجور ہے اور نہ وہاں کا انار دنیا کا سا انار ہے اور نہ وہاں کا پانی دنیا کا سا پانی ہے۔ چنانچہ اس کی صفت فرمائی' غیر آسن یعنی خراب نہ ہونے والا دنیا کا پانی تھوڑے عرصے میں متغیر ہو جاتا ہے اور وہ کبھی متغیر نہ ہوگا اور نہ وہاں کا دودھ دنیا کا سا دودھ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "وانهار من لبن لم یتغیر طعمه" یعنی اس دودھ کا مزا نہ بدلا ہوگا دنیا کا دودھ باسی ہونے سے بھی خراب ہو جاتا ہے اور وہاں کا دودھ ہزاروں برس گزرنے سے بھی ویسا ہی رہے گا۔

شراب طہور کی صفت

اور نہ وہاں کی شراب دنیا کی سی شراب ہے وہاں کی شراب وہ ہے جس کو دنیا میں کسی نے دیکھا ہی نہیں' دنیا کی شراب ناپاک ہے اور بدمزہ ہے اور وہ شراب بدمزہ نہیں بلکہ لذة للشاربین اس کی صفت ہے اور طہور ہے طہور صیغہ مبالغہ کا ہے یعنی بہت پاک کرنے والی کہ سینہ اور روح کو پاک صاف کر دیں گی دنیا کی شراب نشہ لاتی ہے اور حواس اور عقل کو مکدر کرتی ہے اور وہ نشہ نہیں لاتی اور حواس اور عقل کو اور زیادہ صاف کرنے والی ہے حق تعالیٰ نے اس کو صرف طاہر ہی نہیں فرمایا بلکہ طہور فرمایا بمعنی مطہر یعنی دوسری چیز کو بھی پاک کر دینے والی اس سے اس کا خود طاہر ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہو گیا کیونکہ جو چیز دوسرے کو پاک کرتی ہے وہ خود ضرور پاک ہوگی غرض وہاں کی کسی چیز کو دنیا کی کسی چیز سے سوائے شرکت اسمی کے کچھ نسبت نہیں جن پھلوں کے نام آئے ہیں دنیا میں بھی گو وہ پھل موجود ہیں مگر وہاں کے پھلوں سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے اسی طرح وہاں عورتیں بھی ہیں جن کو حور عین فرمایا گیا ہے ایسی عورتیں اس عالم میں کہیں بھی موجود نہیں۔ غرض وہاں کی کسی چیز کو دنیا کی کسی چیز سے کچھ مشابہت نہیں یہ حقیقت ہے خیر کی۔

اشیاء جنت کی حقیقت

یہاں ایک اور مضمون ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جنت کی چیزوں کو دنیا کی چیزوں سے اچھا کہنے کے معنی یہ نہیں کہ چیزیں جنت میں وہی ہیں جو دنیا میں ہیں مگر اعلیٰ درجہ کی ہیں جیسے دنیا کی چیزوں میں یہی فرق ہوتا ہے ایک میلا پانی اور ایک صاف ستھرا چھنا ہوا پانی کہ حقیقت دونوں کی ایک ہے صرف وصف میں فرق ہے بلکہ اچھا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جنت کی چیزوں کی حقیقت ہی دوسری ہے اس حقیقت کی چیز دنیا میں موجود ہی نہیں۔ رہا یہ کہ پھر ان کا نام دنیا کی چیزوں کا کیوں ہے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اور کوئی عنوان ان سے تعبیر کرنے کا نہیں اگر کوئی عنوان ہے تو یہی ہے جو دنیا کی چیز کا ہے بایں معنی کہ اگر اس سے کچھ مناسبت اور قرب ہے صورتاً یا کسی معنی کو تو فلاں دنیا کی چیز کو ہے اس لحاظ سے اس کے اوپر اس کا نام اطلاق کر دیا۔ مثلاً انار ایک چیز ہے جو دنیا میں موجود ہے اور اس کے افراد میں سے بھی وہ فرد لیجئے جو سب سے بڑھیا ہو اور انار جنت میں بھی موجود ہے جیسا کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے لیکن دونوں میں کچھ بھی علاقہ نہیں سوائے اس کے کہ صورتاً ایک کہے جاویں۔ یہ مضمون ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دنیا اور جنت کی نعمتوں کا صرف نام ہی مشترک ہے ورنہ وہاں اور چیزیں ہیں جن کا خیال بھی نہیں آ سکتا بلکہ یہ مضمون حدیث میں ہے وہ یہ ہے "**اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر**[1]" یعنی فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں کی چیزیں ایسی ہیں جو یہاں موجود نہیں ورنہ کوئی آنکھ تو دیکھتی اور نہ کبھی ہم سے پہلے زمانہ میں دنیا میں پیدا ہوئیں ورنہ ان کا ذکر تو کان سے سنتے بلکہ ان کو یہاں کی چیزوں سے اس قدر مغایرت ہے کہ خیال بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا اس کے معنی یہی تو ہوئے کہ وہاں کی چیزیں دنیا سے علیحدہ ہی ہیں وہاں کا انار دنیا کا سا انار نہیں ہے وہاں کی کھجور دنیا کی سی کھجور نہیں ہے وہاں کا پانی دنیا کا سا پانی

---

[1] (مسند احمد ۲: ۴۳۸، الدر المنثور ۵: ۱۷۶)

نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کے انار کو دنیا کے پھلوں میں سے کسی پھل سے اگر کچھ مشابہت ہے تو انار سے ہے اس واسطے اس کو انار کہا گیا ورنہ وہ ایسی چیز ہے جس کی حقیقت بلا کھائے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ علیٰ ہذا وہاں کے پانی کا نام بھی پانی آیا ہے اس معنی کو کہ اگر کسی چیز سے اس کو مشابہت ہے تو پانی سے ہے اس واسطے اس کو پانی فرما دیا باقی خدا جانے کیا ہے حقیقت پینے سے ہی معلوم ہوگی آیات میں بعض جگہ یہ مضمون بہت وضاحت کے ساتھ موجود ہے مثلاً وہاں کے برتنوں کی نسبت آیا ہے "کانت قواریرا" یعنی وہ برتن شفاف ہوں گے جیسے بلور کے برتن کہ ادھر کی چیز ادھر سے نظر آئے گی اور اس سے آگے فرمایا ہے "قواریر من فضة" یعنی وہ شفاف برتن چاندی کے ہوں گے ان کو قواریر بھی فرماتے جاتے ہیں اور فضہ بھی فرماتے جاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ برتن ہوں گے تو چاندی کے مگر شفاف ہوں گے۔ مثل شیشہ کے تو شفاف چیز واقع میں چاندی کہاں ہوئی دنیا میں کونسی چاندی ایسی صاف ہے عمدہ سے عمدہ چاندی اینٹ کی مانی جاتی ہے مگر شفاف وہ بھی نہیں اور وہاں کی چاندی ایسی ہوگی جس میں نظر آر پار ہو جائے گی اس سے یہ ثابت ہوا کہ بس نام چاندی کا ہے اور حقیقت کچھ اور ہے چاندی اس کو اس وجہ سے کہہ دیا ہے کہ دنیا کے اگر کسی جسم سے اس کو مشابہت ہے تو چاندی کے ساتھ ہے۔

حور کی صفت

اور مثلاً وہاں کی عورتیں جو حور کہلاتی ہیں ان کا نام سن کر خیال ہوتا ہے کہ دنیا کی حسین عورتوں کی نوع سے ہوں گی خود دنیا میں بھی ایک سے ایک حسین موجود ہیں مگر حدیث میں جو ان کی صفات آئی ہیں ان کو سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ حور کسی اور ہی نوع سے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر حور عین کے کپڑے کا ایک کونہ دنیا میں لٹکا دیں تو اس کی روشنی سے سورج اور چاند ماند ہو جائیں جس کے کپڑے کا یہ حسن ہو اس کی ذات کا کیا حسن ہوگا اس کا حسن تو وہم و گمان سے باہر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ان کے حسن کی نسبت آیا ہے "یری مخ سوقهن من ورائهن" یعنی ان کا جسم ایسا صاف شفاف ہوگا کہ کپڑوں کے اندر سے اور کھال کے اندر سے اور ہڈی کے اندر سے پنڈلی کا گودا نظر آئے گا۔ یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ

سچی بات ہے کیونکہ حدیث میں آ چکی ہے۔ قرآن و حدیث میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا سچی سچی اور سیدھی باتیں بیان ہوتی ہیں حور واقع میں ایسی ہی ہوگی یہ خبر ایسی نہیں ہے جیسے کہ یہاں ہم نے سنا تھا کہ ایک حسین آدمی ایسا ہے کہ جب وہ پان کھاتا ہے تو اس کا رنگ گلے میں اترتا نظر آتا ہے۔ یہ قصہ غلط ہے بھلا دنیا میں ایسا کون ہوسکتا ہے آخر گلے میں اوپر کھال ہے اس کے نیچے گوشت ہے اس کے نیچے زخرے کی ہڈیاں ہیں ایسی بھی کیا لطافت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حاجب نہ ہوا ایک جلد ہی شاع نظر کو روکنے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ کہ تین تین چیزیں ہوں۔ غالباً کسی نے مبالغہ سے کام لیا ہے بہر حال جو یہاں مبالغہ ہے وہ وہاں حقیقت ہوگی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہاں کے حالات میں اور یہاں کے حالات میں بڑا فرق ہے وہاں کے حالات یہاں ذہن میں آ ہی نہیں سکتے اس واسطے کہ ان کی کوئی نظیر کبھی نظر سے نہیں گزری' اس دقیقہ سے غافل ہونے کے سبب لوگوں نے حور و محبوبان دنیا کی طرح سمجھ لیا اور بعضوں نے تو یہاں تک بیہودگی کی کہ براہ تمسخر گھوسنوں سے اور کشمیر کے چکلے کی رنڈیوں سے تشبیہ دی (نعوذ باللہ) بات یہ ہے کہ لوگوں میں مادہ قیاس الغائب علی الشاہد کا ہے اسی لیے حور کو بھی اگر قیاس کیا تو اس پر کہ جس کو دیکھا ہے یا جو اپنے خیال میں ہے اب جن کے خیالات گندے ہیں رنڈیوں اور گھوسنوں تک ان کا ذہن پہنچا۔

خاورنامہ

اس قیاس الغائب علی الشاہد پر یاد آیا کہ کانپور میں ایک شخص کے گھر میں ایک قلمی کتاب تاریخی تھی اس کا نام خاورنامہ تھا اس میں ہر واقعہ کی متعلق تصویریں تھیں حتیٰ کہ معراج کا بیان تھا تو اس میں بھی تصویریں تھیں کہ یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے آئے اور یوں آسمان پر لے گئے اور یوں سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے اور یوں جبریل علیہ السلام ساتھ تھے اور یوں میکائیل علیہ السلام ساتھ تھے اور یوں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی اور یوں جنت دیکھی اور یوں دوزخ دیکھا اور ان سب کی تصویریں۔ یہ خبط ہوگیا ہے لوگوں کو اول تو تصویر بنانا ویسے ہی منع ہے پھر ایسی مقدس ذاتوں کی "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" اس میں مصلحت یہ بیان کی جاتی ہے کہ قصہ اچھی طرح سمجھ میں آسکے اس طرح کہ خبر کے ساتھ واقعہ کی صورت بھی پیش نظر ہو۔

تصاویر بنانے میں ممانعت شرعی

سبحان اللہ کیسی شاندار مصلحت ہے کس درجہ بے باکی اور جرأت کی بات ہے کہ اس مہمل مصلحت کے لیے ممانعت شرعی کا لحاظ نہ کیا جاوے۔ یوں تو کوئی کام بھی کسی نہ کسی مصلحت سے خالی نہیں حتیٰ کہ چوری ڈاکہ زنا سب میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور فائدہ ضرور ہے مثلاً کم سے کم کرنے والے کا دل خوش ہونا تو چاہیے کہ اس مصلحت کے لیے ان افعال سے بھی باز نہ رہا جائے اور منع نہ کیا جائے۔ خیر یہ تو شرعی غلطی ہے مگر ایک حسی غلطی یہ ہے کہ ان سے کوئی پوچھے کہ یہ تصویریں بنائیں کیسے جس چیز کو دیکھا نہیں اس کی صورت کیسے قائم کی' اس کی بنا وہی قیاس الغائب علی الشاہد ہے یہ خبط پہلے بھی تھا لوگوں کو مگر اب زیادہ ہے۔

ایک فقہ کی باتصویر کتاب

اب اس میں اس قدر وسعت کی گئی ہے کہ ایک فقہ کی کتاب میں بھی تصویریں چھاپی ہیں وضو کا بیان تھا تو اس میں تصویر تھی کہ یوں بیٹھو اور یوں لوٹا رکھو' نماز کا بیان آیا تو اس میں بھی تصویر بنادی کہ یوں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں' یوں رکوع میں جاؤ' یوں سجدہ کرو' یوں بیٹھو۔ جنازہ کی نماز کا بیان آیا تو اس میں بھی تصویریں بنادیں کہ ایک چارپائی پر مردہ رکھا ہوا ہے اور اس کے مقابل امام اور مقتدی صف باندھے کھڑے ہیں۔ کیا خرافات ہے اگر یہی بات ہے کہ بلا تصویر بنائے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو اپنے پاخانہ پھرنے کی تصویر بھی بنا کر رکھو تا کہ لڑکے اور بچے اس کو دیکھ کر پاخانہ پھرنا سیکھیں۔ حضرات ایں ہمہ از پے آں است کہ زر میخواہد۔

حب مال کا انجام

حب مال اور کمائی کے شوق نے یہ نوبت پہنچائی ہے روپیہ حاصل ہو' خواہ جائز طریق سے ہو یا ناجائز طریق سے دنیا حاصل ہو' خواہ دین رہے یا نہ رہے دین کی کتابیں اور قرآن بھی چھاپے جاتے ہیں تو دنیا کے لیے بس دنیا ہی دنیا رہ گئی۔ کسی سے مشورہ تک بھی نہیں کرتے کہ یہ طریقہ کمائی کا حلال ہے یا حرام' بس ذرا سی مصلحت ذہن میں آئی اور اس کام کو کر ڈالا' تصویر میں اتنی سی مصلحت سمجھ کر کہ واقعہ اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے بنانا

شروع کر دیا اس کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ شریعت اس کے متعلق کیا کہتی ہے اور
اب تو یہ جرأت ہوئی ہے کہ تصویروں کے بنانے کو حلال بھی کہنے لگے تا کہ کسی قسم کی
رکاوٹ ہی نہ رہے کیونکہ ایک فعل کو کریں اور ناجائز سمجھیں تو کبھی نہ کبھی یہ خیال ہوسکتا ہے
کہ شاید خوف خدا آجاوے اور اس کام سے دل رک جاوے اس واسطے یہ قصہ ہی بیچ میں
سے اڑا دیا کہ تصویر حرام نہیں بس اب کچھ رکاوٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ صاحبو! جو چاہیے سو کیجئے
لیکن یہ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ کے حلال کرنے سے کوئی حرام چیز حلال ہو نہیں سکتی۔ غرض
اس کتاب خاور نامہ میں ملائکہ تک کی تصویریں تھیں جن کے پر بھی لگائے تھے اور تماشا یہ کہ
فرشتے پان بھی کھائے ہوئے تھے نہ معلوم کون سے پنواڑی کے پان ہوں گے یہ وہی
قیاس الغائب علی الشاہد کی خرابی ہے۔ خاور نامہ کے مصنف صاحب پان زیادہ کھاتے
ہوں گے اس واسطے ملائکہ کی تصویر بناتے وقت ان کو بھی اپنے اوپر قیاس کر کے پان
کھلا دے یہ سب قصے تھے قیاس الغائب علی الشاہد کے۔

حور کی صفت

اس بناء پر حوروں کو دنیا کی عورتوں پر اور ان کے لباس کو دنیا کے لباس پر قیاس کر کے
یوں سمجھا ہوگا کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ حور کا کپڑا دنیا میں لٹکا دیں تو چاند اور سورج کی
روشنی ماند ہو جائے یہ مبالغہ ہوگا لیکن فی الواقع اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ معنی حقیقی مراد
ہیں کہ وہ کپڑے ایسے ہی ہیں اسی طرح ان کے جسم کی نسبت جو تصریح ہے "یری مخ
سوقھن من ورائھن" اس کو بھی مبالغہ پر محمول کیا ہوگا حالانکہ یہ بھی معنی حقیقی ہی پر محمول
ہے ان کا جسم واقع میں ایسا ہی ہے کہ اندر سے ہڈیوں کا گودا نظر آتا ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ
دنیا کو آخرت کے ساتھ کیا نسبت ہے یہاں کوئی کپڑا ایسا نہیں جس میں ذاتی چمک ہو بلکہ
اس کی کوئی چیز منور سے منور لیجئے وہ بھی اپنی ذات سے منور نہیں اس میں جو کچھ چمک دمک
اور نور دکھائی دیتا ہے وہ درحقیقت اس کا نور نہیں بلکہ شمس وقمر کا نور ہوتا ہے کہ اس چیز میں
منعکس ہو کر نظر آتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی منور چیز کو اندھیرے میں رکھ دیجئے جہاں
آفتاب کی شعاع نہ پہنچے دیکھئے گا کچھ بھی نہیں رہے گا نہ چمک نہ نور تو دنیا میں کوئی نظیر ان

کے کپڑے کی نہیں ملتی کہ وہ بالذات منور ہو اور نور بھی کیسا جو شمس و قمر کے نور کو ماند کر دے سو جس کے کپڑے کی یہ حالت ہو اس کی ذات کی کیا حالت ہوگی۔ پس ایسی عورت ذہن میں آ ہی نہیں سکتی اس میں نوع عورت کا نام لگا ہوا ہے مگر وہ نہ یہاں کی سی عورت ہے اور نہ اس کے حسن کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے یہی حالت آخرت کی ہر چیز کی ہے کہ نام ان کے دنیا ہی کی چیزوں کے سے ہیں اور حقیقت کچھ اور ہے نہ وہاں کا پانی یہاں کا سا پانی ہے نہ وہاں کا انار یہاں کا سا انار ہے نہ وہاں کی کھجور یہاں کی سی کھجور ہے نہ وہاں کا دودھ یہاں کا سا دودھ ہے نہ وہاں کی شراب یہاں کی سی شراب ہے نہ وہاں کی عورتیں یہاں کی سی عورتیں ہیں۔ غرض وہاں کی سب چیز یہاں کی سب چیزوں سے کہیں بہتر ہونے کی حقیقت یہ ہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ نعماء آخرت گو دنیا کی نعمتوں کے ساتھ متشارک فی الاسم ہوں لیکن حقیقت میں بالکل جدا ہیں اس واسطے دنیا کی نعمتوں کو ان سے نسبت دینا ذرہ اور آفتاب کو برابر کرنا ہے۔ پس ایک تو وجہ خیر ہونے کی یہ ہوئی کہ اس کی نوع اس کی نوع سے افضل و اکمل ہے۔

دنیا کی کوئی نعمت کلفت سے خالی نہیں

اور ایک وجہ اور بھی سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں اور راحتیں کیسی ہی بڑی سے بڑی ہوں مگر ان میں شائبہ الم کا ضرور ہے کوئی نعمت اور راحت ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ تکلیف نہ ہو۔ مثلاً کھانا جو دو وقت کھایا جاتا ہے سب جانتے ہیں کہ اس سے بڑی نعمت کونسی ہے بقاء حیات اسی سے ہے مگر اس میں کس قدر کلفتیں ہیں۔ اول تو اس کے حاصل کرنے میں ہیں کہ زمین کھودی جائے اور اس میں تخم ڈالا جائے پھر بارش کا انتظار کیا جائے اگر بارش نہ ہو تو کنوئیں سے سینچائی کی جائے۔ یہ مستقل ایک کام ہے اس کے لیے بیل پالنے پڑتے ہیں اور آدمی رکھنے پڑتے ہیں مکان بنانے پڑتے ہیں اس تمام کام میں بڑی رقم صرف ہوتی ہے پھر سینچائی کے بعد کچھ عرصہ تک انتظار کرنا پڑتا ہے تب وہ دانہ جمتا ہے پھر اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے گھر چھوڑ کر جنگل میں رہنا ہوتا ہے رات کو سونا نہیں ملتا' رات بھر یہ شغل رہتا ہے کہ ہاہا ہوہو کرتے رہو ڈھول پیٹتے رہو ورنہ وہ ساری کھیتی جنگل کے جانور کھا جائیں پھر اس کھیت کی گھاس وغیرہ سے صفائی کی جاتی ہے ان سب بکھیڑوں اور مشقتوں کے بعد

کھیت تیار ہوا اب وہ کاٹا گیا اور خرمن میں لا کر ڈالا گیا اور گاہا گیا تب جا کر دانہ حاصل ہوا۔
اب گویا کھانے کا مادہ تیار ہوا یہ کلفتیں تو مادہ میں ہوئیں ابھی اور بہت کام باقی ہیں اب اس کو
صورت غذا کی پہنائی جائے گی اس صورت پہنانے میں بھی کیا کچھ کلفتیں ہیں اس کو پیسا
جائے گا پھر چھانا جائے گا اور گوندھا جائے گا پھر روٹی پکائی جائے گی تو اب وہ کھانے کے
قابل ہوگا اب تک بھی جو غرض ہے وہ حاصل نہیں ہوئی اب اس کو کھایا جائے گا کھانے میں بھی
کچھ نہ کچھ مشقتیں ہیں، کبھی مرچ زیادہ ہوگئی تو تکلیف ہو رہی ہے کبھی کچا رہ گیا تو لطف نہیں
آیا، کبھی جل گیا تو بے لطفی رہی، کبھی گرم گرم لقمہ منہ میں رکھ لیا تو منہ بھن گیا اور تلاش ہے کہ
ٹھنڈا پانی لاؤ۔ خیر یہ کلفتیں تو معمولی ہیں لیکن کبھی یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ جان پر بن
جاتی ہے بلکہ ایک دم خاتمہ ہی ہو جاتا ہے۔ صاحبو! کھانا کھانا ایک بہت ہی معمولی کام ہے
جس کو بچپن سے لے کر مرتے وقت تک کم سے کم دو وقت روزانہ ہر شخص کرتا ہے اور یہ ایسا
سہل کام ہے کہ اس کو نہ کسی استاد سے سیکھنا پڑتا ہے نہ اس کے لیے کوئی کتاب ہے جس کو دیکھ
کر یہ کام آوے، بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اور یہ کام کرنے لگا، دودھ چھاتی میں سے کھینچا
اور حلق میں اتار لیا۔ گویا ایسا سہل کام ہے جس کے بتلانے اور سکھانے کی مطلق حاجت نہیں
جب تک دودھ پیتا رہا دودھ کو اس طرح حلق میں اتارتا رہا جب غذا تبدیل ہوئی اور کچھ
کھانے لگا تو اس غذا کو بھی اسی طرح بلا کسی کے بتلائے ہوئے اتارنے لگا حتیٰ کہ اسی طرح
ساری عمر گزر جاتی ہے، معمولی سے معمولی کام کے لیے بھی بعض وقت آدمی مشورہ کا محتاج ہوتا
ہے مگر یہ آپ نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو کھانے اور لقمہ حلق میں اتارنے کے لیے کسی
سے مشورہ کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔ غرض یہ نہایت ہی سہل کام ہے لیکن اگر اس کی کیفیت
خیال میں لائی جائے اور اس میں غور کیا جائے تو بڑے بڑے عقلمند دنگ رہ جائیں اور شاید یہی
کہنا پڑے کہ یہ کام ایسا مشکل اور امکان سے بعید ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا۔

خدائے عزیز و علیم کی قدرت

طب کی کتابوں میں دیکھئے تو عقل حیران ہو جاتی ہے کہ یہ کام کیسے ہو جاتا ہے حلق
میں دو نلی آگے پیچھے ہیں اگلی نلی سانس لینے کی ہے جو پھیپھڑے سے ملی ہوئی ہے اور

پچھلی نلی کھانے کی ہے جو معدہ میں پہنچتی ہے جو کچھ کھایا یا پیا جاتا ہے وہ اگلی نلی یعنی سانس کے راستے کے اوپر کو گزر کر کھانے کی نلی میں پہنچتا ہے۔ یہ ایسا خطرناک راستہ ہے کہ اگر ذرا سا پانی یا ذرا سا کھانا سانس کی نالی میں پہنچ جائے تو موت کا سامنا ہے کیونکہ پھیپھڑے میں سے پھر اس کے نکلنے کی کوئی ترکیب ہی نہیں، کوئی راستہ نہیں جس سے نیچے کو نکل جائے اور اوپر کو لوٹنا جسم ثقیل کا ویسے مستبعد مگر حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ ایک ذریعہ اس کا بھی احتیاطاً رکھ دیا ہے اور اس سے بھی قدرت کا ظہور ہوتا ہے کہ شے ثقیل اوپر کو لوٹ آتی ہے وہ ذریعہ کھانسی ہے جب کوئی شے غریب پھیپھڑے کی نلی یا پھیپھڑے میں پہنچتی ہے تو پھیپھڑا ہوا کو بند کر کے ایک حرکت کرتا ہے جس سے وہ چیز ہوا کے ساتھ باہر نکل آتی ہے کھانسی پھیپھڑے کے لیے ایسی حرکت ہے جیسے دماغ کے لیے چھینک یہ حرکت کھانسی کی اگرچہ پھیپھڑے میں طبعاً رکھی ہوئی ہے مگر ہر وقت کافی نہیں ہوسکتی اور کھانے کا کام ہر وقت خود یا کھانسی چونکہ حرکت غیر طبعی ہے اس واسطے ایذا دہ ہے لیکن حق تعالیٰ نے احتیاطاً اس کو رکھ دیا ہے۔ غرض سانس کی نلی کے اوپر کھانے اور پانی کا گزرنا سخت خطرناک بات ہے لیکن خدائے عزیز و علیم کی قدرت دیکھئے کہ برابر ہر وقت کھانے اور پینے کا کام ہوتا ہے اور کبھی بھی کوئی خطرہ پیش نہیں آتا' ایک ذرا سا گوشت کا ٹکڑا سانس کی نلی کے اوپر لٹکا دیا ہے جس کو کوا کہتے ہیں جب کوئی چیز کھائی یا پی جاتی ہے تو وہ گوشت کا ٹکڑا سانس کی نلی کے اوپر ایسا ڈھک جاتا ہے کہ اس میں ذرا سے رمق بھی پانی کی نہیں جاسکتی' ساری ساری عمر یہ خطرناک کام ہوتا رہتا ہے اور ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ لقمہ حلق میں کیسے اتر گیا مگر کبھی حق تعالیٰ دکھلا بھی دیتے ہیں کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے اور کس قدر خطرہ رکھتا ہے اور اس طرح دکھلا دیتے ہیں کہ اس میں غلطی ہوجاتی ہے اور کچھ حصہ کھانے یا پانی کا سانس کی نلی میں اتر جاتا ہے جس کو پھندا لگنا کہتے ہیں تو کس قدر تکلیف ہوتی ہے آنکھیں باہر کو نکل آتی ہیں سانس بند ہوجاتا ہے بہت دیر میں ہوش ہوتا ہے بلکہ بعض وقت ایک دم خاتمہ ہی ہوجاتا ہے۔

اٹک کر مرنے کی حکایت

ہمارے وطن میں یہی قصہ ایک دفعہ پیش آیا ایک صاحب کے یہاں کوئی تقریب تھی بڑا مجمع تھا' خوشی ہورہی تھی' کھانا کھانے بیٹھے تو ایک شخص کو پھندا لگا اور گلا بند ہوگیا' لقمہ اٹک گیا اور کھانا کیا تھا چاول' سننے والوں کو تعجب ہوتا ہے کہ کہیں چاول سے بھی ایسا ہوسکتا ہے چاول تو نہایت نرم غذا ہے حتیٰ کہ اس کو چبانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی مگر قدرت خدا کی کہ لقمہ حلق سے نہ اترا اور جان پر بن گئی' چاروں طرف سے لوگ دوڑے کوئی پانی لاتا ہے کوئی ان کو کھڑا کرتا ہے اور ہلاتا جلاتا ہے مگر وہاں کام ہی تمام ہوگیا تمام مجلس کا عیش مکدر ہوگیا۔ ان کے بھائی نے رات کو خواب میں دیکھا تھا کہ ایک جنازہ باہر سے گھر میں آیا ہے' تعجب ہوا تھا کہ جنازہ تو گھر میں سے باہر جایا کرتا ہے یہ الٹا کیا دکھائی دیا مگر ایسا ہی ہوا کہ باہر باہر محفل میں ان کا دم نکلا اور جنازہ گھر میں لایا گیا۔ غرض کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ کھانا کھانا ایک معمولی کام ہے مگر اس میں بھی ایسے خطرے پیش آجاتے ہیں یہ کلفت ہوئی کھانے میں تو کھانا کھانا کیسی راحت کی چیز ہے مگر وہ بھی شائبہ الم سے خالی نہیں ایسی کلفت تو کبھی اتفاقیہ پیش آجاتی ہے بعض کلفتیں ایسی ہیں کہ اکثر پیش آجاتی ہیں مثلاً کھانا کھاتے میں بوٹی کا ریشہ دانتوں کے اندر رہ گیا تو کس قدر اوکلو دیتا ہے جب تک وہ نکل نہ جاوے چین ہی نہیں آتا اس کو تنکے سے نکالا جاتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنکے سے اسے نکالنا چاہا تو تنکا بھی ٹوٹ کر وہیں رہ گیا اس سے اس الجھن میں اور اضافہ ہوا یہ وہ کلفتیں ہیں جو اکثر پیش آتی ہیں ان سب کلفتوں کے بعد غذا پیٹ میں پہنچی تو اور دوسری مشقت شروع ہوئی۔ ایک لقمہ زیادہ کھالیا تو گرانی ہوگئی جس کا انجام یہ ہے کہ قبض ہوگیا یا دست آگئے' پیٹ میں مروڑ ہوگئی یا جلن ہونے لگی اب حکیم کو بلاؤ یا ڈاکٹر کو لاؤ کہیں سینک ہورہی ہے کہیں چورن دی جارہی ہے تب کہیں پیچھا چھوٹتا ہے اور بسا اوقات اس سے بھی کھانا ہضم نہیں ہوتا' قے ہوجاتی ہے اور کبھی ہیضہ تک کی نوبت آجاتی ہے' خدا بچاوے۔

بھوکوں کو ہیضہ کے تمنا کرنے کی حکایت

گو بعض حریص لوگ ہیضہ کو تکلیف نہ سمجھتے ہوں جیسا ایک گاؤں کا قصہ مشہور ہے کہ وہاں ہیضہ پھیلا تو وہاں سے نکل کر بھاگے دوسرے گاؤں میں سے گزرے جو غریب اور قحط زدہ تھے انہوں نے پوچھا کیوں بھاگے جا رہے ہو جواب ملا کہ اس گاؤں میں ہیضہ ہو رہا ہے پوچھا ہیضہ کیا ہوتا ہے کسی نے کہا زیادہ کھا لینے سے خرابی ہو جاتی ہے اس کو ہیضہ کہتے ہیں تو وہ بیا کہتے ہیں افسوس یہ مبارک مرض ہم کو کبھی نہ ہوا پیٹ بھر کر کھانے کو تو مل جاتا پھر مرتے یا کچھ ہی ہوتا۔ ایک بی بی کا قصہ بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنے ایک عزیز کے لیے اولاد کی متمنی تھیں ایک بار کہنے لگیں کہ میرے بچے کے ایک بچہ ہو جاتا پھر چاہے میں اس خبر کو سنتے ہی فوراً ہی مر جاتی۔ یہ لیطفہ ہیضہ پر یاد آ گیا۔ بیان یہ تھا کہ کھانے میں کیا کیا کلفتیں ہیں کھانے سے پہلے بھی اور ساتھ میں بھی اور بعد میں بھی تو دنیا کی راحتوں کی یہ حالت ہے کہ کوئی راحت بھی متعدد کلفتوں سے خالی نہیں کھانے میں یہ کلفتیں تھیں۔

پانی کے متعلق کلفتیں

پانی میں بھی یہ قصے ہیں کہ پانی کے واسطے کنواں کھودنا پڑتا ہے بہشتی لگانا پڑتا ہے برتن رکھنے پڑتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا پڑتی ہے ذرا سی نجاست گر جائے تو پانی ناپاک ہو جائے پھر اس کو پھینکا جاتا ہے اور برتن پاک کیے جاتے ہیں یہ تو پانی کے حصول سے پانی کی کلفتیں ہیں اور پانی کے استعمال کے وقت میں بھی کچھ کلفتیں پیش آتی ہیں بعض وقت ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے مگر میسر نہیں بہت ناگواری کے ساتھ گرم پانی پینا پڑتا ہے۔ ضرورت تو رفع کی ہی جاتی ہے مگر دل خوش نہیں ہوتا بعض وقت گرم پانی کی ضرورت ہے مگر وہ نصیب نہیں ٹھنڈے پانی سے وضو یا غسل کیا جاتا ہے جس سے کپکپی آ جاتی ہے مگر کیا کیا جائے قہر درویش بر جان درویش غسل و وضو کرنا ہی پڑتا ہے اسی طرح بعد کی کلفتیں بھی ہیں پانی زیادہ پی لیا تو پیٹ پھول گیا کم ملا تو پیاس رفع نہ ہوئی غرض کوئی راحت دنیا کی ایسی نہیں جو مشوب بالالم نہ ہو۔

بی بی کے ساتھ کلفتیں

سب سے زیادہ عیش کی چیز دنیا میں بی بی سمجھی جاتی ہے اس میں دیکھئے کیا کیا کچھ کلفتیں ہیں اول تو اس کے حصول میں کہ بعض جگہ رواج یہ ہے کہ اس پر بیٹی والے روپیہ لیتے ہیں اول بہت سارو پیہ کماؤ تب بی بی کا نام لو اور پیغام دو خیر یہ تو بری اور جاہلانہ رسم ہے اور کہیں ہے اور کہیں نہیں ہے جہاں یہ رسم نہیں بھی ہے وہاں بھی اور بہت سے بکھیڑے ہیں بیٹی پر روپیہ تو نہیں دیا جاتا مگر اور بہت سی کلفتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ مثلاً پہلے نسبت اور منگنی ہوتی ہے اس کے لیے نائی کو بھیجنا پڑتا ہے تب بات پکی ہوتی ہے پھر تاریخ نکاح کی مقرر ہوتی ہے لوگوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے یہ بھی اچھا خاصا مرحلہ ہے۔ مختلف مذاق کے لوگ ہوتے ہیں بعض ان میں سے ایسے موقع پر خواہ مخواہ نخرے کیا کرتے ہیں۔ خیر ان کے نخرے اٹھائے گئے اور ان کو جمع کیا گیا اب کھانا دانہ بھی ہونا چاہیے اس کے لیے بھی روپیہ کی ضرورت ہے کتنے دنوں میں کلفتیں اٹھا کر یہ روپیہ جمع ہوتا ہے اب نکاح کا وقت ہوا تو مہروں کا معاملہ درپیش ہے اگر سہولت سے طے ہو گیا تو خیر ورنہ بعض وقت اس سے پہلے کی سب کارروائی یوں ہی رہ جاتی ہے اور طرفین میں بگاڑ ہو جاتا ہے اور بات یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ نکاح ہی حذف ہو جاتا ہے اگر مہر طے ہو گیا تو خیر نکاح ہو گیا ان بکھیڑوں کے بعد خدا خدا کر کے محنت ٹھکانے لگی اور بی بی مل گئی۔ یہ کلفتیں تو حصول سے پہلے کی ہوئیں جب بی بی مل گئی تو اول اول دو چار دن تو دعوتیں رہیں کہیں شکرانہ ہے کہیں پلاؤ ہے قورمہ ہے بریانی ہے اور دو چار دن کے بعد مطالبات شروع ہوئے کہ نان نفقہ دلواؤ رہنے کو گھر لاؤ سارا خرچ اٹھاؤ جو کچھ لطف اٹھایا تھا سب نسیاً منسیاً ہو گیا اب نون تیل لکڑی کی پڑی نوشہ صاحب ہیں کہ اب پہچانے نہیں جاتے ماں باپ کے گھر پکی پکائی کھائی تھی اب خود پکانا پڑے گی اور گھر کرنا پڑ گیا یا الٰہی یہ کیا بلا نازل ہوئی دونوں وقت کھلانے کو چاہیے اور کھانا بھی معمولی نہیں اپنی اکیلی جان ہو تو روکھی سوکھی بھی کھا کر بیٹھ رہے پرائی لڑکی ہے نئی نئی گھر آئی ہے اس کو تو روکھا سوکھا نہیں کھلایا جا سکتا اپنے آپ سے بہتر ہی کھلایا جائے گا مگر اب تو جو کچھ بھی ہو کرنا ہی پڑے گا۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس پر بھی بس نہیں زیور کی فرمائش شروع ہوئی اب زیور میں تو کھانے سے بھی زیادہ

روپیہ لگتا ہے اور کبھی یہ کام کیا نہیں تھا۔ اب لوگوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ سونا کہاں سے لیں، سنار کون سا ہوشیار ہے جو زیور ایسا بنا دے کہ صاحب فرمائش کو پسند آ جاوے اور توڑ پھوڑ کی ضرورت نہ پڑے۔ غرض بکھیڑوں اور کلفتوں کا دروازہ کھل گیا یہ تو وہ باتیں تھیں جو کسی معنی میں اختیاری بھی کی جا سکتی ہیں۔ بی بی کے ساتھ بعضی باتیں ایسی بھی پیش آتی ہیں جو اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً بیماری کہ بی بی صاحب کا سر بھی دکھا تو فوراً حکیم کو بلاؤ، ڈاکٹر کو لاؤ، اپنی جان پر کوئی تکلیف ہو تو ایک وقت آدمی دم گھونٹ کر بھی بیٹھ رہے اور صبر کر لے مگر اس شخص کی تکلیف پر صبر نہیں ہو سکتا جس کی تیمارداری اور کل بار اپنے ذمہ ہے خود اپنی طبیعت بھی اس کو گوارہ نہیں کر سکتی کہ اس کو کوئی موقع شکایت کا ملے نیز دوسری طرف کا یعنی سسرال کا دباؤ بھی موجود ہے کہ لڑکی والے سنیں گے کہ اس کے سر میں درد ہوا اور کسی نے خبر نہ لی تو بہت کچھ بگڑیں گے اور اس بگاڑ کی نوبت جانے کہاں سے کہاں تک پہنچے گی۔ ممکن ہے کہ اس کا انتقام لیں اور گھر بلا کر پھر نہ بھیجیں، اب کری کرائی ساری محنت یوں ہی رہ جائے۔ دیکھئے کس قدر بکھیڑے ہیں بی بی جو سب سے زیادہ کی عیش کی چیز ہے اس کے ساتھ کلفتوں کی بھی سب سے زیادہ بھرمار ہے اور ابھی تو اور کلفتیں باقی ہیں۔

اولاد کی کلفتیں

جو اس کے نتائج میں داخل ہیں وہ یہ کہ اولاد ہوئی عورت کے لیے تو بچہ کا ہونا سخت مصیبت ہے ہی لوگ کہا کرتے ہیں کہ عورت دوبارہ جنم لیتی ہے مگر مرد کے لیے بھی کچھ کم مصیبت نہیں کہ زچہ خانہ کی خبر گیری گوندھ سونٹھ گھی وغیرہ کے لیے خرچ کی ضرورت اور بچہ صاحب جو تشریف لائے ہیں وہ پھول پان ہیں ذرا سے میں کمہلا جاتے ہیں سرد ہوا لگ گئی تو اینٹھ گئے اور گرم ہوا لگ گئی تو بھڑک اٹھے کبھی رونا شروع ہوا تو روئے ہی جاتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کیوں روتے ہیں، بچہ حیوان بے زبان ہوتا ہے اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتا، علاج بھی قرائن اور قیاسات پر کیا جاتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ پیٹ میں درد ہے اس واسطے روتا ہے۔ لہٰذا گھوٹی دی جاتی ہے اور کبھی خیال ہوتا ہے کہ کان میں درد ہے اس کے واسطے تمباکو کی پیک کان میں ڈلوائی جاتی ہے یہ تکلیفیں تو وہ ہیں جو معمولی سمجھی جاتی ہیں ان کی

تدبیریں گھروں میں مستورات خود ہی کر لیتی ہیں اور کبھی ایسی بیماریاں بچہ کو ہوتی ہیں جو گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اور بڑے بڑے قابل اور تجربہ کار حکیموں اور ڈاکٹروں کی تلاش کرنی پڑتی ہے اور ذرا سے بالشت بھر کے آدمی کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے اس وقت تارے نظر آ جاتے ہیں اور بے ساختہ آدمی کہہ اٹھتا ہے کہ بھلی اولاد ہوئی ہمیں تو مار دیا۔ بھلے مانس اس کا کیا قصور ہے تو نے خود ہی تو اسے بلایا ہے۔ کسی صاحب حال کا قول:

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
کو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

غرض کہیں ناک دکھ رہی ہے کہیں آنکھ دکھ رہی ہے ذرا اس کا جی اچھا ہوتا ہے تو اپنی جان میں بھی جان آ جاتی ہے اور جب اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو اپنی زندگی بھی تلخ ہو جاتی ہے۔ "بین الرجاء والخوف" کا لطف آتا ہے خیر خدا خدا کر کے لڑکا بڑا ہوا تو اب اس کی شادی ہوئی پھر اس کے اولاد ہوئی اور سارا دھندا پھر از سر نو شروع ہوا جن کلفتوں سے خدا خدا کر کے کچھ نجات پائی تھی اب پھر ان کا آغاز ہوا۔ اگر اس کے اولاد نہ ہوئی تو اس کا غم کہ اولاد کیوں نہیں ہوتی اور اگر ہوئی تو وہ بھی سب ساز و سامان ساتھ لائی وہی گو موت وہی بیماری وہی خرچ وہی بے چینی وہی ہر وقت کا شغل غرض سارے غم تازہ ہو گئے یہ عیش اور آرام ہے دنیا کا اور دنیا کے یہ اشغال ایسے ہیں جن سے کوئی بھی خالی نہیں حتیٰ کہ لوگوں کی طبیعتیں ان سے ایسی مانوس ہو گئی ہیں کہ یہ اگر نہ ہوں تو طبیعت گھبراتی ہے کہ کوئی شغل نہیں اور یہ اشغال رہیں تو دل بہت خوش رہتا ہے مگر اس کو بجز بے حسی کے کیا کہا جاوے ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ان کے ایک دوست ملے اور سلام علیک ہوئی، پوچھا خیریت ہے انہوں نے بہت بگڑ کر کہا کہ خیریت ہوگی تمہارے یہاں ہمارے یہاں تو کنبہ ہے کنبہ میں خیریت کیسی کسی کی آنکھ دکھ رہی ہے کسی کی ناک دکھ رہی ہے کسی کا کان دکھ رہا ہے تم خیریت چاہتے ہو میرے کنبہ کو کوستے ہو یہ واقعہ ہے۔ اس شخص نے ان کلفتوں کے نہ ہونے کو برا سمجھا۔ اہل دنیا کی یہی حالت ہے چونکہ انہوں نے آرام کا عالم دیکھا نہیں ہے اور آنکھ کھولتے ہی اس عالم کو دیکھا ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے اس وجہ سے اس سے انس ہو گیا ہے اور اس کی تکلیفیں تکلیف نہیں معلوم ہوتیں۔

اگر ایک دو دن کے واسطے بھی ان کو وہ عالم نظر آ جاوے جہاں راحت محضہ ہے تو یہ انس نہ رہے اور اس کے نام سے گھبرانے لگیں۔ یہ اس دنیا کا حال ہے جس کے پیچھے لوگ مرے جاتے ہیں اور ہر شخص بھی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو سمیٹ کر گھر میں بھر لوں حالانکہ دنیا میں عیش و آرام اور راحت اس وقت میں تو کچھ ہو بھی جاتی ہے جب کہ دنیا تھوڑی ہو اور تعلقات کم ہوں اور تعلقات والے کو تو عیش اور آرام نصیب ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیا کی دو حالتیں

اس دنیا کی دو ہی حالتیں ہیں ایک آرام کی اور ایک تکلیف کی جس کے آرام کے حصہ کی یہ کیفیت ہو تو اس کی اس حصہ کا کیا پوچھنا ہے جو تکلیف کا حصہ سمجھا جاتا ہے بعض وقت ایسی تکلیفیں دنیا میں پیش آتی ہیں کہ ان کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ خیر اس تکلیف کے حصہ کو چھوڑیئے کیوں وحشت میں پڑے مجھے تو اس حصہ کی حالت دکھلانی ہے جو آرام کا حصہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں بھی کوئی راحت ایسی نہیں جس میں شائبہ الم کا نہ ہو اس سے تکلیف کے حصہ کا حال خود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بخلاف جنت کے کہ وہاں شائبہ بھی تکلیف کا نہیں۔

جنت میں ہر چیز ارادہ کے ساتھ موجود ہوگی

جس بات کو دل چاہے بلا کلفت اور بلا محنت اور بلا توسط اسباب فوراً موجود ہے مثلاً ایک پرند سامنے بیٹھا ہے کسی جنتی کا جی چاہا کہ اس کا کباب کھاتے' بس وہ فوراً کباب بن کر تیار ہو کر سامنے آ گیا نہ اس کے واسطے غلیل کی ضرورت ہوئی نہ بندوق کی نہ ذبح کی نہ کھال اتارنے کی نہ پکانے کی نہ گھی کی نہ مصالحہ کی بنا بنایا کباب سامنے آ گیا یا مثلاً ایک مکان میں بیٹھے ہیں اور وہ مکان آراستہ اور پیراستہ ہے چھت اس کی مرصع ہے مگر جی چاہا کہ کھلا ہوا مکان ہوتا تو اس کے لیے آپ کو اس مکان سے اٹھنے اور دوسرے مکان میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بھی ایک تکلیف ہے وہاں یہ ہوگا کہ چھت غائب اور کھلا ہوا مکان موجود' قرآن شریف میں ہے "لکم فیھا ماتشتھی انفسکم" یعنی جنت میں ہر وہ چیز ہوگی جس کو اہل جنت کا جی چاہے' غرض راحت بھی ہر قسم کی ہوگی اور پھر کوئی راحت کسی الم کے شائبہ سے ملی ہوئی نہ ہوگی بلکہ راحت محضہ ہوگی۔

آخرت کی دو حالتیں

اور جیسے دنیا میں دو حالتیں ہیں ایک راحت اور ایک تکلیف ایسے ہی آخرت میں بھی دونوں حالتیں ہیں' ایک راحت کی حالت جس کی جگہ جنت ہے دوسری تکلیف کی حالت جس کی جگہ دوزخ ہے مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا کی ہر راحت میں الم ہے اور ہر الم میں کچھ راحت بھی مگر آخرت میں نہ راحت کے ساتھ الم ہے نہ الم کے ساتھ راحت چنانچہ دنیا کی راحت اور آخرت کی راحت کا مضمون تو سن لیا اب دونوں جگہ کی تکلیف کی کیفیت سنئے' دنیا کی کوئی تکلیف ایسی نہیں جس میں کوئی شائبہ راحت کا نہ ہو مثلاً مرض ہوتا ہے تو اس کے واسطے طبیب موجود ہے دوا موجود ہے مکان ٹھنڈا یا گرم جیسا چاہے مل سکتا ہے تیماردار موجود ہیں کسی کے ماں باپ ہیں کسی کے دوست احباب ہیں اگر کوئی بالکل ہی لاوارث' غریب اور فقیر ہے اور کوئی خبر گیراں اس کا موجود نہیں تب بھی اتنا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی تکلیف کو دیکھ کر اس کے ابناء جنس کو رحم آ جاتا ہے اور پیسہ سے ہاتھ پیر سے زبان سے تھوڑا یا بہت سلوک کر دیتے ہیں۔ یہ بھی تھوڑی سی راحت ہے بخلاف دوزخ کے کہ وہاں کوئی جزو راحت کا ذرہ برابر بھی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ یہ بھی ایک قسم کی راحت ہی ہے کہ مصیبت زدہ کو یہ امید ہو کہ میں چند روز میں اس تکلیف سے چھوٹ جاؤں گا چاہے دن تکلیف کے کتنے ہی زیادہ ہوں لیکن کان میں یہ بات پڑی ہوئی ہو کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ میری تکلیف ختم ہو جائے گی تو اس سے بھی دل کو ایک سہارا سا رہتا ہے۔ دیکھو کوئی دائم الحبس ہوتا ہے تو چونکہ اس کی بھی ایک میعاد مقرر ہے گو وہ میعاد بھی طویل ہے۔ مثلاً چودہ برس کی لیکن اس سے بھی اس کے دل کو تقویت رہتی ہے حتیٰ کہ احباب سے اور گھر والوں سے کہتا ہے کہ بھائی زندگی ہے تو پھر آ ہی ملیں گے لیکن اہل نار کو دوزخ میں یہ بھی نہ ہوگا بلکہ حکم سنا دیا جائے گا کہ اب موت نہیں آئے گی اور تم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہنا ہوگا۔

اہل ایمان دوزخ میں امیدوار نجات ہوں گے

سوائے ان اہل ایمان کے جو بعض گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں جاویں گے کہ ان کو وہاں تکلیفیں جو کچھ بھی ہوں مگر اتنی راحت ضرور ہوگی کہ توقع ہوگی نجات کی اور یہ امید رہے گی کہ سو

برس میں ہزار برس میں دس ہزار برس میں کبھی نہ کبھی یہاں سے نکل جاویں گے سو اس گروہ کے ذکر کا یہ مقام اس لیے نہیں کہ یہ حقیقی اہل دوزخ نہیں ہیں ان کا مکان اصلی تو جنت ہے مگر کچھ نجاستوں میں آلودہ ہونے کی وجہ سے ان کو پاک وصاف کیے جانے کی ضرورت تھی اس واسطے دوزخ میں ڈالے گئے چندروز میں یہاں سے نکل جاویں گے، حقیقی اہل دوزخ کفار ہی ہیں جو دوزخ کے واسطے موضوع ہیں اور دوزخ ان کے واسطے موضوع ہے قرآن شریف میں جگہ جگہ ان ہی کو فرمایا گیا "ماولکم النار والنار مثوی لهم ونحوه" سو ان کے واسطے واقعی دوزخ میں شائبہ بھی راحت کا نہ ہوگا بلکہ جب اہل ایمان کو کبھی نہ کبھی نجات ہو جائے گی اس وقت ان کو صاف حکم سنا دیا جائے گا کہ تم کبھی نہیں نکالے جاؤ گے' اتنا جز و راحت کا بھی نہ رہا اب سوائے الم کے اور کیا رہا' ہر قسم کا الم وہاں موجود ہے مگر راحت ذرا بھی نہیں درد ہر طرح کا ہے مگر طبیب نہیں' دوا نہیں' تیماردار نہیں' اپنے ابناء جنس کو بھی رحم نہیں آتا' آیت میں صاف موجود ہے کہ اہل دوزخ اہل جنت سے لجاجت کریں گے کہ "افیضوا علینا من الماء او ممار زقکم اللّٰہ" یعنی تھوڑا سا پانی یا اور کوئی نعمت جنت کی ذرا سی ہم کو بھی دیدو تو جواب ملے گا کہ "ان اللّٰہ حرمهما علی الکفرین" یہ تم کو نہیں مل سکتیں حق تعالیٰ نے ان کو کفار کے لیے حرام کیا ہے یہ جواب ان لوگوں کا ہے جو اہل دوزخ کے ابناء جنس ہیں یعنی آدمی ہیں مگر اس لحاظ سے اجنبی بھی ہیں کہ اب ان میں اور ان میں کوئی تعلق نہیں رہا وہ اہل جنت ہیں یہ اہل دوزخ ہیں وہ چین میں ہیں یہ تکلیف میں ہیں بلکہ درحقیقت تو ان میں اور ان میں تعلق دنیا میں بھی نہ تھا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو ماننے والے تھے اور یہ خدا تعالیٰ کے منکر تھے وہ ان کے دشمن تھے یہ ان کے دشمن تھے' ہاں کچھ وہ تعلقات دنیا کے دونوں میں تھے جو معیشت دنیا کے لیے ضروری تھے بہر حال اہل جنت اہل دوزخ سے بالکل مغائرت رکھتے ہیں اگر ان سے ایسا روکھا جواب ملے تو کچھ تعجب اور شکایت کی بات نہیں۔

اہل دوزخ میں باہم بھی عداوت ہوگی

مگر وہاں تو اہل دوزخ میں باہم بھی تراحم نہ ہوگا' یہ بھی ایک قسم کی راحت ہوا کرتی ہے کہ ایک بلا میں ایک مجمع کا مجمع گرفتار ہو مگر ان مین باہم ہمدردی ہو اور ایک دوسرے کا

شریک حال ہو اس سے وہ مصیبت کچھ نہ کچھ ہلکی ہو جاتی ہے دوزخ میں اتنی بھی راحت نہ ہوگی بلکہ ایک کا ایک دشمن ہوگا۔ چنانچہ آیا ہے:

كلما دخلت امة لعنت اختها حتّٰی اذا ادّارکو افیها جمیعا قالت اخرهم لاولهم ربنا هؤلآء اضلونا فاتهم عذاباً ضعفا من النار قال لکل ضعف ولکن لاتعلمون وقالت اولهم لاخراهم فما كان لكم علینا من فضل فذوقوا العذاب بما کنتم تکسبون۔

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب کوئی ایک گروہ دوزخ میں جائے گا تو دوسرے گروہ پر لعنت کرے گا اور برا بھلا کہے گا یہاں تک کہ جب سب دوزخ میں پہنچ جاویں گے تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کی نسبت یوں کہیں گے کہ اے اللہ ان لوگوں نے ہم کو بہکایا تھا یعنی یہ گمراہ تھے ان کی تقلید میں ہم بھی گمراہ ہوگئے۔ لہٰذا ان کو دونا عذاب ہونا چاہیے حکم ہوگا کہ سب کے لیے دونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں عذاب کی کچھ کمی نہیں ایک حصہ اور دو حصے سب برابر ہیں کیونکہ کوئی بھی ختم ہونے والا نہیں ایک گروہ نے تو یہ کہا دوسرا گروہ کہے گا کہ تم ہم سے کس بات میں بڑھے ہوئے ہو جیسا کیا تھا اس کی سزا بھگتو' یہ اہل دوزخ کی باہم جنگ و جدل ہے اور عذاب میں تو تھے ہی یہ بھی عذاب ہی ہے کہ باہم سلوک اور ہمدردی بھی نہیں تو وہاں کی تکلیف بھی کامل تکلیف ہے جس میں کوئی شائبہ راحت کا نہیں مگر مجھ کو اس وقت وہاں کے تکلیف کے جزو کا بیان کرنا مقصود نہیں' مقصود محض راحت کے جزو کا بیان کرنا ہے اور یہ دکھلانا ہے کہ دنیا کی راحتوں سے وہاں کی راحت کو بڑا فرق ہے۔ پس تمام اشکالات رفع ہو کر ثابت ہو گیا کہ آیت میں اسلام کا کامل ثمرہ بتلایا گیا ہے اور قاعدہ ہے کہ اگر کسی کام پر ناقص ثمرہ کا وعدہ ہو تو اس کی طرف رغبت بھی ناقص ہوگی اور اگر کامل ثمرہ کا وعدہ ہو تو رغبت بھی کامل ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص سے ایک تو یوں کہا جائے کہ ایک گھنٹہ فلاں کام کرو تو ایک پیسہ ملے گا اور ایک سے یوں کہا جائے کہ ایک گھنٹہ فلاں کام کرو تو ایک اشرفی ملے گی۔ تو ظاہر ہے کہ اس شخص کو اس کام کی طرف رغبت زیادہ ہوگی جس کی اجرت کامل ہے یعنی جس پر ایک اشرفی کا وعدہ ہے اسی طرح یہاں جب حق تعالیٰ نے اسلام کا ثمرہ کامل

بیان فرمایا اس طرح سے کہ ثمرے ہر کام کے دو ہی ہوتے ہیں' نجات عن التکلیف اور حصول راحت اور یہاں دونوں کا وعدہ ہے تو اب کوئی فرد ثمرہ کا باقی نہیں رہا اور اس طرح سے ثمرہ کامل ہوگیا تو اس میں اسلام کی پوری ترغیب ہوگئی اور اس ثمرہ کا کامل ہونا یہاں تو اس طریق سے معلوم ہوا اور دوسری نصوص میں دوسرے عنوانات سے بھی مذکور ہے۔

جنت میں نیند نہیں ہے

مثلاً صاف آیا ہے "**لایمسنا فیھا نصب**" یعنی اہل جنت کہیں گے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ایسے گھر میں پہنچا دیا کہ اب ہم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی دنیا میں آدمی کام کاج میں تھک جاتا ہے تو اس کو نیند آنے لگتی ہے وہاں نیند بھی نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ جنت میں سوئیں گے بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" **النوم اخ الموت**" یعنی نیند تو ایک قسم کی موت ہے۔

نیند کوئی مقصود بالذات چیز نہیں

اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جنت میں موت ہے نہیں لہٰذا نیند بھی نہ ہوگی اور واقعی جنت میں نیند ہونا بھی نہیں چاہیے کیونکہ نیند خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ رفع تکان کے واسطے ہوتی ہے اور جنت میں تکان ہے نہیں تو نیند کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ بات ثابت ہے کہ جنت میں جملہ وہ چیزیں ہوں گی جس کو کسی کا دل چاہے "**وفیھا ماتشتھیہ الانفس**" تو اگر کسی کا دل نیند ہی کو چاہے تو نیند بھی ہونی چاہیے اور بعض لوگوں کے نزدیک تو نیند سب سے زیادہ محبوب چیز ہے۔

زیادہ سونے والوں کی حکایت

ہم نے ایک قصہ سنا ہے کہ ایک شخص تھے ان کو سونے کا بہت شوق تھا ایک دن مکان کے تہہ خانہ میں جا کر سو رہے اور کسی کو خبر نہ کی' کھانے کے وقت ان کی تلاش پڑی تو کہیں پتہ نہ چلا خیر معمولی تلاش کے بعد گھر والے خاموش ہو رہے کہ کہیں گئے ہوں گے آ جائیں گے لیکن وہ نہیں آئے یہاں تک کہ شام ہوگئی' شام کو کھانے کے وقت پھر تلاش ہوئی مگر پتہ نہیں

اب تو گھر والوں کو فکر ہوئی اور جہاں جہاں خیال ہوا تلاش کرایا مگر پتہ نہ چلا۔ اگلا دن ہوا اب ان کی تلاش بڑے اہتمام کے ساتھ شروع ہوئی اور پچاس پچاس کوس تک آدمی دوڑے اور جہاں جہاں خیال پہنچا سب ہی جگہ ڈھونڈ لیا مگر وہ حضرت گھر سے باہر کہیں گئے ہوں تو ملیں سب آدمی واپس آ گئے اور گھر میں رونا پیٹنا پڑ گیا' آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہے کہ خدا جانے جنگل چلے گئے اور وہاں بھیڑیا کھا گیا یا کہیں پانی میں ڈوب گئے یا کیا ہوا' غرض ماتم کر کرا کر بیٹھ رہے' تین دن کے بعد ان حضرت کی آنکھ کھلی اور آپ تہہ خانہ میں سے بخیریت نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سب رو پیٹ بھی چکے تو آپ فرماتے ہیں میں تو یہیں تہہ خانہ میں سو رہا تھا کیوں اتنا پریشان ہوئے۔ علیٰ ہذا اٹاوہ میں ایک رئیس تھے' میرے ایک عزیز ان کے یہاں رہتے تھے' وہ بیان کرتے تھے کہ ایک روز وہ ایسے موقعہ پر سو گئے جہاں سایہ بھی تھا مگر پرنالہ بھی گرتا تھا اور اتفاق سے بارش ہوئی اور پرنالہ رات بھر ان کی چھاتی پر گرتا رہا مگر ان کو خبر نہیں ہوئی صبح کو آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ رات بھر پرنالہ گرتا رہا اور بھیگے پڑے ہیں تب کپڑے اتارے میرے زمانہ قیام دیوبند میں ایک طالب علم تھے۔ فیض محمد نام ان کے باپ کسی ریاست میں نوکر تھے ان کا بھی قصہ ایسا ہی ہے کہ وہ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ ہلاؤ' جلاؤ' غل مچاؤ کچھ کرو مگر ان کو خبر نہیں ہوتی تھی جب تک ان کے کان کے پاس بندوق کا فائر نہ کیا جاتا ان کی آنکھ نہیں کھلتی تھی' ریاست میں ان کی قدر تھی اور ایک فائر روزانہ کی ان کے جگانے کے واسطے منظوری ہو گئی تھی ایسے اور بھی قصے بہت ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سونے والوں کے نزدیک نیند سے زیادہ کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔

جنت میں نیند کی خواہش نہیں ہوگی

تو کچھ عجب نہیں کہ یہ لوگ جنت میں بھی اس کی خواہش کریں اور یہ ثابت ہے کہ جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کو دل چاہے تو نیند بھی ملنی چاہیے تو تعارض ہو گیا نصوص میں ایک نص میں ہے "وفیھا ماتشتھیہ الانفس" اور حدیث میں ہے کہ "النوم اخ الموت" (نیند موت کی بہن ہے) جس کو میں نے ابھی بیان کیا تھا کہ مطلب یہ ہے کہ وہاں نیند نہ ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہاں نیند کی خواہش ہی

نہ ہونے دیں گے اور راز اس کا یہ ہے کہ نیند فی نفسہ کوئی مرغوب چیز نہیں اور یہاں جو مرغوب ہے تو اس وجہ سے کہ یہاں جاگنے سے تکان ہو جاتا ہے اس واسطے ضرورت پڑتی ہے سب کام چھوڑ کر تھوڑی دیر آرام کرنے کی یہی حقیقت ہے' نیند کی اور جہاں تکان نہ ہو وہاں اس کی کیا ضرورت ہے۔ طالب علموں کے سمجھنے کے قابل تقریر اس امر کی کہ نوم کوئی مطلوب چیز نہیں اس طرح پر ہے کہ اصل نعمت وجودی چیز ہے اور اسی بناء پر تو دنیا کو عدم سے وجود میں لایا گیا کیونکہ حق تعالیٰ کو اپنی نعمت کا اظہار مقصود تھا۔

من نکردم خلق تا سودے کنم　　بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(تو پیدا کرنا نعمت ہوا فنا کرنا اصل میں نعمت نہیں ہوا)

اور موت عدم ہے من وجہ (من وجہ اس واسطے کہا کہ عدم محض نہیں ہے) اور نیند مشابہ موت کے ہے۔ لہٰذا نیند بھی اصل میں نعمت نہ ہوئی اور جنت نعمتوں اور عیش کا گھر ہے تو وہاں اس کا کیا ذکر ہے اس لیے جنت میں کسی کو اس کی تمنا ہی نہ ہوگی۔ بس یہ سوال ایسا ہے جیسے کوئی کہنے لگے کہ جب جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کو جی چاہے تو اگر کسی کا جی موت ہی کو چاہے تو یہ بھی ملنی چاہیے یا کسی کا جی لڑائی دنگے' خون خرابے کو چاہے تو یہ بھی جنت میں ہونا چاہیے یہ مذاق تو ایسا ہے۔

ایک لطیفہ

جیسے ایک صاحب حقہ کے بڑے دلدادہ تھے انہوں نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت وہاں آگ بھی ملے گی کسی نے ظرافت سے جواب دیا کہ آگ بہت دوزخ میں سے جا کر لے آیا کرنا۔ سو یہ تو بدمذاقی جنت والوں کا مذاق صحیح ہوگا نہ ایسی چیزیں جنت میں ہوں گی جو مضر یا غیر مطلوب ہیں اور نہ ان کا جی ایسی چیزوں کو چاہے گا اس کی مثال دنیا میں ہی لیجئے کہ دنیا میں کیسی کیسی چیزیں کھانے کو موجود ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا پیسہ والا ہے اس کو کھانے کو سب کچھ میسر ہے اس پر کوئی کہنے لگے کہ سب کچھ کہاں میسر ہے گھاس کہاں کھاتا ہے اور بھوسہ کی سانی اس کو کہاں میسر ہے بلکہ یوں کہنے لگے کہ گوبر تو وہ کھاتا ہی نہیں پھر کیسے کہا جاتا ہے کہ سب چیز کھانے کو میسر ہے تو یہ سوائے اس کے کہ بے حسی

ہے اور کیا ہے کھانے کو سب کچھ میسر ہونے کے معنی صحیح المزاج کے نزدیک یہی ہو سکتے ہیں
کہ جو غذائیں انسان کے کھانے کی ہیں اور ان میں سے بھی اچھی اور عمدہ چیزیں اس کو میسر
ہیں کہ قورمہ، پلاؤ، بریانی، فیرینی جو چاہے وہ کھا سکتا ہے حتیٰ کہ یہ بھی معنی نہیں کہ سوکھی روٹی بھی
کھا سکتا ہے اور ان غذاؤں کا تو کیا ذکر جو جانوروں کے کھانے کی ہیں اور یوں معنی لغوی کے
اعتبار سے تو یہ چیزیں بھی کھانے کی ہیں اور غذا بھی ہیں۔ آخر گائے، بیل بھوسہ اور سانی
کھاتے ہیں اور گوہ بھی بعض جانوروں کی غذا ہے اس معنی کو تو کھانے کا لفظ ان سب پر
صادق آسکتا ہے اور اس لفظ کے معنی کہ فلاں شخص کو سب کچھ کھانے کو میسر ہے لغت کے
اعتبار سے اس طرح صحیح ہو سکتے ہیں کہ اس کو جانوروں کی غذا اور غلیظ بھی میسر ہے مگر یہ معنی
کون مراد لیتا ہے عرف میں یہی معنی مراد لیے جاتے ہیں کہ اس کو وہ چیزیں میسر ہیں جو ایک
صحیح المزاج اور سلیم العقل آدمی کھایا کرتا ہے اور صحیح المزاج آدمی کا دل ان چیزوں کو چاہا ہی
نہیں کرتا جو بری ہیں اور جو طبیعت انسانی کے خلاف ہیں البتہ مزاج کی خرابی کے وقت اور
خروج عن الاعتدال کی حالت میں بری چیزوں کو بھی جی چاہا کرتا ہے۔ مثلاً بعض حالتوں
میں مٹی کھانے کو جی چاہا کرتا ہے بعض صورتوں میں نیم کے پتے بھی کڑوے نہیں لگتے یا بے
حسی کا زمانہ ہوتا ہے کہ بھلی بری میں تمیز نہیں ہوتی جیسے بچے کھٹائی بہت اور نہایت رغبت سے
کھاتے ہیں کھٹائی ان کے نزدیک ایک بہت بڑی نعمت ہے حالانکہ عاقل سمجھ سکتا ہے کہ
کھٹائی بھی کوئی کھانے کی چیز ہے اعصاب کو مضر ہے اور تمام قوتوں کو کمزور کرتی ہے اسی
واسطے جب شعور کا زمانہ آتا ہے تو بچوں کی طبیعت بھی کھٹائی سے اکثر خود ہٹ جاتی ہے تو
ایسی نکمی چیزوں کو جی چاہنا بے شعوری کی دلیل ہے یا فساد مزاج کی اور اہل جنت نہایت صحیح
المزاج اور سلیم العقل ہوں گے اس واسطے ان کا دل ہی ان چیزوں کو نہ چاہے گا جو مضر اور نکمی
ہیں دنیا اور جنت میں یہی فرق ہے کہ دنیا میں بعض وقت غیر قابل استعمال چیزوں کی طرف
بھی رغبت ہوتی ہے اور جنت میں نہیں ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ سونا کوئی مرغوب و مطلوب چیز
نہیں لہٰذا یہ جنت میں نہ ہوگا اور نہ اس کو ان کا جی چاہے گا اور جاگنے سے ان کو تکان بھی نہ
ہوگا۔ "لا یمسنا فیھا نصب و لا یمسنا فیھا لغوب" جنت میں تکان، مشقت ہے

ہی نہیں وہاں راحت ہی راحت ہے نہ شخصی حالات میں کوئی حالت تکلیف کی یا ناگواری کی ہے اور نہ دوسرے کسی سے کوئی تکلیف پہنچے گی کیونکہ جنت کی صفت میں یہ بھی آیا ہے "ونزعنا مافی صدورھم من غل" یعنی جو کچھ سینوں کے اندر کدورتیں ہیں وہ سب نکال دی جائیں گی کیسی پاک زندگی ہے جس کی نظیر خیال میں بھی نہیں آ ئی کہ کوئی کلفت باقی نہیں اور کوئی راحت چھوٹی ہوئی نہیں اور دنیا کی یہ حالت ہے کہ یہاں ہم سروٹ میں مظفر نگر سے آئے ہیں چار فرلانگ تو چلنا پڑا ہی ہے اگر چہ یہ مسافت کچھ بھی نہیں ہے مگر کچھ نہ کچھ قصد و اہتمام کی اور پیر ہلانے کی حاجت تو ہوئی ہے اور جنت میں حالانکہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ ایک مکان کے گوشہ کا آدمی دوسرے گوشہ والے کو نظر نہ آئے گا لیکن اگر آپس میں ملنا چاہیں تو بس دل میں ارادہ پیدا ہو اور وہاں پہنچ گئے۔ ایک قدم بھی چلنے اور تکلیف کی ضرورت نہیں۔ غرض تمام نعمتیں جنت میں کامل ہوں گی کسی میں شائبہ نقصان کا نہ ہوگا۔

اسلام کے دو ثمرات

حاصل یہ کہ اسلام کے دو ثمرے ہیں ایک مضرات سے حفاظت دوسرے راحت کی چیزیں حاصل ہونا اور وہاں دونوں ثمرے کامل ہوں گے ان دونوں ثمرات کا کامل ہونا دوسری نصوص سے تو بصراحت ثابت ہے مثلاً ایک یہی آیت تھی "لایمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب" (وہاں نہ مشقت ہوگی اور نہ تکان)

یہ تو دفع مضرت پر دال ہے اور مثلاً یہ دوسری آیت ہے "وفیھا ماتشتھیہ الانفس وتلذ الاعین" (اور اس میں جو جی چاہے گا ملے اور آنکھوں کو لذت ملے گی) یہ حصول راحت پر دال ہے اور بھی بہت سی صریح آیتیں اس مضمون کی موجود ہیں اور جس آیت کا اس وقت بیان ہو رہا ہے اس میں ذرا تامل کے بعد ثمرات کے کمال پر متعدد طرف سے دلالت موجود ہے ایک تو یہ کہ ثمرہ کے دو فرد ہوتے ہیں نفی مضرات اور حصول راحات اور آیت میں دو جملے ہیں "لھم دار السلام" (ان کیلئے سلامتی کا گھر ہے) اور "وھو ولیھم" (اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتے ہیں) اول کا مدلول نفی ہے مضرات کی اور دوسرے کا مدلول اثبات ہے راحات کا تو اس طرح دونوں جزوں کا احاطہ ہو گیا اسی کو ثمرہ

کامل کہتے ہیں۔ایک تو یہ وجہ ہوئی دلالت علی الکمال کی۔دوسرے یہ کہ لفظ دارالسلام سے بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ "سلامت عن المضرات علی وجه الکمال" ہے کیونکہ اس معنی کے لیے اول تو صرف لفظ سلام بھی کافی تھا اس وجہ سے کہ سلام کے آگے کوئی قید نہیں تو مطلق سلام ہوا اور یہ قاعدہ ہے کہ "المطلق اذا اطلق یراد به الفرد الکامل" اس واسطے لفظ سلام سے کامل سلامتی مراد ہوگی گو کہیں مطلق سے ادنیٰ فرد بھی مراد لیا جاتا ہے۔مثلاً عتق رقبہ میں جو کہ بعض کفارات میں ہے اس میں مومن وغیرہ کی قید نہیں لہٰذا بقاعدہ المطلق یجری علیٰ اطلاقه کوئی رقبہ بھی آزاد کردیا جاوے خواہ مومن ہو یا کافر تو کفارہ ہو جاوے گا۔سو یہ تابع قرائن کے ہے اور یہاں قرینہ دال ہے کہ لفظ سلام فرد کامل ہی پر محمول ہوگا کیونکہ اگر ادنیٰ فرد مراد لیں تو جنت کو دنیا پر کیا ترجیح ہوگی کیونکہ ادنیٰ سلام تو یہاں بھی موجود ہے لہٰذا المطلق یجری علی اطلاقه یہاں جاری نہ ہوگا بلکہ وہ پہلا ہی قاعدہ جاری ہوگا یعنی المطلق اذا اطلق یراد به الفرد الکامل۔تاہم کچھ نہ کچھ گنجائش اس شبہ کی بھی تھی کہ شاید سلام سے ادنیٰ فرد مراد ہو لیکن جب لفظ دار بڑھا دیا تو یہ شبہ بالکل ہی نہیں رہا اب یہ معنی ہوگئے کہ ایسے عالم کی سلامتی مراد ہے کہ وہ سلامتی کا گھر ہی ہے۔

دارالسلام کی عجیب وغریب تفسیر

اس کی تنویر ایک مقدمہ سے ہوگی وہ یہ ہے کہ ہر گھر کا ایک موضوع لہ ہوا کرتا ہے یعنی وہ امر جس کے لیے وہ گھر بنایا گیا ہو مثلاً رہنے کا گھر' یا اسباب کا گھر' یا مواشی کا گھر' یا مہمانوں کا گھر' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ رہنے کا گھر وہ ہے کہ جس میں رہنے کا سامان پورا ہو' چارپائیاں لیٹنے کے لیے اس میں موجود ہوں' فرش بیٹھنے کے لیے بچھا ہوا ہو' لیمپ روشنی کے واسطے رکھا ہوا ہو' پنکھا ہوا کے لیے لگا ہوا ہو' پانی پینے کے واسطے رکھا ہوا ہو' کھڑکیاں ہوا کے واسطے کھلی ہوئی ہوں' چھت گیری لگی ہوئی ہو تاکہ چھت میں سے مٹی نہ گرے وغیرہ وغیرہ جتنے سامان رہنے کے متعلق آسائش اور آرائش کے ہیں سب موجود ہوں اور اسباب کا گھر وہ کہلائے گا جس میں اسباب رکھنے کا سامان پورا موجود ہو متعدد مچان ہوں' الماریاں ہوں' صندوق ہوں' کواڑ مضبوط ہوں' تالا' کنجی درست ہو اور مواشی کا گھر وہ ہوتا ہے جس میں

جانوروں کے باندھے رہنے کا سامان ہو مثلاً کھونٹے مضبوط گڑے ہوں ان کے کھانے کے لیے سانی کی ناندیں گڑی ہوں' بھوسہ بھرا ہوا ہو' چری بہت سی جمع کی ہوئی ہو۔

علیٰ ہذا مہمانوں کا گھر ایسا ہونا چاہیے جس میں مختلف مذاق کے لوگوں کی آسائش کے سامان ہوں حقہ بھی موجود ہو پاندان بھی رکھا ہوا ہو' پانی کے لیے متعدد برتن ہوں' بہت سی چارپائیاں ہوں اگر مہمان بڑی حیثیت کے لوگ ہوں تو آرائش کا سامان بھی بقدر کافی ہو' جھاڑ فانوس لگائے جاویں' لیمپ بجلی کے ہوں' نقش ونگار سے بھی مکان کو آراستہ کیا جاوے' خدمت گار بھی متعدد ہوں۔ غرض ہر گھر کا ایک موضوع ہوتا ہے اور عادت یہ ہے کہ جس گھر کو جس موضوع کے لیے تجویز کیا جاتا ہے اس موضوع کی وہاں پوری تکمیل کی جاتی ہے اور اپنے مکان بھر موضوع کے تمام مناسبات کو جمع کیا جاتا ہے جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب سنئے کہ قرآن میں محاورات اور عادات کی رعایت بہت ہے تو جس کو حق تعالیٰ نے دارالسلام فرمایا ہے جس کے معنی ہیں سلامتی اور حفاظت کا گھر اس کا موضوع آفات سے حفاظت اور امن ہوا تو لامحالہ وہاں یہ موضوع کامل ہوگا اس سے اجمالاً تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ دارالسلام جس جگہ کا نام ہے وہ جگہ پوری پوری حفاظت اور امن کی جگہ ہوگی۔ اب اس کی کچھ تفصیل بھی سنئے اس سے بخوبی سمجھ میں آ جاوے گا کہ وہ دارالسلام واقعی ایسی ہی جگہ ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ میں کہہ چکا ہوں کہ عادت یہ ہے کہ ہر گھر کی اس کے موضوع میں پوری تکمیل کی جاتی ہے' کوئی یہ نہیں چاہتا کہ جس کام کا گھر بناوے اس میں کچھ کمی رہ جائے پھر بھی اگر کمی رہ جاتی ہے تو اس کی وجہ دو ہوتی ہیں یا تو یہ کہ جو شخص بناتا ہے وہ پورا عاقل نہیں ہے کہ اس مکان کی سب ضروریات اس کے ذہن میں نہیں آئیں اس وجہ سے بعض چیزیں چھوٹ گئیں یا یہ کہ ضرورتیں تو ذہن میں سب آ گئیں مگر بنانے والے کو ان کی تکمیل کی پوری قدرت نہیں مثلاً روپیہ کم ہے یا جگہ پوری نہیں ملتی تو لامحالہ جتنی گنجائش ہوگی اتنے ہی کام پر بس کیا جائے گا اور اگر بنانے والا پورا عاقل ہے اور اصول تعمیر سے اور ضروریات انسانی سے پورا واقف اور تجربہ کار ہے اور صاحب قدرت بھی ہے یعنی روپیہ بھی کافی موجود ہے اور جگہ کی بھی کمی نہیں تو ظاہر ہے کہ پھر وہ مکان کو ناقص کیوں رکھے گا' کامل ہی بنائے گا اور جو کچھ بھی اس کی موضوع

کے مناسب ہوگا وہ سب اس میں مہیا کرے گا۔ مثلاً گھر کو تفریح کے لیے بنائے گا تو اس میں پورا سامان تفریح کا رکھے گا' جھاڑ' فانوس' نقش ونگار فرش فروش سب ہی کچھ سامان نشاط کا مہیا کرے گا اور جو وظیفہ پڑھنے کے لیے بنائے گا تو اس میں وظیفہ کا پورا سامان رکھے گا' مناجات مقبول بھی ہوگی' دلائل الخیرات بھی' اعظم بھی' تسبیح بھی' چوکی جاء نماز بھی غرض سب چیز وظیفہ کے متعلق ہوں گی جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا۔

دارالسلام کا مفہوم

تو اب دارالسلام کو لیجئے کہ وہ گھر بنایا گیا ہے آفات سے محفوظ ہونے کے لیے دارالسلام کے معنی یہ ہوں گے کہ سلامت وحفظ عن الآفات کی صفت میں وہ کامل ہے اور پھر اس کے ساتھ یہ دیکھا جاوے کہ وہ گھر بنایا کس نے ہے حق تعالیٰ نے جن کو تکمیل سے کوئی مانع نہیں کیونکہ مانع دو ہوتے ہیں علم نہ ہونا یا قدرت نہ ہونا اور وہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں حق تعالیٰ کا علم بھی کامل اور قدرت بھی کامل' پھر یہ کیسے خیال کیا جاسکتا ہے کہ جس گھر کو حق تعالیٰ نے سلامتی اور حفاظت عن الآفات کے لیے بنایا ہو اس میں کوئی بھی وہ چیز چھوٹ گئی ہوگی جس کو اس موضوع میں دخل ہو یہ بہت ہی موٹی بات ہے تو ثابت ہوا کہ وہاں ہر قسم کی تکالیف سے حفاظت رہے گی حتیٰ کہ جو تکالیف کہ اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہ آویں اور کبھی آئندہ ہوسکتی ہوں جن کا علم حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں وہ بھی وہاں نہیں ہیں۔

دنیا کا گھر محض سرائے ہے

اے مسلمانو! ہمارا گھر وہ ہے جس کی یہ شان ہے دنیا کو گھر نہ سمجھو' دنیا محض سرائے ہے' راستہ چلتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہرنا ہے۔

دنیا میں دل لگانے کی عجیب مثال

مگر ہم نے اس میں دل لگا لیا' ہماری مثال اس سپاہی کی سی ہے جس نے ساری عمر نوکری کی اور جو کچھ کمایا تھا اس کو لے کر گھر کو چلے' راستہ میں کہیں سرائے میں ٹھہرے' ایک کوٹھری کرایہ پر لی وہ کوٹھری ان کو ایسی پسند آ گئی کہ آپ نے فوراً راج مزدوروں کو بلایا اور

اس کی لیپائی، پوتائی شروع کی اور عمدہ قسم کی قلعی کرائی اور بازار سے دری اور فرش اور چوکی اور جھاڑ اور فانوس لائے اور خوب سجایا، غرض پانچ ہزار روپیہ جو کما کر لائے تھے وہ سب اس کوٹھری کی سجاوٹ میں لگا دیا اور اس میں بیٹھ بیٹھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ یہ ہمارا گھر ہے اور بھٹیاری اس کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہے کہ اچھا بیوقوف پھنسا، یہ تو اطمینان سے بیٹھے تھے مگر وہ کوٹھری ایک وقت مقرر کے لیے کرایہ پر دی گئی تھی جب وقت آیا بھٹیاری نے نوٹس دے کر ان کو نکلوا دیا، اب یہ بیک بنی و دو گوش وہاں سے گھر کو چل دیے جو کچھ ساری عمر میں کمایا تھا وہ اس کوٹھری میں غارت کر آئے، گھر گئے تو دیکھا کہ بچے بھوکے ہیں اور جو مکان رہنے کا تھا اور جس میں ساری عمران کو کاٹنی تھی وہ گر چکا، بیوی الگ کوس رہی ہے بچے الگ بھوک کے مارے غل مچا رہے ہیں یہ حالتیں دیکھ کر ان پر جو قیامت گزر رہی ہے وہ ان کا دل ہی جانتا ہے اب بچوں کے لیے اور اپنے لیے کچھ کھانے کو لانا چاہتے ہیں، بازار گئے تو پیسہ پاس نہیں، بازار میں طرح طرح کی چیزیں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے مگر کیا کریں:

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر　　　تہیدست را دل پراگندہ تر

(جس طرح بازار طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوگا اسی طرح تنگ دست شخص کا دل زیادہ پریشان ہوگا)

بس اب روتے ہیں اور کف افسوس ملتے ہیں اور یاد کرتے ہیں کہ ہم اس کمائی کو جو اس کوٹھری میں لگا آئے یہاں لاتے تو کیا لطف ہوتا ہم بھی اوروں کی طرح چین کرتے اور مزے کی زندگی بسر کرتے، کوئی ایسی صورت ہو کہ جو روپیہ وہاں لگایا تھا آدھا تہائی ہی مل جاوے تو وہاں سے لے آویں مگر فرض کر لیا جاوے کہ اس سرائے کے احاطے میں ایسا دروازہ ہے کہ جب وہاں سے کوئی چل دیتا ہے تو اس دروازہ سے نکل تو جاتا ہے مگر لوٹ کر پھر اس میں نہیں جا سکتا، اب کوئی صورت نہیں کہ وہاں پہنچیں۔ بس اب ایک ایک گھڑی کا ٹنا مشکل ہے بازار کی دکانوں پر نظر اٹھاتے ہیں اور حسرت کے ساتھ نیچے کر لیتے ہیں اور ایسی ندامت ہے جس کا کچھ تدارک نہیں ہوسکتا۔ حضرت قیامت میں یہی ہوگا قیامت ایک بازار ہے جس کو شیخ سعدی کہتے ہیں:

قیامت کہ بازار مینو نہند منازل باعمال نیکو دہند

(قیامت کے دن بازار لگائیں گے' نیک اعمال کے مطابق مراتب عطا کریں گے)

اس بازار میں ایسی ایسی چیزیں ہیں جو کہیں بھی نہیں ہو سکتیں اور ان کا خیال بھی کسی کو نہیں آ سکتا ان کے خریدنے کے لیے وہاں کے سکہ کی ضرورت ہوگی وہاں کا سکہ اعمال ہے جب وہاں پہنچے تو یہ سکہ ہاتھ میں نہیں ان چیزوں کو دیکھ دیکھ کر جو کچھ حسرت ہوگی وہ ظاہر ہے۔

اہل اللہ کا تقویٰ طہارت

حسرت پر ایک مفید حکایت یاد آئی وہ سب کے مذاق کے مناسب تو نہیں ہے مگر نتیجہ خیز ضرور ہے اس سے اللہ کے بندوں کا تقویٰ طہارت معلوم ہوتا ہے اور اس کا پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کی نظر کس درجہ دقیق ہوتی ہے۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بزرگ کا لڑکا مدرسہ میں پڑھتا تھا' یہ بزرگ ایک دفعہ اس کے پاس گئے وہ اس وقت حجرہ میں نہ تھا انہوں نے دیکھا کہ حجرہ میں ایک روٹی رکھی ہے اس کی ہیئت سے سمجھے کہ یہ روٹی بازار کی ہے خیر بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد لڑکا آیا اور سلام کیا تو انہوں نے جواب نہیں دیا اور کہا کہ میں تجھ سے نہ بولوں گا تو روٹی بازار کی کھاتا ہے اس نے کہا حضرت یہ روٹی میری نہیں ہے میرا ایک اور شریک ہے جو اسی حجرہ میں رہتا ہے اس کی ہے کہا تو تو ایسے کی صحبت میں رہتا ہے جو روٹی بازار کی کھاتا ہے صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے تو اس قابل نہیں کہ تجھ سے کلام کیا جائے (یہ کوئی شرعی فتویٰ نہیں ہے کبھی کوئی حکم لگا دے کہ بازار کی روٹی کھانا ناجائز ہے ایک اہل دل کا حال ہے) اور اس میں انہوں نے ایک ایسی باریک بات فرمائی تھی جس تک ہم جیسوں کی نظر نہیں پہنچتی وہ یہ کہ بازار میں جو روٹی بکتی ہے اس کے سامنے سے بہت لوگ گزرتے ہیں جو بھوکے ہوتے ہیں اور اس کو خرید نہیں سکتے اس لیے حسرت سے اس پر نظر کرتے ہیں جس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے تو جو چیز سبب بنے مساکین کی دل آزاری کا اس میں برکت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے اس کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ کس درجہ باریک بات ہے واقعی یہ علوم بجز اہل اللہ کے کسی کو میسر نہیں ہوتے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ فتویٰ نہیں ہے کہ بازار کی روٹی کھانا منع ہے مگر حتی الامکان اگر اس کا خیال رکھا جاوے کہ بازار کی چیز نہ کھاویں گھر بنا کر کھاویں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ حکایت حسرت کے لفظ پر یاد آ گئی تھی اس حکایت میں اہل

اللہ کی ہمدردی اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اہل اللہ کی باریک بینی کی حکایات

اس پر ایک اور حکایت یاد آئی کہ ایک بزرگ نے ایک عورت سے نکاح کا پیغام دیا مگر بات طے نہ ہوئی اور ان سے نکاح نہ ہوا بلکہ ایک اور جگہ اس عورت کا نکاح ہو گیا تو ان بزرگ نے آ کر اس دوسرے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑے کہ مجھ سے بڑا قصور ہوا اس نے کہا خیر تو ہے کیا ہوا کہا قصور یہ ہے کہ میں نے ایسی عورت کو پیغام دیا جو علم الٰہی میں آپ کے لیے مقدر تھی اس طرح سے وہ آپ کی بیوی تھی۔ مجھ سے یہ گستاخی ہوئی کہ اس کا ارادہ کیا یہ بات ظاہراً ایک بے عقلی کی سی معلوم ہوتی ہے ایک عورت کو مختلف آدمی پیغام دیا ہی کرتے ہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پیغام دینا برا تھا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس دوسرے شخص کو جس سے کہ اس کا اب نکاح ہوا ہے اس عورت سے پیغام دینے میں تو کچھ برائی ہو بھی سکتی ہے کیونکہ پہلے والے کا حق گو نہ ثابت ہو چکا ہے لیکن یہ ظاہر بینوں کی بات ہے ان بزرگ پر خوف خدا اور حقیقت شناسی غالب تھی انہوں نے امر مقدر کو ایسا ہی سمجھا جیسے محقق کو یعنی جیسے نکاح شدہ عورت کو پیغام دینا اور اس کا برا ہونا ظاہر ہے اس واسطے اس سے معافی مانگی۔ اس قصہ میں یہ نظر ہوتی ہے اہل اللہ کی ان کو علوم القا ہوتے ہیں اور دل ان کا اتنی خفیف بات کو بھی گوارا نہیں کرتا۔

مصرع خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

یہ انہی کے حالات ہیں انہی کو اتنا علم تھا اور انہی کو اتنی ہمت بھی تھی اور آج کل کیا منہ ہے کہ ان کی ریس کی جاوے اتنی ہمت کہاں اس لیے آج کل بعض لوگوں کو بوجہ ہمت عمل نہ ہونے کے زیادہ علم بھی مضر ہوتا ہے کیونکہ ان کا عمل علم کی برابر نہیں ہوتا۔ لہٰذا بجائے اصلاح کے اور الٹا تکبر اور خود بینی اور دعویٰ تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ کی باریک بینی پر ایک اور حکایت یاد آئی ایک بزرگ کی بی بی تیز مزاج تھی، بہت برا بھلا کہتی اور وہ ہمیشہ حلم سے کام لیتے۔ ایسے بزرگ کی ایسی بی بی اس تیز مزاجی پر حکایت کے بیچ میں ایک اور حکایت یاد آئی کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے ان کی بی بی نہایت بری اور بد مزاج تھی۔ ایک دن انہوں نے جھلا کر کہا تو بڑی کم بخت ہے کہ باوجود ایسے سامان اصلاح کے تیری اصلاح نہ ہوئی اس نے کہا میاں کم بخت تم ہو گے کہ تم کو ایسی بی بی ملی میں تو بڑی خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسا خاوند

ملا۔ اس پر ایک اور حکایت یاد آئی ایک ایسے ہی میاں بی بی تھے کہ میاں خوبصورت تھے اور بی بی بدصورت تھی، میاں ظریف بھی تھے ایک دن بولے کہ ہم دونوں جنتی ہیں کیونکہ میں جب تمہیں دیکھتا ہوں صبر کرتا ہوں اور تو جب مجھے دیکھتی ہو تو شکر کرتی ہو اور صابر اور شاکر دونوں جنتی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں حکایتیں اس حکایت کے بیچ میں آ گئی تھیں وہ اصل حکایت یہ تھی کہ ان بزرگ کی بیوی بہت تیز مزاج تھیں اکثر اوقات بیچارے تنگ ہوا کرتے تھے ایک دفعہ بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہے اس کو طلاق دیدیجئے، فرمایا بھائی دل میں تو بہت دفعہ آیا لیکن یہ سوچا کہ میں نے اس کو طلاق دے دی تو شاید یہ کسی سے نکاح کرے وہ دوسرا اس بلا میں پھنسے گا بجائے اس کے کہ دوسرے کو تکلیف ہو مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی اس تکلیف میں مبتلا رہوں اور دوسروں کے لیے سپر رہوں، یہ ہے باریک بینی اور یہ ہیں اخلاق جن کو حقیقی اخلاق کہنا چاہیے۔ آج کل لوگ اخلاق اور تمدن اور تہذیب کے بڑے مدعی ہیں۔ غور کر لیجئے کہ یہ اخلاق ہیں یا آج کل کے اخلاق، آج کل اخلاق کہتے ہیں نرم بولنے کو اور بار بار جھکنے کو اور آداب اور سلام۔

ظاہری تواضع

اخلاق پر ایک قصہ یاد آیا ایک گاڑی بان اپنی حکایت بیان کرتا تھا کہ ایک مولوی صاحب سے کریما پڑھا کرتا تھا اس میں تواضع کا بیان آیا۔ مولوی صاحب نے سبق پڑھا کر اگلے دن سنا اور پوچھا کہ بتلا تواضع کس کو کہتے ہیں، کہا جی کوئی آیا اس کو حقہ دے دیا، پان کھلا دیا، بٹھا لیا، انہوں نے خوب پیٹا، اس قصہ کو سن کر تو لوگ ہنستے ہیں کیونکہ ایک جاہل اور گنوار کا قصہ ہے لیکن آج کل کے تعلیم یافتوں کے اخلاق اور تواضع دیکھیے تو ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ نہیں جس کو اس گنوار نے تواضع کہا تھا جھکتے بہت ہیں اور نرمی سے بولتے ہیں لیکن دل میں تکبر بھرا ہوا ہے اور جس کے سامنے جھکتے ہیں اور نرم بولتے ہیں اس کو اپنے سامنے سمجھتے بھی کچھ نہیں، بڑا اپنے آپ ہی کو سمجھتے ہیں حالانکہ تواضع کے معنی فروتنی اور انکسار کے ہیں یعنی اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا اور اخلاق مع الخلق کی حقیقت ہے دوسرے کی رعایت اپنے آپ سے زیادہ کرنا۔

اب دیکھ لیجئے کہ یہ دونوں چیزیں آج کل کے لوگوں میں کہاں تک موجود ہیں بس جو کچھ ہے زبانی جمع خرچ ہے میں کہتا ہوں کہ آج کل کے جو کچھ اخلاق وہ صورت ہے اخلاق کی اور حقیقت کا اس میں پتہ بھی نہیں حقیقی اخلاق وہ ہیں جو ان بزرگوں میں تھے جن کی حکایتیں آپ نے سنیں ظاہر میں وہ لوگ اتنے نرم اور جھکنے والے نہ تھے مگر اس کا اہتمام رکھتے تھے کہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے چاہے اپنے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑے مگر آج کل مذاق ایسا بگڑا ہے کہ اگر حقیقی اخلاق کسی میں ہوں تو وہ نظر میں نہیں آتے لوگ بزرگوں کے یہاں جاتے ہیں اور ان کی سادگی اور بے تصنعی دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور شکایت کرتے ہیں کہ وہ تو ایسے خشک اور مغرور ہیں کہ کسی کو منہ بھی نہیں لگاتے اور جو ان کے ساتھ چار گھنٹہ چڑ بڑ کرتا رہے اور خوب آؤ بھگت کرے وہ خلیق مانا جاتا ہے چاہے یہ سب کچھ صرف ظاہرداری اور تصنع اور بناوٹ ہی ہو اور کام کی بات ایک بھی نہ ہو اور وقت پر ذرا بھی کام نہ آوے ایسے آدمیوں کی طرف بڑا اعتقاد ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک خلق کے معنی وہی ہوئے جو اس گنوار نے کہے تھے کہ حقہ پلا دینا اور پلان کھلا دینا۔

اخلاق اور ہی چیز ہیں

صاحبو! اخلاق اور ہی چیز ہیں صرف صورت بنا لینے کا نام اخلاق نہیں' اخلاق تو وہ ہیں جو دل میں ہوں بزرگوں میں یہی اخلاق ہوتے ہیں کہ جڑ تو ان کی دل میں ہوتی ہے اور آثار ان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتے ہیں مگر نہ اتنا جتنا کہ اہل تصنع میں ہوتا ہے اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دہلوی مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے ان کا گھر مکہ معظمہ میں میں نے بھی دیکھا ہے بہت گلیوں کے اندر ہے ان کی عادت یہ تھی کہ جو کچھ روپے پیسہ ان کے پاس تھا وہ سب ایک تھیلی میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اس میں روپیہ بھی ہوتے اور دونی بھی اور چونی بھی غرض جو کچھ نقد ان کے پاس تھا وہ سب اس تھیلی میں تھا' جب بازار جاتے تب بھی وہ تھیلی ساتھ جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کچھ محبت اہل اللہ کو نہیں ہوتی کوئی دنیادار ہوتا تو مال کو چھپا کر رکھتا' زمین میں گاڑ دیتا یا صندوق میں تالا لگا کر رکھتا مگر یہاں کچھ بھی نہیں اس کی پرواہ ہی نہیں کہ کوئی دیکھ لے گا اور چھین لے گا یا چرا لے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اہل اللہ کی لطافت

ایک دن بازار سے کچھ خریدا اور دام نکالنے کے لیے ساری تھیلی الٹ دی' دام کی قدر نکال کر باقی پھر اس میں بھر لیا' کسی بدو کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ ساتھ ہو لیا جب وہ گلیوں میں پہنچے تو ایک دم اس تھیلی کو ان کے ہاتھ سے چھین بھاگا' ان حضرت نے اتنی بھی پرواہ نہ کی کہ اس کا تعاقب کرتے یا غل مچا دیتے تو محلہ میں سے آدمی نکل آتے اور اس بدو سے تھیلی چھین لیتے یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ان کا تھیلی کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا مال کی محبت کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ بعض دنیا داروں کو دیکھا جاتا ہے کہ اشرفیاں بازو پر باندھے رہتے ہیں کیونکہ وہ ان کو نہایت محبوب ہوتی ہیں ذرا دیر کو بھی ان کا جدا کرنا گوارا نہیں کرتے' یہاں تو دنیا سے کچھ تعلق ہی نہ تھا تھیلی جاتی رہی یا اپنے گھر میں آ گئے قدرت خدا دیکھئے کہ دنیا دار کیا کچھ حفاظت کرتے ہیں تالے صندوق پہرہ چوکی رکھتے ہیں اور یہاں کچھ بھی نہ تھا مگر یہاں خدائی پہرہ تھا بدو وہ تھیلی لے تو گیا مگر اب اس کو گلیوں میں راستہ نہیں ملتا' جدھر جاتا ہے' ادھر گلی بند' ہمایوں کے مقبرہ کی بھول بھلیاں ہو گئی کہ اس میں چلے تو جاؤ مگر نکل نہیں سکتے' بےچارہ بہت حیران پھرا مگر راستہ نہیں ملا اب تو ہوش درست ہوئے اور سمجھا کہ یہ کوئی خدا کا بندہ ہے۔ مصرع جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا' دنیا دار ایسے لوگوں کے معتقد جوتے کے زور سے ہوتے ہیں اسی واسطے دیکھا ہوگا کہ آج کل لوگ مجذوبوں کے زیادہ معتقد ہوتے ہیں کیونکہ وہ سیدھی طرح بات نہیں کرتے گالیاں دیتے ہیں' پتھر مارتے ہیں واہی تباہی بکتے ہیں سو ان کی خوشامدیں ہوتی ہیں ہاتھ جوڑے جاتے ہیں اور رہے بیچارے مولوی تو گھنٹوں سر ماریں' اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین بیان کریں مگر کسی کو بھی اعتقاد نہیں ہوتا اور وہ ڈنڈے مارتے ہیں اور اعتقاد بڑھتا جاتا ہے غرض سیدوں کی پوچھ نہیں جب کوئی دباؤ پڑتا ہے تب اعتقاد ہوتا ہے۔

آخر وہ بدو روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے اسی گھر پر گیا جس میں شاہ صاحب گئے تھے اور پکارا اپنی تھیلی لے لو مگر خبرے نباشد کئی بار پکارا مگر جواب نہیں ملا' پکار کر کہا معاف ہی کر دو مگر خبر ندارد۔ اب یہ سمجھے کہ میں نے تمام حجت کر دیا اب میرے اوپر کوئی الزام نہیں رہا اگر کسی کو لینا ہوتا تو لے لیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاف کر دیا یہ خبر نہیں کہ ان کا محافظ کوئی اور ہے اس کی معافی

کی بھی ضرورت ہے۔ یہ معاف بھی کر دیں تو وہ معاف نہیں کرتا بعض جرائم کی مدعی سرکار ہوتی ہے ان میں صاحب حق کے معاف کرنے سے بھی مجرم بری نہیں ہوتا۔ خیر اس نے سمجھا کہ میں اپنا کام کر چکا اور تھیلی لے کر چلا لیکن راستہ پھر نہیں ملتا' اب بہت پریشان ہوا۔ ایک اور تدبیر نکالی کہ محلہ میں کھڑے ہو کر غل مچایا کہ دوڑیو مجھے لوٹ لیا اور مجھ پر ظلم کیا محلے والے نکل آئے کہ کیا بات ہے' پوچھا کس نے ظلم کیا' کہا یہ شخص جو اس گھر میں رہتا ہے اس نے ظلم کیا اس کو بلاؤ لوگوں نے باوجود اس کی تکذیب کے اتمام حجتہ کے لیے آواز دی شاہ صاحب نکلے اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ انہوں نے مجھے پر ظلم کیا ہے لوگوں نے پوچھا کیا ظلم کیا' کہنے لگا میں ان کی تھیلی چھین کر بھاگا تھا تو مجھ کو راستہ نہیں ملتا' ان سے کہو اپنی تھیلی لے لیں اور وہ تھیلی سامنے رکھ دی کہ یہ لے لو شاہ صاحب نے کہا میری نہیں ہے میں کیسے لے لوں۔

اب لوگ حیران ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک شخص اتنا روپیہ دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تمہارا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ میرا نہیں' یہ عجیب مقدمہ ہے دنیا میں تو مقدمے اس طرح کے ہوا کرتے ہیں کہ ہر فریق یہ دعویٰ کیا کرتا ہے کہ روپیہ میرا ہے مگر یہاں اس کا عکس ہے کہ ہر فریق یہ کہتا ہے کہ میرا نہیں۔ محلے والوں نے کبھی دیکھا تھا کہ یہ تھیلی شاہ صاحب کے ہاتھ میں رہا کرتی ہے اس واسطے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ ملک شاہ صاحب ہی کی ہے مگر وہ انکار کرتے ہیں تو وہ حیران ہوئے کہ یہ کیا بات ہے' کسی نے پوچھا کہ یہ تھیلی تو آپ ہی کی ہے کہا ہاں میری ہی تھی مگر اب نہیں ہے۔ وجہ یہ کہ جب یہ شخص میرے ہاتھ میں سے اس کو چھین کر بھاگا مجھے خیال ہوا کہ یہ شخص گنہگار رہوا اور اس کے بدلے دوزخ میں جائے گا۔ اس سے مجھے نہایت قلق ہوا کہ ایک مسلمان میرے سبب دوزخ میں جائے۔ لہٰذا میں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا کہ اللہ یہ مال میں اس کو ہبہ کرتا ہوں اور بعد ہبہ کے قبضہ بھی ہو گیا اس لیے اب یہ مال اس کی ملک ہو گیا اور ہبہ میں رجوع جائز نہیں تو اب میں اس مال کو کیسے واپس لوں۔ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیجئے کہ اگرچہ یہ مال ہبہ کر دیا گیا تب بھی اس صورت میں رد جائز ہے کیونکہ ایجاب سے ہبہ تام نہیں ہوا اور قبول پایا نہیں گیا۔ پھر خاص کر اس صورت میں کہ موہوب لہ رضا مندی سے خود واپس کر رہا ہے تو یہ درحقیقت رجوع ہے ہی نہیں لیکن

آنحضرت نے صرف اپنے ایجاب کو مورث شبہ اور صورت رجوع کو مشابہ رجوع حقیقی کے قرار دے کر اس سے احتیاط فرمائی۔

ان حضرات کی طبیعت ایسی لطیف ہوتی ہے کہ عدم جواز کے شبہ کو بھی گوارا نہیں کرتی اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جو ناجائز چیز کے ساتھ کرتے ہوں۔اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو معمولی آدمی ہیں کہ کھانے پینے میں صفائی کا چنداں اہتمام نہیں کرتے اور بعض نفیس مزاج ایسے ہوتے ہیں کہ پانی ان کے سامنے ذرا میلے برتن میں بھی لایا جاوے تو ان کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی حالانکہ پانی میں کچھ میل نہیں ہے مگر برتن کی صورت دیکھ کر ان کی طبیعت پانی سے بھی ہٹ جاتی ہے۔اسی طرح ان حضرات کا ادراک ہوتا ہے کہ اگرچہ کوئی فعل معصیت نہ ہو لیکن ذرا سا شبہ اور نام معصیت کا اس میں شامل ہوجانے سے ان کی طبیعت اس سے ہٹ جاتی ہے۔ یہ اس واسطے کہہ دیا گیا کہ ان پر کوئی ناواقفی احکام یا غلو فی الدین کا اعتراض نہ کرے۔اہل اللہ پر اعتراض نہ کرو ان کی کوئی بات ظاہراً خلاف بھی دیکھو تو جلدی نہ کرو' انتظار کرو ان کو حق تعالیٰ نے فہم سلیم دیا ہے وہ نشیب وفراز کو تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔تھوڑی دیر صبر کرو ان کے فعل میں ضرور کچھ حکمت نکلے گی۔ یہ حضرات دور تک پہنچتے ہیں۔دیکھئے ان بزرگ کی نظر کہاں پہنچی کہ اس شخص کی تکلیف کا خیال ہوا کہ یہ دوزخ میں جائے گا اور میری وجہ سے اس کو عذاب ہوگا' اس واسطے وہ مال اس کو ہبہ کردیا۔کیا ٹھکانا ہے اس باریک بینی کا اور اس رحم کا یہ حضرات اپنے اوپر سخت ہوتے ہیں اور دوسرے کے اوپر بے حد نرم' دوسرے کی ذراسی تکلیف بھی ان سے دیکھی نہیں جاتی اور اگر کہیں سختی بھی کرتے ہیں تو وہ سختی ان کی واقع میں سختی نہیں ہوتی کیونکہ دوسرے کے نفع کے لیے ہوتی ہے۔اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے ڈاکٹر پھوڑے کا آپریشن کرتا ہے کہ اس سے مریض کو تکلیف ہوتی ہے اور دیکھنے والے بھی اس کو بے رحمی اور قصائی پنا کہتے ہیں۔حتیٰ کہ بعض نرم طبیعتیں تو آپریشن کرتے ہوئے دیکھ بھی نہیں سکتیں لیکن درحقیقت یہ بے رحمی نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر جانتا ہے کہ ابھی تو پھوڑا ہے اگر آپریشن نہ کروں گا تو سارا عضو سڑ جائے گا اور سب کو کاٹنا پڑے گا تو وہ اس ذرا سے آپریشن کی بدولت سارے عضو کو کٹنے سے بچاتا ہے تو یہ رحم ہوا یا بے رحمی۔ یہ اگر بے رحمی ہوتی تو مریض کے گھر والے اور ماں باپ اس کو ڈاکٹر کے

پاس کیوں لے جاتے اور کیوں فیس دیتے یہ اچھی بے رحمی ہے کہ ہاتھ جوڑتے ہیں اور نخرے اٹھاتے ہیں اور روپیہ خرچ کرتے ہیں اور آپریشن کراتے ہیں۔

ہاں صورت بے رحمی کی ضرور ہے مگر درحقیقت رحم ہی ہے اسی طرح ان حضرات کی سختی ہوتی ہے کہ ظاہراً سختی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت رحم اور ہمدردی ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر آج ایسا نہ کیا جائے گا تو کل کو یہ شخص جہنم میں جائے گا اس واسطے اس تھوڑی سی سختی کو اس کے واسطے پسند کرتے ہیں جس کی بدولت وہ دائمی عذاب سے بچ جاتا ہے اور سچی بات چھپی بھی نہیں رہتی ان کا برتاؤ کسی کے ساتھ کیسا ہی روکھا ہو لیکن تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں نفسانیت نہ تھی بلکہ محض للّٰہیت اور ہمدردی ہی تھی اس واسطے یہ روکھا برتاؤ بھی کسی کو ناگوار نہیں ہوتا اور خواہ مخواہ اس کے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور ہاتھ جوڑتے ہیں کہ میرے اوپر بھی سختی کیجئے کیونکہ جان جاتے ہیں کہ ان کی سختی بھی نرمی ہے۔ غرض ان حضرات کو اس قدر ہمدردی ہوتی ہے کہ ان بزرگ نے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف اتنے سے خیال پر چھوڑ دی کہ اس بدو کو عذاب ہوگا۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہے۔ یہ ہیں اخلاق حقیقی ایسے لوگ باتیں بنانے والے اور تیز طرار اور چرب زبان نہیں ہوتے۔ ظاہر میں روکھے اور کم عقل معلوم ہوتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کیسے روکھے ہوتے ہیں کہ ساری عمر کی کمائی ایک بدو کو دیدی اور عاقل اور فہم کیسے کہ کہاں نظر پہنچی ان کو اخلاق کہنا چاہیے۔

آخرت ایک بازار ہے

یا آج کل کی طرح آؤ بھگت کرنے اور بار بار جھکنے اور آداب تسلیمات کو یہ تو اس گاڑی بان کی سی تواضع ہے جس کو گنوار کہا جاتا ہے مگر یہ تعلیم یافتہ بھی اس سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اہل اللہ کے حالات کو پڑھیے تو معلوم ہو کہ اخلاق ایسے ہوتے ہیں کہ تیز مزاج بی بی کے ساتھ ساری عمر نباہ دی اور دوسرے کی اس مصیبت کو پسند نہ کیا۔ اور ایک عورت سے پیغام دینے پر نادم ہوئے کہ وہ علم الٰہی میں دوسرے کے لیے تھی اور بازار کی روٹی کھانے کو پسند نہ کیا کہ یہ بہت سے حاجت مندوں کے لیے حسرت کا باعث ہوئی ہے یہ سب بیان استطراداً آ گیا۔ بیان یہ تھا۔

ع ...... کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر

(بازار جس طرح بھرتا اور پُر رونق نظر آتا ہے تہی دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوتا ہے)

اور اس سپاہی کی مثال دی گئی تھی جس نے پانچ ہزار روپیہ کمایا اور سب سرائے کی کوٹھڑی کی آرائش میں لگا دیا اور وقت ختم ہونے پر بھٹیاری نے نکال باہر کیا۔ اب یہ بال بچوں کے پاس گئے تو ہاتھ میں کچھ بھی نہیں' بازار میں گئے تو دیکھ دیکھ کر حسرت ہو رہی ہے۔ حسرت پر ایک قصہ چھڑ گیا تھا اس کی مناسبت سے دوسرا اور تیسرا قصہ آ گیا اور بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی مگر خیر کچھ حرج نہیں کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا' بہت سی کام کی باتیں کانوں میں پڑ گئیں۔ مقصود یہ تھا کہ آخرت ایک بازار ہے اور اس کا سکہ اعمال ہیں۔ اگر یہ سکہ پاس نہ ہوگا تو آدمی کس چیز سے وہاں کی نعمتوں کو خریدے گا ہم کو اس سکہ کے فراہم کر لینے کی پروا نہیں ہمارے' ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ دنیا کی سرائے میں لگائے چلے جاتے ہیں تو ہماری حالت اسی مسافر کی سی ہے جس نے ساری کمائی سرائے کی کوٹھڑی میں لگا دی اور گھر گئے تو کچھ بھی نہ تھا' خوب سمجھ لو کہ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے بلکہ سرائے ہے اس میں اس سے زیادہ نہ لگاؤ جتنا تمہارے ایک رات کے بسر کرنے کے لیے کافی ہو ہمارا گھر وہ ہے جو دارالسلام ہے وہاں کے واسطے کچھ جمع کر لو' دنیا تو بہت ناقص گھر ہے یہ گھر راحت کے لیے بنایا ہی نہیں گیا' آخرت البتہ کامل گھر ہے اور راحت کا گھر اور دارالسلام ہے اس کو حق تعالیٰ جیسے علیم و قدیر نے امن و سلامت عن الآفات کے لیے بنایا ہے اس میں کوئی بھی آفت عادی اور غیر عادی اور موجودہ اور مفروضہ کوئی بھی نہیں ہو سکتی حق تعالیٰ کو اس کے موضوع کا علم بھی محیط و کامل ہے اور اس کو مع تمام متعلقات کے موجود کر دینے پر قدرت بھی کامل ہے پھر اس کو دارالسلام فرمایا ہے تو اس میں بتلا دیا کہ وہ گھر سلامت عن الآفات کے لیے کامل مکمل گھر ہے۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں "لهم دار السلام عند ربهم" (ان کے رب کے پاس ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے) یہاں تک کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ جنت امن و امان کا کامل گھر ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ ثمرہ ہے اعمال کا' بنا اس ثمرہ کی اعمال پر ہے تو جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی ثمرہ ہوگا۔ چنانچہ کل میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کے مراتب ہیں کیونکہ اسلام نام ہے مجموعہ اعمال صالحہ کا اور اعمال ہی سے اس کا کمال ہوتا ہے اور اعمال میں مراتب ہیں تو اسلام میں بھی مراتب ہو گئے۔

ترغیب حصول اسلام کامل

پس جیسا اسلام ہوگا ویسا ہی ثمرہ ہوگا' اسلام کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا اور ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ پس اسلام اور اعمال کی تکمیل کا اہتمام کرو تا کہ ثمرہ کامل میسر ہو اب ثمرہ کے کامل ہونے کا بیان سمجھئے۔ ثمرہ کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اولاً اور بلا عذاب ملے یعنی قیامت کے دن ابتداء بخشش ہو جائے اور ذرا بھی عذاب نہ اٹھانا پڑے یہ ثمرہ اسلام کامل ہی پر مترتب ہوگا اور اگر اسلام ناقص ہے تب بھی نفس ثمرہ تو مترتب ہوگا کیونکہ اسلام تو ہے ہی مگر نقصان کے ساتھ وہ نقصان یہ ہے کہ چند روز دوزخ میں جھلس کر جنت ملے گی اور ایک نقصان ثمرہ کا یہ بھی ہوگا کہ گو جنت ابتداء مل جائے لیکن اگر اعمال اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں تو وہ مرتبہ جنت میں نہیں ملے گا جو اعلیٰ درجہ کے اعمال پر ملتا یہ بھی ایک نقصان ہے مگر اس پر مت بیٹھ رہنا کہ چند روز دوزخ ہی میں رہ کر جنت مل جاوے گی یا گھٹیا درجہ ہی مل جائے گا۔ اعلیٰ درجہ کا حوصلہ کیوں نہ کرو دنیا میں کوئی اس پر قناعت نہیں کرتا کہ آدھی روٹی کھا کر بیٹھ رہے' دنیا میں تو پیٹ سے بھی زیادہ کھانا چاہتے ہیں۔ خصوصاً پرائے گھر میں چنانچہ عادت ہے کہ باہر کھانا زیادہ کھایا جاتا ہے اور یہ کوئی برا بھی نہیں ہے۔ یہ حرص میں داخل نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ گھر تو روزمرہ کھاتے ہی ہیں دونوں وقت کا یہ مشغلہ ہے تو کھانا کھانا گھر پر کوئی نیا کام نہیں ہے اور جو کام روزمرہ کا ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہتی اور اگر اس میں کوئی نیا رنگ آ جاتا ہے تو اس میں دل لگتا ہے۔ اسی کی ایک فرع ہے باہر کا کھانا کہ فی الجملہ نئی سی بات ہے اس واسطے طبیعت کو اس کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے نیز یہ بھی ہے کہ اپنے گھر میں کھانا پکتے ہوئے دیکھنے سے بھی طبیعت بھر جاتی ہے اس واسطے بھی کم کھایا جاتا ہے۔

میراث میں غصب مع مستورات

اسی پر بعض مذاہب کے فقہاء نے ایک مسئلہ کو مبنی کیا ہے مگر اس کے قبل ایک قاعدہ سمجھ لیجئے وہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی چیز کسی سے چھین لی اور پھر کسی طرح واپس کر دی۔ اس صورت سے کہ مالک کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ یہ چیز اصل میں میری تھی تب بھی یہ رد صحیح ہو گیا اور اس کا ذمہ اس مغصوب سے بری ہو گیا گناہ نہیں رہا۔ البتہ اس کے رد صحیح ہونے میں ایک

شرط یہ بھی ہے کہ وہ چیز بجنسہ واپس کی ہو نہ ایسا جیسے کہ آج کل لوگ بہنوں کا حصہ غصب کرتے ہیں کہ میراث میں سے ان کا حصہ نہیں دیتے اور اس کو ادا اس طرح کرتے ہیں کہ بھات میں اور دیگر رسوم میں روپیہ لگا دیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ان کا حق ادا ہو گیا اتنا ہم نے لیا بھی نہیں تھا جتنا ان کو لگا دیا اس سے ان کا حق ادا نہیں ہوا اور رسم کی بدعت علیحدہ رہی۔ خدا جانے اس سے کیا نفع ہے کہ خرچ اتنا ہی ہو جاتا ہے مگر بے قاعدہ اور شریعت کے خلاف۔ اگر یہی خرچ قاعدہ کے موافق ہوتا تو حق بھی ادا ہو جاتا اور کوئی گناہ بھی نہ ہوتا۔ اب اسے جس طرح خرچ کیا ہے اس سے نفع تو کچھ بھی نہیں اور گناہ مفت میں کمایا۔

آج کل رسوم کی حالت

اور رسوم کی یہی حالت ہے کہ دنیا کا بھی نقصان کیونکہ خرچ بہت ہوتا ہے اور آخرت کا بھی نقصان کیونکہ گناہ ہوتا ہے اور کیسی کیسی بیہودہ رسمیں ہیں بھات' چھوچھک' چوتھی چالا' ان کے ناموں ہی سے وحشت ہوتی ہے اور نام بتلا رہے ہیں کہ ہنود کی رسم ہے۔ غرض جو لاگت بھات میں لگائی گئی اس سے وہ مغصوب ادا نہیں ہوا کیونکہ وہ چیز بجنسہ واپس نہیں کی گئی (ہنس کر فرمایا واجب تو گیہوں اور روپیہ تھا اور دیا گیا بھات) غرض یہ ادا نہیں ہوا۔ البتہ اگر اطلاع کر کے اجازت لے جاوے یعنی صاحب حق سے یوں کہا جائے کہ تمہارا اتنا روپیہ یا فلاں چیز میراث میں کی ہماری ذمہ ہے اس کی جگہ اگر تم منظور کرو تو ہم یہ چیزیں جو بھات میں دی جاتی ہیں دے دیں اگر وہ بخوشی منظور کرے تو حق ادا ہو جائے گا لیکن اس میں بھی شرط یہ ہے کہ یہ اطلاع تنہائی میں کی جائے یہ نہیں کہ مجمع میں۔ اس سے کہا جائے کہ شرما حضوری اس کو مان لیں۔ غرض اس طرح سے اجازت لی جائے کہ بالکل طیب خاطر سے اور بلا لحاظ کسی کے وہ مان لے حتیٰ کہ اگر نقد روپیہ بھی اس کے سامنے رکھ دیں تب بھی اس چیز کو نقد پر ترجیح دے۔ تب یہ اجازت معتبر ہے ورنہ بلا طیب خاطر اجازت معتبر نہیں۔

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا اب وہ مسئلہ سنئے کہ اگر کسی نے کھانا کسی سے غصب کر لیا اور بلا اطلاع اس طرح واپس کر دیا کہ اسی کو کھلا دیا تو بعض آئمہ کے نزدیک یہ ادا نہیں ہوا کیونکہ ممکن ہے کہ اگر اس کو معلوم ہو جاتا کہ یہ میرا کھانا ہے تو کم کھاتا اور کچھ بچا لیتا۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ عادت عامہ یہی ہے کہ آدمی اپنا کھانا کم کھاتا ہے اور دوسرے کے گھر زیادہ کھاتا ہے۔ مگر ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ ایسے حبشیوں کی عادت کا اعتبار نہیں جو دوسرے کے گھر خواہ مخواہ زیادہ کھا جاتے ہیں اس لیے یہ غصب ادا ہو جاوے گا میں ان دونوں قولوں میں تطبیق دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں اکثر لوگ حریص نہ تھے اور اپنے گھر اور دوسرے کے گھر میں چنداں فرق نہ کرتے تھے لہٰذا اس وقت کے مناسب یہ فتویٰ تھا کہ اس صورت میں غصب ادا ہو گیا اور اب لوگ حریص ہیں اپنے گھر میں اور پرائے گھر میں ضرور فرق کرتے ہیں کہ دوسرے کا کھانا ضرور زیادہ کھائیں گے اور اپنا کھانا کم خرچ کریں گے اور بچائیں گے۔ لہٰذا آج کل فتویٰ اگر یہی ہو کہ اس کا کھانا اسی کو کھلا دینے سے غصب ادا نہ ہوگا تو گنجائش ہے کیونکہ اس کا نقصان ہوا اگر اس کو معلوم ہو جاتا کہ یہ میرا کھانا ہے تو ضرور اس میں سے کچھ بچاتا۔

پرائے کھانے کا ایک قصہ

اس پرائے کھانے پر ایک قصہ یاد آ گیا کسی شخص کو اس کے دوستوں نے تنگ کیا کہ ہماری دعوت کر جب اس کا کوئی عذر نہ سنا گیا اس نے منظور کیا مگر یہ کہا کہ دعوت میں عمدہ پوشاک اور عمدہ جوتے پہن کر آنا جب سب جمع ہو گئے اس نے کیا کیا کہ ان کی جوتیاں اٹھا کر حلوائی کے یہاں گروی رکھ دیں اور عمدہ عمدہ مٹھائیاں لا کر سامنے رکھ دیں اور سب نے مل کر مفت کا مال سمجھ کر خوب مزے سے کھائیں اور تعریف کرتے جاتے تھے کہ بڑی نفیس مٹھائی کھلائی وہ جواب میں کہتا حضرت آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے مہمان سمجھے کہ یہ تواضعاً کہہ رہا ہے۔ جیسا کہا کرتے ہیں کہ سب آپ ہی کا ہے کہ اس کے معنی حقیقی مراد نہیں ہوا کرتے بلکہ اپنے مال کو مخاطب کی طرف تواضعاً منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ جب مہمان وہاں سے اُٹھے تو دیکھا جوتیاں ندارد کہنے لگے خدا جانے جوتیاں کیا ہوئیں کہا حضرت میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ حضور ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ اب وہ سمجھے کہ یہ بالفظ تواضعاً نہ تھا بلکہ معنی حقیقی پر محمول تھا۔ اب مزہ معلوم ہوا اچھے اچھے کھانوں کا یہ چند مضامین اس لفظ پر ضمناً آ گئے تھے کہ خصوصاً پرائے گھر میں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ دنیا میں جب ادنیٰ ثمرہ پر اکتفا نہیں کرتے تو وہاں کے ثمرات کے درجہ کامل کو کیوں نہیں طلب کرتے اور یہاں

تو معطی کا کرم محدود ہوتا ہے اس لیے بعض اوقات زیادہ طلبی ناگوار ہونے لگتی ہے اور وہاں تو معطی وہ ذات ہے جس کا کرم غیر محدود ہے' کما بھی کہ جتنا زیادہ لو خوش ہوتے ہیں اور کیفاً بھی چنانچہ ایک کرم یہ بھی ہے کہ جہاں ثمرات کا وعدہ کیا ہے وہاں یہ بھی کہتے ہیں۔

اعمال کا صلہ

جزاء بما کانوا یعملون (بدلہ ہے جو وہ عمل کرتے تھے) اور "ان ھذا کان لکم جزاء" (یہ تمہارے لیے بدلہ انعام ہے) تاکہ بندہ شرمندہ نہ ہو۔ چنانچہ خود اس آیت میں بھی ہے جس کا بیان ہو رہا ہے "وھو ولیھم بما کانوا یعملون" (اور وہ ان سے محبت رکھتے ہیں ان کے اعمال کے سبب) اور جا بجا اسی قسم کے حالات آئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آخرت میں جو کچھ درجات اور نعمتیں ملیں گی وہ سب مومنین کے اعمال کا صلہ ہے۔ یہ غایت کرم ہے کہ خود نعمتیں دیتے ہیں لیکن احسان جتلانا نہیں چاہتے ایسے موقع پر بھی کوئی چوک جائے تو بڑا ہی کم قسمت ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسی جگہ تو لوٹ مچانی چاہیے قناعت چہ معنی دنیا دار العمل ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ثمرات کی سندیں ایک جگہ تیار کر کے رکھ دی ہیں اور اذن عام دیدیا ہے کہ جتنے چاہو لو اور ثمرات بے تعداد لوٹ لو پھر حیرت ہے کہ آدمی کیوں نہ لے اور کیوں بڑھ کر ہاتھ نہ مارے اور کیوں کامل درجہ کی کوشش نہ کرے۔ ادنیٰ درجہ پر بس کر کے کیوں بیٹھ رہے یا اتنی ہمت کیوں ہارے کہ کچھ عذاب ہی بھگت کر جنت مل رہے گی کامل درجہ کیوں نہ حاصل کرے کہ جنت ابتداء اور بلا عذاب ملے۔ یہ بیان ہوا "لھم دار السلام" (ان کے لیے سلامتی کا گھر) کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس کے معنی ہیں کامل سلامتی کا گھر۔ لفظ دار السلام ہی اس کمال پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ اول تو سلام مطلق ہے اور مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پھر دار کے لفظ کو اس کی طرف مضاف کیا گیا ہے جو محاورہ کے اعتبار سے اس معنی کو مفید ہے اور مراد اس سے جنت ہے جس کو حق تعالیٰ نے کامل امن کا گھر بنایا ہے وہاں خوف و خطر کا نام بھی نہیں۔ آگے عند ربھم (ان کے پروردگار کے یہاں) کو سمجھے اس کے معنی ہیں ان کے رب کے پاس مراد اس سے فی الآخرۃ تو معنی یہ ہوئے کہ ان کو دار السلام ملے گا۔ آخرت میں اس کو میں بیان

کروں گا کہ عند ربھم (ان کے پروردگار کے یہاں) سے مراد دار آخرت کیسے ہوا کیونکہ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ ان کے خدا کے پاس بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے کے لیے قرآن کے محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے میں نے جس بناء پر اس کا ترجمہ دار آخرت کیا ہے وہ آگے بیان کروں گا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عند ربھم (ان کے پروردگار کے یہاں) کا اطلاق متعدد معانی پر آتا ہے چنانچہ ایک معنی اور بھی ہیں۔

آیت افک پر ایک اشکال کا جواب

چونکہ اس کی تحقیق اہل علم کے سمجھنے کے قابل ہے اس لیے اس کو بھی بیان کرتا ہوں اس معنی میں عند اس آیت میں ہے "فاذلم یاتوا بالشھداء فاولئک عنداللّٰہ ھم الکاذبون" یہ آیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے افک کے قصہ میں ہے۔ قصہ طویل ہے اس کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں جتنا جزو اس قصہ کا یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو منافقین نے متہم کیا' کئی دن تک اس کا بہت چرچا ہوا۔ آخر ان کی برأت حق تعالیٰ نے قرآن میں اتاری اور منافقین کے بکواس کو رد کیا۔ اس رد میں یہ آیت بھی ہے "فاذلم یاتوا بالشھداء فاولئک عنداللّٰہ ھم الکاذبون" اس کا ترجمہ یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ گواہ نہیں لا سکے لہٰذا یہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں اس کا مدلول یہ ہوا کہ ان کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ چار گواہ نہ لا سکے۔ اب یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کذب کس کو کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کذب کے معنی حکایت خلاف واقع کے ہیں یعنی ایک کام واقع میں نہیں ہوا اور بیان کیا کہ ہوا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شہادت نہ لا سکنا مستلزم کذب ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کسی کو حرام کرتے دیکھا اور اس کی حکایت بیان کی مگر گواہ نہ لا سکا تو اس آیت کی بموجب تو وہ کاذب ہے لیکن یہ حکایت مطابق واقع کے ہے اس پر تعریف کذب کی صادق نہیں آتی اور آیت اس کو کاذب کہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ آیت میں عنداللہ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اور بلفظ دیگر حق تعالیٰ کے علم میں اور یہ مقدمہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے ورنہ علم صحیح نہ ہوگا تو عنداللہ کے مفہوم پر آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص بس

نے حرام کو دیکھ کر حکایت بیان کی واقع میں بھی جھوٹا ہے یعنی اس نے واقع میں حرام نہیں کیا کیونکہ علم الٰہی میں اس کو کاذب قرار دیا گیا ہے اور علم الٰہی مطابق واقع کے ہوتا ہے تو اب یہ لازم آتا ہے کہ (نعوذ باللہ) علم الٰہی خلاف واقع ہے۔ یہ ایک سخت اشکال ہے قرآن پر مگر الحمدللہ حق تعالیٰ نے اس کا بہت سہل جواب دل میں ڈال دیا جس کو سننے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ اشکال کچھ بھی نہ تھا۔ اس کی بناء اسی پر ہے کہ قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے۔ ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کردی جائے تو بالکل اطمینان ہوجاتا ہے اور سننے والا پھڑک اُٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہوجاتے ہیں۔ وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عنداللہ کے معنی یہاں ''فی علم اللہ'' (اللہ کے علم میں) کے نہیں ہیں بلکہ ''فی قانون اللہ'' (اللہ کے قانون) میں کے اور فی دین اللہ کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی' تہمت لگانے والوں کے لیے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ کاذب کا سا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ اشکال تو یہی تھا کہ علم الٰہی کا خلاف واقع ہونا لازم آتا ہے اور یہاں علم الٰہی مراد ہی نہیں صرف یہ معنی ہوگئے کہ قانون ان کو جھوٹا کہے گا' قانون ایک ایسی چیز ہے جس میں ضابطہ دیکھا جاتا ہے جس کے کچھ قواعد مقرر ہوتے ہیں کہ جب تک ان کے موافق کام نہ ہو اس کو معتبر نہیں مانا جاتا۔

قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت

چنانچہ تمام زمانہ کے عقلاء کا قانون ہے کہ کوئی بات بے ثبوت نہیں مانی جاتی خواہ واقع میں وہ بات بالکل صحیح ہی ہو اگر یہ قانون نہ ہو تو دنیا کا نظام ہی بگڑ جائے۔ ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کردے کہ اس نے میرا مال چرایا ہے۔ بس قاضی کو چاہیے کہ اس پر چوری کا جرم قائم کردے اور سزا دے دے۔ دوسرا دعویٰ کردے کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے بس قاضی فوراً اس کو قصاص میں مار ڈالے تو اس طرح تو ایک دن میں دنیا تہ وبالا ہوجائے' دنیا کا نظام قانون قواعد کی پابندی ہی سے رہ سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ایک شخص پر چار آدمیوں نے زنا کی شہادت دی اور یہاں تک کہا کہ ہم نے مرد اور عورت دونوں کو ننگے اور اوپر نیچے دیکھا مگر یہ نہیں کہا کہ دخول ہوتے دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور مدعا علیہ پر زنا کو ثابت نہیں کیا بلکہ ان گواہوں کو جھوٹا قرار دیا اور ان پر حد قذف جاری کی۔ اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ضابطہ پورا نہ ہوا اور شہادت کی جو شرائط تھی ایک جزو اس کا رہ گیا۔ وہ یہ ہے کہ کالمیل فی المکحلة دیکھا ہو حالانکہ ظاہر تو یہی ہے کہ جب مرد اور عورت ننگے ہو چکے تھے تو زنا بھی ضرور واقع ہوا جب ایسا موقع تھا کہ ننگے ہو سکے تو زنا سے کون مانع موجود تھا۔ یہ بات بظاہر قریب یقین ہی کی تھی لیکن اس پر بھی جب کہ آنکھ سے دخول ہوتے نہ دیکھا' گواہوں کے لیے زبان سے ان دونوں کو زانی کہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ چاروں گواہوں پر حد قذف لگائی گئی' آج کل لوگ صرف وہم وگمان پر حکم لگا دیتے ہیں اور جو سمجھ میں آتا ہے کسی کی نسبت خیال پختہ کر لیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہ بلا علماء اور مشائخ کے یہاں بہت ہے آج کل حضرت عمر ہوتے تو بکثرت علماء اور مشائخ کے درے لگتے' سب کی کرکری ہو جاتی اور یہ جو بڑے بڑے جبوں اور قلوں میں عیب چھپائے بیٹھے ہیں سب کی حقیقت کھل جاتی۔ اس بات میں بڑی احتیاط چاہیے کہ دوسرے کی نسبت کوئی برا خیال قائم کیا جائے اور زیادہ اہتمام کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ عادت اور طبعی بات ہے کہ اپنی طرف برا گمان کم ہوتا ہے اور دوسرے کی طرف اچھا گمان کم ہو جاتا ہے اکثر کوئی شخص جب اپنی طرف دیکھتا ہے تو نظر اپنے ہنروں اور محامد ہی پر پڑتی ہے اور جب دوسرے کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے عیبوں اور برائیوں پر ہی پڑتی ہے۔ جب یہ طبعی بات ہے تو ان دونوں میں غلطی ہو جانے کا بہت قوی احتمال ہے۔ لہٰذا سخت اہتمام کی ضرورت ہے کوشش کر کے صحیح طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ اپنے ہنروں کو کبھی نہ دیکھے صرف عیبوں ہی کو دیکھے اور دوسرے کے عیبوں کو کبھی نہ دیکھے صرف ہنروں ہی کو دیکھے بتکلف اس کی نگاہ داشت بہت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کرنے سے کچھ امید کی جا سکتی ہے کہ آدمی کی صلاح ہو جاوے۔ غرض بے ثبوت بات کہنے سے گناہ بھی ہوگا اور قانون شرعی تاوقتیکہ کافی

ثبوت با قاعدہ نہ ہو اس کو جھوٹا ہی کہے گا خواہ وہ بات واقع میں جھوٹی نہ بھی ہو یہ معنی ہیں عند اللہ کے یعنی فی قانون اللہ تو آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ تہمت لگانے والے چونکہ اپنے دعویٰ پر باقاعدہ شہادت نہ لا سکے۔ لہٰذا وہ قانون الٰہی میں جھوٹے کہے جاویں گے اور کذب کے احکام ان پر جاری ہوں گے۔ چنانچہ تین صحابہ کو جو بھولے پن سے اس قصہ میں شریک ہو گئے تھے حد قذف لگائی گئی اور منافقین چونکہ چالاکی سے اس شرارت میں حصہ لے رہے تھے بقول مشہور ثبوت نہ ہونے سے دنیا میں حد سے بچ گئے اور آخرت میں تو مزہ چکھیں گے۔ غرض اس تقریر کے بعد آیت پر کوئی اشکال نہیں رہا۔

فقہ کا ایک ضابطہ

اور فقہ کے بہت سے احکام کا یہی مبنیٰ ہے کہ بسا اوقات ضابطہ کے درجہ میں ایک حکم کو ثابت مانا جاتا ہے خواہ واقع میں کچھ بھی ہو۔ مثلاً دو عادل آدمی گواہی دیں کہ ہم نے ۲۹ کو چاند دیکھا ہے تو اب رمضان یا عید کو ثابت مانا جاوے گا۔ اگرچہ انہوں نے جھوٹی ہی گواہی دی ہو۔

لعان اور اس کا حکم

اسی طرح بسا اوقات ایک حکم منفی مانا جاتا ہے خواہ واقع میں ثابت ہی ہو۔ مثلاً ایک شخص کا ایک بچہ ہونے پر تہمت لگانے سے لعان ہوا تو اس بچہ کے نسب کی اس شخص سے نفی کی جاوے گی۔ خواہ واقع میں اسی کا ہو اس کی صدہا نظیریں موجود ہیں تمام کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے۔ بہشتی زیور میں کوئی ایسا مسئلہ لکھ دینا جرم قرار پاوے اور وہی مسئلہ اور اس کی صدہا نظیریں عربی کی کتابوں میں لکھی ہوں بلکہ ان کے اردو ترجمے میں بھی لکھے ہوں تو جرم نہیں۔ مثلاً بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ کسی عورت کے بچہ ہوا اور خاوند اس کا مدت سے غائب ہے تو اس بچہ کو ولد حرام نہ کہا جائے گا اس مسئلہ پر بڑا غل مچا ہے اور لوگوں کو بڑے بڑے اشکال ہوئے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بہشتی زیور میں کسی نے اپنی طرف سے اس کو لکھ دیا ہے یا فقہ کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ کتاب کو تو دیکھ لینا چاہیے تھا اور کتاب کو بھی نہ دیکھا جاوے تو یہ مسئلہ کوئی چھپا ہوا مسئلہ نہیں ہے مبتدی طالب علم بھی اس سے واقف ہیں۔ غرض یہ کہ بہشتی زیور میں اختراع کر کے یہ مسئلہ نہیں لکھا گیا بلکہ فقہ کی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

تعجب ان لوگوں سے ہے جو فقہ کو تسلیم کرتے ہیں اور بہشتی زیور پر اعتراض کرتے ہیں اور اسی فقہ کی کتاب کے ترجمہ پر اعتراض نہیں کرتے جس میں یہ مسئلہ لکھا ہے۔ سو بہشتی زیور پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے اگر اعتراض کرنا ہے تو فقہ پر کرو فقہ میں صاف لکھا ہے کہ اس صورت میں وہ بچہ ولد حرام نہیں کہا جائے گا جب تک کہ خاوند انکار نہ کرے کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے اور صرف انکار ہی نہیں بلکہ لعان ہوگا۔ باقاعدہ اس طرح کہ قاضی کے سامنے مقدمہ جائے گا' مرد اور عورت دونوں حاضر ہوں گے۔ مرد اس بچہ کی نسب سے انکار کرتا ہے مگر انکار کر کے چھوٹ نہیں جائے گا کیونکہ یہ انکار مستلزم ہے عورت کو حرام کار کہنے کو یعنی زنا کی تہمت لگانے کو اور بچہ کو مجہول النسب کر دینے کو اس کو شریعت نے کوئی معمولی بات نہیں قرار دیا کیونکہ تمام عمر کے لیے ایک عورت بے آبرو ہوتی ہے اور ایک بچہ مجہول النسب بنتا ہے۔ لہٰذا اس مرد سے چار دفعہ قسم لی جائے گی کہ خدا کی قسم میں اپنے اس دعویٰ زنا میں سچا ہوں اور اتنے پر بھی بس نہیں۔ پانچویں دفعہ یوں کہلایا جائے کہ میرے اوپر لعنت ہو خدا کی اگر میں جھوٹا ہوں۔ دیکھئے کس قدر سخت بات ہے کسی کے نسب میں طعن کرنا خیر یہ تو اس مرد کو قسمیں دی گئیں ابھی لعان ختم نہیں ہوا۔ اب عورت سے کہا جائے گا کہ چار دفعہ اس طرح قسم کھاوے کہ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ مرد جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یوں کہلایا جائے گا کہ خدا کا غضب ہو میرے اوپر اگر یہ سچا ہو۔

یہاں ایک نکتہ بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مرد سے تو یوں کہلایا گیا کہ لعنت ہو خدا کی میرے اوپر اگر میں جھوٹا ہوں اور عورت سے یوں کہلایا گیا کہ غضب ہو خدا کا' وہاں لعنت کا لفظ اور یہاں غضب کا اس کی کیا وجہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی زبان پر لعنت کا لفظ تو کثرت سے چڑھا رہتا ہے۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے زیادہ تر دوزخ میں عورتوں کو دیکھا اور اس کی وجہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا "وتکثرن اللعن"[1] یعنی تمہاری یعنی عورتوں کی عادت ہے کہ لعنت بہت کرتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ لعنت کا لفظ ان کی زبان پر عادتاً بہت چڑھا ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کثرت سے

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۸۳' الصحیح للمسلم الایمان: ۱۳۲)

عورتوں کی زبان پر یہ الفاظ رہتے ہیں خدا کی مار خدا کی پھٹکار وہی لعنت کا ترجمہ اس لیے لعان کے موقع پر اگر ان سے لعنت کا لفظ کہلایا جائے تو طبیعت ان کی کچھ ایسی نہ رُکے گی۔ لہٰذا بجائے لعنت کے غضب کے لفظ کو اختیار کیا گیا۔ واقعی قرآن ایسے متکلم کا کلام ہے کہ اس کو رگ رگ پرزہ پرزہ معلوم ہے۔ اس کو لعان کہتے ہیں اس کے بعد قاضی کہے گا "فرقت بینکما" یعنی میں نے تمام دونوں کو الگ کر دیا اور یہ بچہ اس مرد کا نہیں اب اس کا نکاح اور بچہ کا نسب زائل ہو گیا اور مان لیا جائے گا کہ یہ بچہ اس خاوند کا نہیں ہے اور پھر بھی اس سارے جھگڑوں اور قصوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ بچہ کا نسب اس سے قانوناً ثابت نہ رہا اور میراث وغیرہ کے احکام جاری نہ ہوں گے اس کے سوا کوئی اثر نہیں۔ حتیٰ کہ اب بھی یہ کسی کو عمر بھر جائز نہیں کہ اس عورت کو بدکار یا اس بچہ کو ولد الحرام کہے۔

کسی عورت پر تہمت لگانا سخت کبیرہ گناہ ہے

اور کتابوں میں وہ احتمالات بھی لکھے ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہو سکتا ہے کہ عورت بدکار نہ ہو اور بچہ ہو جائے۔ مثلاً یہ صورت ہوئی ہو کہ سوتی عورت سے کسی غیر شخص نے جماع کیا اور حمل ہو گیا تو اس وقت میں خاوند بھی سچا ہے کہ اس کا یہ بچہ نہیں ہے اور عورت بھی بے قصور ہے کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ گو اس قسم کے احتمالات بعید ہیں مگر امکان کے درجہ میں ضرور ہیں۔ احتیاط کے موقع پر ان کا لحاظ کیا جا سکتا ہے کسی عورت کو تہمت لگانا کوئی معمولی گناہ نہیں بلکہ بڑا کبیرہ ہے اس میں حد درجہ کی احتیاط کرنا ضروری ہے۔ شریعت نے اس بارے میں نہایت درجہ احتیاط کی ہے اور اگر اس صورت میں بھی جبکہ خاوند نے بچہ کے نسب سے انکار کیا ہے اور اس سے لعان کو کہا گیا اور اس نے منظور نہ کیا تو باوجود انکار کے بھی بچہ اسی کا کہا جاوے گا اور قاضی اس انکار کو نہیں مانے گا اور بچہ کو مجہول النسب نہیں کہے گا اور تمام احکام نسب کے جیسے میراث وغیرہ سب کو جاری کرے گا۔ غرض جب تک لعان نہ ہو اس وقت نسب ثابت رہے گا خواہ خاوند حاضر ہو اور نسب کی نفی کرے اور خواہ غائب ہو ہر حالت میں نسب ثابت ہوگا اور ثابت ہونے کے معنی وہی ہوں گے جو اوپر معروض ہوئے کہ قانوناً ثابت ہوگا مگر لوگوں کے ایسے مذاق بگڑے ہیں کہ یہ مسئلہ سن کر ہی فوراً بے سمجھے اعتراض کر دیتے ہیں کہ یہ کیسے

ہوسکتا ہے کہ مرد دس برس سے باہر ہو اور پھر بھی یہ بچہ اس کا کہا جائے اس اعتراض کی وجہ درحقیقت تو یہ ہے کہ دلوں میں خوف خدا اور دین سے مس اور احکام شرعی کی پرواہ نہیں ہے۔ زبان سے جو چاہا کہہ دیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ شریعت نے اس بارے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فراش کے ہوتے ہوئے نسب کو دوسری طرف نہیں لیجا سکتے یعنی جب تک کہ میاں بی بی کا تعلق موجود ہے نسب کو ثابت ہی کہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خاوند دو برس سے باہر ہے یہاں اس سے بچہ کیسے ہوگیا یہ بعید بیشک ہے مگر اُدھر گناہ جو موجود ہے کسی عورت کو حرام کار کہنا اور کسی آدمی کو مجہول النسب کر دینا سخت کبیرہ ہے اس کے حرام کار ہونے کا ثبوت کوئی کہاں سے لائے گا۔ اس واسطے بعید سے بعید صورت بھی ایسے موقعہ پر مان لی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی بعض صورتیں جو ممکن ہیں کتابوں میں لکھی ہیں مثلاً استخدام جن سے ایسا ہوسکتا ہے یعنی کسی کے جن تابع ہو اس نے عورت کو وہاں پہنچا دیا یا مرد کو یہاں لے آیا یا یہ کہ جن نے بوجہ عداوت ایسا کیا کہ بدنام کرنے کو عورت کو مرد کے پاس پہنچا دیا یا مرد کو عورت کے پاس پہنچا دیا اور حمل ہوگیا اور بچہ ہوا جنوں کا وجود ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی انسانوں کی طرح عداوت بغض وغیرہ اخلاق رذیلہ رکھتے ہیں تو اگر کسی جن کو کسی عورت سے عداوت ہو اور وہ ایسا کر گزرے اس غرض سے کہ عورت بدنام ہوجائے تو کیا عجب ہے یہ صورتیں بعید اور بہت بعید سہی مگر امکان کے درجہ میں ضرور ہیں۔ پھر جب ایک صورت ممکن ہے تو کس طرح کسی کو تہمت لگائی جائے۔ یہ حیلے بھی میں نے نہیں تراشے بلکہ انہی کتابوں میں لکھے ہیں جن سے بہشتی زیور ماخوذ ہے اور جو معترض کے نزدیک بھی مسلم ہیں سو جو کچھ اعتراض کرنا ہو ان کتابوں پر کیجئے اور جو کچھ تعجب ہو وہ ان کتابوں پر ہونا چاہیے نقل کرنے والا کسی بات کا ذمہ دار نہیں اور کسی اعتراض کا دفع کرنا اس کے ذمہ نہیں۔

صحیح النسب ہونے کے لیے وجود نکاح کافی ہے

غرض کتب فقہ سے اور ادلہ شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ اس صورت میں کہ مرد دس برس سے باہر ہے اور اس کی عورت کے بچہ پیدا ہوا تو یہ بچہ مجہول النسب نہیں ہے بلکہ اس کا نسب اسی شخص سے مانا جاوے گا اور تمام احکام نسب کے جاری ہوں گے۔ اس حکم میں

تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ کیسا حکم ہے سو اس تعجب کا رفع کرنا گو کسی طرح ہمارے ذمہ نہیں مگر میں تبرعاً اس کو بھی حل کر رہا ہوں کہ اس کہنے کا کہ یہ بچہ اس خاوند کا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقت میں اس کا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ قانون میں اس کا ہے اب سارے اشکال اور تعجب رفع ہو گئے اور نسب جب ثابت ہوگا اس کا ثبوت قانونی ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی بناء بالکل ایک خفی امر یعنی جماع پر ہے۔ لہٰذا اس کے ثبوت کے لیے اس کے ظاہری ذریعہ ہی کو کافی مانا جاوے گا یعنی نکاح کو اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس کو بالاتفاق صحیح النسب کہا جاتا ہے اور اس کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس میں بھی تو یہی ماننا پڑتا ہے کہ ظاہری سبب یعنی نکاح موجود ہے اس وجہ سے حقیقی سبب یعنی جماع کو بھی مان لیا گیا اور اس کی نسبت ناکح کی طرف کی گئی اور اس کو باپ کہا گیا ورنہ یہ علم کیسے ہوا کہ وہ بچہ واقع میں کس کا ہے حقیقی سبب کو تو کسی نے دیکھا نہیں اور ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ خاوند کے ہوتے ہوئے بھی دوسرے کا حمل ہو گیا۔

اس معنی کو تو حضرت عبداللہ بن سلام اس آیت کے متعلق کہتے ہیں "**یعرفونه کما یعرفون ابناء هم**" اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اہل کتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (بوجہ دلائل قویہ کے) ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں تو حضرت عبداللہ بن سلام کہتے ہیں کہ اپنے بیٹوں کے پہچاننے میں تو ہم کو کوئی شبہ بھی ہے۔ "**انا لاندری ماتصنع نساء نا**" یعنی ہم کو کیا معلوم ہے کہ ہماری عورتیں کیا کیا خیانت کرتی ہیں ہمارے پاس اس کی کون سی قطعی دلیل ہے کہ ہمارے بیٹے ہمارے ہی نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہمارے پاس قطعی دلیلیں موجود ہیں جن میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ غرض علم یقینی اس کا کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ یہ بچہ اپنے باپ کا ہی ہے۔ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے یا میاں بیوی کو ہے باقی دوسرے لوگ جس کو صحیح النسب مانتے ہیں اس کی نسبت کون سا علم یقینی رکھتے ہیں۔ بجز اس کے اس قاعدہ کو مان لیں کہ جائز طریقہ اور ذریعہ نسب کا ہوتے ہوئے کسی کی طرف بدگمانی جائز نہیں اور بشرط امکان نسبت باپ ہی کی طرف کی جائے گی اور امکان اس صورت متکلم کا اوپر ثابت ہو چکا ہے اور یہی مطلب ہے **الولد للفراش** کا لیجیے۔ عقلاً ثابت

ہوگیا کہ شرعی اصول کس قدر صحیح ہے۔اب تو معترض کو لینے کے دینے پڑ گئے ہوں گے کیونکہ اس شبہ سے تو اپنے ہی نسب میں کلام ہوگیا۔ذرا سوچ سمجھ کر بات کہنی چاہیے شریعت کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔غرض نسب کے بارے میں سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جائز ذریعہ ہوتے ہوئے اس کو باپ کے ساتھ ملحق کرنا چاہیے خواہ حقیقت میں کچھ ہی ہو اب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس کے معنی کیا ہیں کہ وہ بچہ جس کا باپ عرصہ سے غائب ہے اسی باپ کا ہے وہ معنی یہی ہیں کہ قانون میں اس کا بیٹا ہے۔گو حقیقت میں کچھ بھی معلوم نہیں۔

قانون بڑی چیز ہے

اور قانون بھی بڑی چیز ہے اگر ہر بات میں واقعیت پر نظر رکھی جائے تو دنیا کا کام چل ہی نہیں سکتا کسی کو کسی مال کا مالک کہا جاتا ہے تو کیا اس پر کوئی ایسی دلیل ہوتی ہے جس میں جانب مخالف کا احتمال ہی نہ ہو۔بہت سے بہت یہ کہ مثلاً جائیداد کی تحریر یعنی بیع نامہ موجود ہے مگر کیا اس میں کسی درجہ میں یہ احتمال نہیں ہے کہ فرضی اور جعلی ہو ایسے تو واقعات بہت ہوتے ہیں۔کوئی شاید کسی کو خیال ہو کہ اس پر شہادتیں موجود ہیں۔میں کہتا ہوں جیسے بیع نامہ بن سکتا ہے شہادتیں بھی بن سکتی ہیں۔غرض احتمال کو بڑی گنجائش ہے کوئی کام دنیا کا ایسا نہیں جس کے ثبوت میں کوئی قریب یا بعید احتمال نہ نکالا جا سکے۔سو اگر واقعیت پر نظر رکھی جائے تو تمام کام بند ہو جائیں۔لامحالہ قانون ہی کو اختیار کرنا پڑے گا۔

لفظ عند کا معنی

جس کی اصل صرف یہ ہے کہ ایک چیز کے دلائل صحیحہ دیکھ کر اس کا حکم کر دیا جاتا ہے گو اس میں احتمال جانب مخالف کا بھی ہو اب سب کے مسئلہ سے بھی شبہات جاتے رہے اور قانون کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔پس عند کے ایک معنی یہی حکم قانونی ہے جو اس آیت میں مراد ہیں۔ "**فاولئک عنداللہ ھم الکاذبون**" پس اس کے معنی یہ ہوگئے کہ درصورت پوری شہادت نہ لا سکنے کے قانون الٰہی میں یہ لوگ جھوٹے ہیں۔سو ایک تو معنی عند کے یہ ہوئے جس کے بیان میں استطراداً بہت سی زائد باتیں آ گئیں مگر نفع سے خالی نہیں اور بعض وقت عند کے معنی ایک اور بھی ہوتے ہیں وہ معنی قرب کے ہیں جیسے اس آیت میں ہے "**ان المتقین فی جنت ونھر**

فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" جس کا حاصل یہ ہے کہ متقین جنت میں اور نہروں میں اور عیش اور آرام میں ہوں گے حق تعالیٰ کے پاس۔ ظاہر ہے کہ یہ قرب مراد ہے سو اس آیت میں جس کا بیان ہو رہا ہے "لھم دار السلام عند ربھم" نیز یہی معنی مراد ہیں لیکن چونکہ یہ وعدہ تمام مومنین کے لیے عام ہے چنانچہ لھم کی ضمیر "من یرد اللہ ان یھدیہ" کی طرف راجع ہے یعنی تمام مومنین کے لیے دار السلام ہوگا خدائے تعالیٰ کے پاس اور ظاہر ہے کہ سب مومنین قرب اصطلاحی میں برابر ہیں نہیں اس واسطے عند کا ترجمہ قریب کے ساتھ کرنے میں ابہام رہتا ہے مساوات کا اور قرآن میں عند ربھم کے معنی بعض جگہ فی الدار الآخرۃ کے بھی وارد ہیں۔ پس یہاں یہی مناسب ہے لہٰذا اسہل اور واضح ترجمہ عند ربھم کا یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کے پاس جا کر یعنی آخرت میں تو اب ترجمہ یہ ہو گیا کہ مومنین کے لیے امن کا گھر ہوگا آخرت میں۔

قرب کے درجات

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں نے عند ربھم کا ترجمہ یہ کیوں کیا تھا کہ آخرت میں اب صرف یہاں ایک سوال باقی رہا وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کے پاس سے مراد آخرت ہی کیوں لی گئی خدائے تعالیٰ سے ایسا قرب تو ہم کو دنیا میں بھی حاصل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قرب کے درجات مختلف ہیں ایک قرب تو حقیقی ہے جس کا ترجمہ مل جانے سے کر لو یا ادراک حقیقت سے یا اسی کے ہم معنی جس لفظ سے چاہو کر دو اور ایک قرب مجازی ہے جس کا حاصل رفع یا تقلیل حجب ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے۔ "سو قرب بالمعنی الاول" یعنی قرب حقیقی بمعنی مل جانے کے یا ادراک حقیقت کے تو کسی کو حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ حق تعالیٰ جسم اور مکان سے پاک ہیں۔ تو مل جانے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے اور رہا ادراک حقیقت سو وہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک چاہتا ہے احاطہ کو اور بندہ ممکن ہے اور حق تعالیٰ واجب اور ممکن متناہی ہوتا ہے اور واجب لامتناہی پھر لامتناہی کو متناہی کیسے محیط ہو سکتا ہے۔ اس لیے غرض قرب بایں معنی تو ہو نہیں سکتا اس پر شاید کوئی اشکال کرے کہ رویت حق تعالیٰ کا مسئلہ ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رویت بے حجاب ہوگی۔ جب کوئی حجاب نہ رہا تو قرب حقیقی تو ہو گیا پھر یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ قرب حقیقی حق تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔

رویت بے حجاب ہونے کا مفہوم

اس کا حل یہ ہے کہ رویت بے حجاب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی حجاب بھی نہیں رہے گا بلکہ یہ معنی ہیں کہ بعض حجاب نہ رہیں گے اور تقلیل حجاب ہو جاوے گی۔ چنانچہ خود حدیث میں حجاب کا وجود آیا ہے۔ "لایبقیٰ علیٰ وجهه الا رداء الکبریاء" یعنی نہیں باقی رہے گا ذات پاک حق تعالیٰ پر کوئی حجاب سوائے حجاب کبریا کے یعنی عظمت کے اس استثناء سے معلوم ہوا کہ یہ حجاب رہے گا۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ رویت کے بے حجاب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مطلق حجاب نہ رہے گا بلکہ یہ معنی ہیں کہ بعض حجاب نہ رہیں گے ورنہ استثناء کے کیا معنی۔ رہا یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ایسی ہوگی جیسے چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مانع نہیں رہے گا تو دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ رویت میں تو حجاب نہ ہوگا چودھویں رات کے چاند کی طرح' دیکھ لو گے مگر ادراک حقیقت میں حجاب رہے گا اور اہل حق کی بھی یہی تحقیق ہے کہ حق تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا اور اس پر ان کے پاس علاوہ حدیث کے آیت بھی دلیل ہے اور وہ آیت یہ ہے "الا انه بکل شئی محیط" کیونکہ ادراک حقیقت بھی احاطہ ہے اور حق تعالیٰ کو کوئی شے محیط ہے نہیں پس اس کی حقیقت کا بھی کوئی مدرک نہیں' پس ادراک کا امتناع تو اس طرح ہوا اور وصل حسی کا امتناع بوجہ تنزہ عن الجسم کے ہوا اس لیے اور یہی دو فردتھیں قرب حقیقی کی اس لیے یہ توقع بالکل نہیں ہو سکتی کہ قرب اس معنی کو حاصل ہو کہ ادراک حقیقت ہو جاوے یا اتصال ہو جاوے ہاں اور کسی معنی کو قرب ہوگا۔ یعنی تقلیل حجب اور یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ظاہراً امتناع احاطہ بالحق سے حسرت ہو سکتی ہے کہ افسوس ہم اگر محیط ہوتے تو خوب لطف ہوتا جیسے محبوب کو آغوش میں لینے سے لیکن عاشق اسی سے زیادہ تو خوش ہو سکتا ہے کہ وہ محیط ہے اس لیے کہ ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ عاشق معشوق کے ہاتھ کو دبائے جس میں عاشق کا ہاتھ معشوق کے ہاتھ کو محیط ہوا اور ایک یہ صورت ہوتی ہے کہ محبوب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبائے۔ اس صورت میں محبوب کا ہاتھ عاشق کے ہاتھ کو محیط ہوا۔ ظاہراً تو دوسری

صورت پہلی سے کم درجہ کی معلوم ہوتی ہے لیکن عاشق سمجھتا ہے کہ زیادہ لطف دوسری ہی صورت میں ہے اسی کو ایک عاشق کہتا ہے:

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم　　کہ شاید دست من بار و گر جانان من گیرد

(اگرچہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا ہاتھ دوبارہ پکڑے)

عاشق کا مذاق

اور عاشق کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ قرب کامل تو دور رہا اس کو تو اگر یہ بھی امید ہو کہ کبھی میری طرف گوشہ چشم ہی سے دیکھ لیا جائے گا یا کبھی میرا نام ہی اس محفل میں آ جائے گا تب بھی پھولا نہ سمائے گا اور یہ تو بہت بڑی بات ہے کہ اس کا ہاتھ محبوب پکڑ لے اور یہ دوسری صورت کہ محبوب اس کا ہاتھ دبائے۔ اس پہلی صورت سے کہ یہ محبوب کا ہاتھ دبائے عاشق کے مذاق میں اس واسطے زیادہ پرلطف ہے کہ اس میں عنایت محبوب کی طرف سے پائی جاتی ہے اور پہلی صورت میں صرف عاشق ہی کی طرف سے توجہ ہے۔ بہر حال حق تعالیٰ کی عظمت حاجب عن ادراک الحقیقت ہے جنت میں بھی رویت تو ہوگی مگر حق تعالیٰ سے کسی کو یہ قرب بھی نہیں ہو سکتا تا کہ ادراک حقیقت ہو جاوے اس سے تو قطع نظر ہی کر لینی چاہیے۔ اسی بارے میں صوفیاء نے کہا ہے:

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لاحاصل ہے۔ اسی طرح ان کی ذات کا ادراک نہیں کر سکتا اس لیے فکر و سوچ بے کار ہے)

کہاں ذات حق باقی اور کہاں بندہ فانی اور کہاں قدیم اور کہاں حادث اور کہاں واجب الوجود اور کہاں ممکن اور کہاں لامتناہی اور کہاں متناہی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ جب یہ قرب محال ہے تو اگر قرب ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کہ حجابات کی تقلیل ہو جائے اور گو اس قسم کا قرب حق تعالیٰ سے دنیا میں بھی حاصل ہے مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا میں حجاب بہت زیادہ ہیں اور آخرت میں بہت کم ہوں گی اور دنیا میں جو یہ زیادہ حجب ہیں یہ بھی حجاب ادھر سے نہیں ہیں بلکہ ادھر سے ہیں کیونکہ ان کا حاصل ہستی دنیوی ہے کہ یہاں کی حیات تمام وجوہ سے نہایت ناقص ہے اور یوں تو ممکن کا وجود ہمیشہ ہی ناقص ہے کیونکہ ہر وقت اس پر فنا طاری ہے پھر اس

میں سے بھی دنیوی وجود کہ وہ تو بالکل ہی ناقص ہے جس کو کالعدم سمجھ کر فرمایا گیا ہے:
"لاعیش الاعیش الآخرۃ"[1] یعنی زندگی ہے تو آخرت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی ہی نہیں ہے تو یہاں کی ہستی نہایت ہی ضعیف ہے اور بوجہ ضعف کے متحمل اس قرب کے بھی نہیں جو آخرت میں ہوگا یعنی رویت اور یہی نکتہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا ارنی یعنی اے اللہ مجھے اپنا دیدار دکھا دیجئے تو حق تعالیٰ نے جواب دیا لن ترانی جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نہیں دیکھ سکتے یوں نہیں فرمایا لن اری کہ میں نہیں دیکھا جا سکتا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ ادھر سے قابلیت دیکھے جانے کی نہیں ہے بلکہ ادھر سے استعداد دیکھنے کی نہیں ہے اسی کو میں نے یہی کہا تھا کہ حجاب ادھر سے نہیں بلکہ ادھر سے ہے تو ہستی دنیوی اس قدر ضعیف ہے کہ اس میں استعداد نہیں ہے رویت کی اور آخرت میں قوت بڑھ جاوے گی لہٰذا دیکھ سکیں گے۔ حاصل یہ کہ حق تعالیٰ کی طرف سے قرب ہر وقت ہے لیکن ہستی دنیاوی حجاب اعظم ہے آخرت میں یہ حجاب کم ہو جاوے گا اس لیے قرب زیادہ ہوگا۔ لہٰذا قرب آخرت کو عند ربھم کہا گیا تو اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ مومنین کے لیے سلامتی کا گھر یعنی بہشت ہوگا آخرت میں۔

ولی کا معنی

ایک ثمرہ تو یہ ہوا جس کا حاصل میں نے شروع ہی میں بیان کر دیا تھا کہ "امن عن الآفات علی وجہ الکمال" (آفات و بلیات سے انتہائی درجہ پر سلامتی) ہے اور دوسرا ثمرہ حصول راحت علی وجہ الکمال (انتہائی درجہ پر راحت و سکون) ہے۔ وہ اس جملہ میں ہے "وھو ولیھم بما کانوا یعملون" (اور اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت ہے ان کے اعمال کے سبب) اور ولی کے معنی دونوں آتے ہیں محب بھی اور محبوب بھی تو آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے محبوب ہیں تو یہ محب ہوئے یعنی ان کو محبین میں داخل فرما لیں گے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے محب ہیں یعنی ان کو محبوب بنا لیں گے دونوں میں سے کوئی بات بھی ہو بندہ کے لیے تو بڑے ناز کی بات ہے۔ ایک عاشق کہتا ہے:

---

[1] (الصحیح للبخاری ۵: ۴۲، فتح الباری ۷: ۱۱۸)

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف　　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے عجب

یعنی مجھے تو اتنا ہی بہت ہے کہ اس کا دامن ہاتھ میں آجائے یعنی کچھ تعلق پیدا ہوجائے پھر نتیجہ خواہ یہ ہوا کہ وہ مجھ کو کھینچ لیں یعنی مجھ کو مطلوب اور محبوب بنالیں یا میں کھینچ لوں یعنی محب بن جاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ تعلق پیدا ہوجائے پھر نتیجہ ان دونوں میں سے ایک ضرور ہوگا اور ایک کیوں ہوگا دونوں ہی ہوں گے۔

محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں

راز اس کا یہ ہے کہ اس سرکار میں محبیت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں جہاں محبیت ہے وہاں محبوبیت بھی ہے اور جہاں محبوبیت ہے وہاں محبیت بھی ہے اسی معنی کو کہا ہے:

ہر کہ عاشق بینش معشوق داں　　　کو بہ نسبت ہست ہمیں وہم آں

اور اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست　　　تا بجو شد آیت از بالاؤ پست

(پیاسے کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو پانی کا طالب ہے تو سمجھ لے کہ تو مطلوب بھی ہے جیسے تو پانی کو ڈھونڈتا ہے ایسے ہی پانی بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے)

چنانچہ صاف فرماتے ہیں:

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

یعنی جیسا کہ پیاسے پانی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایسے ہی پانی بھی خود پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے۔ دیکھ لیجئے پیاسوں کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا تو پانی جو مطلوب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت طالب یعنی مقتضی ہے وجود عطشاں کو اور پیاسا جو طالب سمجھا جاتا ہے اس اعتبار سے مطلوب ہے تو طالبیت اور مطلوبیت دونوں طرف سے ہوئی۔ یہ حالت تو مخلوق کی باہم ہے اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ علاقہ پیدا کرے تو خدا تعالیٰ تو بہت کریم ہیں ذرا سا بہانہ ڈھونڈتے ہیں ادھر سے ارادہ ہوا اور ادھر سے خود کرم فرماتے ہیں تو جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرے گا خدا تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ محبت کریں گے۔ جب ادھر سے محبت ہوئی تو یہ محبوب ہو گیا نتیجہ یہی ہوا کہ محبیت کے لیے محبوبیت لازم ہے۔ چنانچہ ایک

جگہ صاف فرماتے ہیں: "یحببکم اللّٰہ" اس سے اوپر ارشاد ہے "ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی" اور یہ اس کا ثمرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے محب ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو حق تعالیٰ تم کو محبوب بنالیں گے۔ یہاں بظاہر موقع تحب اللہ کا تھا یعنی تمہارا محب ہونا اس وقت معتدبہ ہوگا جب تم اتباع کرو اس سے تم اللہ کے محبین میں شمار ہوسکتے ہو۔ سو یہ نہیں فرمایا بلکہ "یحببکم اللّٰہ" فرمایا یعنی ایسا کرنے سے تم کو حق تعالیٰ اپنے محبوبین میں داخل کرلیں گے۔ یہ آیت تو بالکل ہی صریح ہے اس باب میں کہ محبیت کے لیے محبوبیت لازم ہے اور بہت آیتوں میں یہ مضمون آیا ہے مثلاً "واللّٰہ یحب المحسنین" (اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں) اور "واللّٰہ یحب الصابرین" (اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں) وغیرہ وغیرہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں یحب کے معنی یہی تو ہیں کہ محبت رکھیں گے۔ اس کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف ہے تو فاعل اس کی ذات حق ہوئی اور محبت کے فاعل کو محب کہتے ہیں اور مفعول اس کا صابرین یا شاکرین ہیں بلفظ دیگر مومنین ہیں اور محبت کے مفعول کو محبوب کہتے ہیں تو مومنین کے لیے بشارت ہوئی محبوب بنالینے کی۔ یہ مضمون جابجا آیات میں موجود ہے اور یحببکم اللہ میں تو بالکل ہی صاف موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' کتنی بڑی بات ہے اس پر تو عاشق کو شادی مرگ ہوجائے تو عجب نہیں عاشق کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اتنا بھی سن لے کہ محبوب نے میرا نام لیا تو پھولا نہیں سماتا اور کہاں اتنا بڑا لفظ کہ مجھ کو پسند کرلیا۔

ادائے حق محبت عنایتے است زدوست   وگرنہ عاشق مسکیں بہیچ خورسند است

(مقدر اگر یاوری کرے تو میں اس کا دامن پکڑلوں۔ اگر وہ مجھے اپنی طرف کھینچے تو باعث مسرت اور میں اس کو اپنی طرف کھینچوں تو باعث طرب)

محبوبیت کا لفظ تو بہت ہی بڑا ہے عاشق کے لیے تو محبین ہی میں شمار ہوجانا بڑے سے بڑا درجہ ہے۔ وہ کہتا ہے:

ہمینم بس کہ داند ماہرویم   کہ من نیز از خریداران اویم

ہمینم بس اگر کاسد قماشم   کہ من نیز از خریدار انس باشم

(جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق سمجھو اگرچہ نسبت دونوں طرف ہے)

عاشق کا حوصلہ تو اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو محبّ اور بلفظ دیگر عاشق کہہ دیا جائے اور اگر خود محبوب ہی اس کی نسبت یوں کہہ دے کہ یہ میرا عاشق ہے تو شاید مرا ہوا بھی جی جائے یا جیا ہوا مر جائے اور دوسرے محبوبوں سے تو اتنی بھی توقع ہونا مشکل ہے کہ اپنے طالب کو عاشق ہی کہہ دے لیکن حق تعالیٰ کا فضل ہے اور عنایت کرم ہے کہ اپنے ناچیز بندوں کو محبوبیت کی بشارت سناتے ہیں ان کی نعمتوں اور رحمتوں اور آفتوں کی کیا حد ہو سکتی ہے جو کچھ ہے ادھر سے ہی ہے اور بندہ کو تو اگر محبیت بھی نصیب ہوتی تو فی الحقیقت انہی کی دی ہوئی ہوتی۔ گو ظاہراً بندہ کا فعل ہوتا اور محبوبیت میں تو بندہ کا کوئی اختیار ہی نہیں وہ تو ہر طرح انہی کی دی ہوئی ہے۔

غرض یہ اس آیت سے خوب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ محبیت کو محبوبیت لازم ہے۔

محبوبیت کو محبیت لازم ہے

اور اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ اس کا عکس بھی ثابت ہے یعنی محبوبیت کو محبیت لازم ہے تو آیت میں لفظ **ولیھم** کو معنی میں محبّ کے لوتب بھی اور محبوب کے لوتب بھی اس سے محبیت بھی ثابت ہوگئی اور محبوبیت بھی تو معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ مومنین کو یہ ثمرہ بھی دیں گے کہ محبّ بھی بنالیں گے اور محبوب بھی بنالیں گے اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ دلالت آیت کی دونوں مضمونوں پر بطریق عموم مشترک کے نہیں ہے کبھی کوئی مولوی صاحب اعتراض کریں بلکہ ایک مضمون پر دلالت مطابقی ہے اور دوسرے پر التزامی ہے یعنی **ولیھم** کو دونوں معنوں میں ایک وقت میں نہیں لیا گیا بلکہ ایک معنی میں لیا گیا ہے اور دوسرے معنی بوجہ لازم ہونے کے ثابت ہو جاتے ہیں' یہ بحث تو طالب علمانہ تھی۔ مقصود یہ ہے کہ **ولیھم** میں دوسرے ثمرہ کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مومنین کو حق تعالیٰ اپنا محبّ اور محبوب بنالیں کہ اس کو میں نے دوسرا ثمرہ کہا تھا اور اس کا حاصل حصول راحت نکالا تھا۔ پس ایک ثمرہ تھا دفع مضرت جو حاصل تھا اول جملہ یعنی (**لھم دار السلام عند ربھم**) کا دوسرا ثمرہ حصول راحت ہے جس کو میں نے ثابت کیا ہے "**وھو ولیھم**" سے جس کا حاصل دو امر ہیں محبّ بن جانا خدا تعالیٰ کا اور محبوب بن جانا اور دونوں امر کو جامع

ایک لفظ محبت ہے تو حاصل یہ ہوا کہ مومنین کو محبت حاصل ہوگی محبت مصدر ہے اس کو مضاف کرو فاعل کی طرف تو محبیت کے معنی ہو جاتے ہیں اور مضاف کرو مفعول کی طرف تو محبوبیت کے معنی ہو جاتے ہیں۔ غرض دونوں معنوں کے لیے جامع لفظ محبت ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ مومنین کو محبت حاصل ہوگی اور میں نے ان دونوں ثمروں کی نسبت اوپر کہا تھا کہ کامل ہوں گے سو دفع مضرت کے کامل ہونے کو تو میں اوپر ثابت کر چکا۔ اب اس دوسرے ثمرہ کے کمال کرنا رہ گیا یعنی حصول راحت بھی علی وجہ الکمال ہوگا۔

راحت کی روح

اس بیان کے لیے ضرورت ہے ایک مقدمہ کی وہ یہ ہے کہ راحت کی روح ہے خوشی اور یہ نہ ہو تو تمام نعمتیں بیکار ہیں۔ مثلاً ایک شخص لکھ پتی ہے مال بھی ہے اولاد بھی ہے مکان بھی ہے ہر قسم کی آسائش کا سامان مہیا ہے لیکن فرض کر لیجیے کہ اس پر ایک مقدمہ قتل کا قائم ہو گیا ہے تو سامان راحت کا سب موجود ہے مگر چونکہ اس راحت کی روح یعنی خوشی اور اطمینان قلب موجود نہیں لہٰذا سب سامان بیکار ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے اس کو کچھ طول دینے کی ضرورت نہیں مگر جس بات کو میرے مدعا میں دخل ہے وہ یہ ہے کہ ہر چیز کی راحت اس کے مناسب چیز سے ہوتی ہے آنکھ کی راحت اچھی اچھی چیزوں کے دیکھنے سے اور کان کی راحت اچھی اچھی باتوں کے سننے سے علیٰ ہذا قلب کی راحت سب سے زیادہ ہوتی ہے محبت سے جب مومنین کے لیے محبت ثابت ہوگئی تو اس کا نتیجہ صاف یہ نکلا کہ جو سب سے بڑی چیز راحت کی ہے وہ حاصل ہوگئی کیونکہ آنکھ کان وغیرہ مناسب قلب سے درجہ میں کم ہیں اور اشد والا مناسب ہے تو جو فرق اور اعضاء اور قلب میں ہے وہی فرق ان دونوں کی راحتوں میں بھی ہوگا۔ پس محبت سب راحتوں سے بڑھ کر راحت ہوئی جب وہ محبت مومنین کو حاصل ہوئی تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ سب سے بڑی راحت ان کو نصیب ہوگئی جس کی تمام راحتیں تابع ہیں تو یہ بات صحیح ہوگئی کہ حصول راحت علیٰ وجہ الکمال ہوگا۔ ایک بات یہاں یہ بھی ذہن میں رکھ لیجیے کہ ولی کے معنی میں قرب بھی ماخوذ ہے تو یہ معنی ہوئے کہ حق تعالیٰ کو ان سے قرب بھی ہے۔ اب یہاں دو دعوے ہوئے اول یہ کہ خود محبت

بھی راحت ولذت کی چیز ہے چاہے قرب بھی نہ ہو یہ محبت بھی وہاں ہوگی اور اس پر دوسرا یہ کہ اس پر قرب بھی مزید برآں ہوگا تو اب تو حصول راحت علیٰ وجہ الکمال کہنے میں کچھ بھی تردد نہ رہا۔ اگر کوئی کہے کہ ایک شاعر نے تو اس کے خلاف کہا ہے:

جو مزا انتظار میں دیکھا   پھر نہ وہ وصل یار میں دیکھا

اس میں صاف بتلا رہا ہے کہ محبت میں مزا ہے قرب میں نہیں تو اول تو یہ شعر غلط ہے اور مذاق سلیم کے خلاف ہے اگر ایسا ہوتا تو عشاق وصال کی تمنا کیوں کیا کرتے اور اگر من کل الوجوہ غلط بھی نہ کہا جائے تو میں ثابت کرتا ہوں کہ مومنین کو یہ بھی نصیب ہوگا یعنی جنت میں انتظار کی لذت بھی ہوگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ قرب بھی ہوگا اور انتظار بھی۔ بیان اس کا یہ ہے کہ محبوب حقیقی سے وصل حقیقی ممکن نہیں۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ وصل حقیقی چاہتا ہے اتصال کو یا علم بالکنہ کو اور اتصال حق تعالیٰ سے ممکن نہیں کیونکہ ذات حق تجسم سے پاک ہے اور علم بالکنہ احاطہ اور حق تعالیٰ محیط ہیں نہ کہ محاط جب وصل حقیقی نہ ہوگا تو پوری سیری بھی نہ ہوگی اور مزید قرب کا انتظار رہے گا اور یہ حالت ہوگی کہ وصل بھی ہے اور مزید کا انتظار بھی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

دلا رام در بردلا رام جو   لب از تشنگی خشک و برطرف جو

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند   کہ برحل نیل مستسقی اند

(محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلبگار)

اور راز اس میں یہی ہے کہ بندہ متناہی ہے اور حق تعالیٰ لا متناہی تو جو مرتبہ بھی وصال کا لیا جائے ایسا نہیں ہو سکتا کہ اور مرتبہ نہ ہو شاعر کہتا ہے:

جنت میں انتظار کی لذت ہوگی

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گل چیں بہار تو ز داماں گلہ

(نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بے شمار)

سبحان اللہ اس کا کیا بیان ہو سکتا ہے لا متناہی کا بیان بھی کوئی کیسے کرے کیونکہ بیان بھی تو متناہی ہوگا پھر اس کو کیسے محیط ہو سکتا ہے۔ غرض اگر وہ شعر کسی درجہ میں صحیح بھی ہو تب

بھی وہ اشکال نہ رہا کہ جب انتظار نہ ہوگا تو کیا لطف ہوگا کیونکہ میں نے ثابت کردیا کہ جنت میں انتظار بھی ہوگا تو اگر کسی کا یہی مذاق ہے کہ لطف بلا انتظار کے نہیں تو جنت میں یہ بھی ہوگا جس کی وجہ ابھی بیان کی ہے کہ وہاں حسن لامتناہی ہوگا اس لیے تمتع کے درجات بھی لاتقف عند حد ہوں گے اور ہر درجہ میں دوسرے درجہ کا انتظار ہوگا مگر یہ یاد رکھئے کہ ایک انتظار وہ بھی ہوتا ہے جس میں تڑپ اور بے چینی ہو ایسا انتظار جنت میں نہ ہوگا کیونکہ جنت دارالسلام ہے وہاں کسی تکلیف کا کام نہیں اور ایسا انتظار تکلیف ہے اور تکلیف بھی کیسی جس کو کہا جاتا ہے الانتظار اشد من الموت تو ایسا انتظار تو وہاں کیسے ہوسکتا ہے جو انتظار وہاں ہوگا وہ زیادتی لذت کے لیے ہوگا وصال بھی ہوگا اور انتظار وصال بھی ہوگا۔ اس طرح کہ ایک تجلی خاص ہوگی اس سے جو کچھ لذت حاصل ہوگی اس کو کون بیان کرسکتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر تجلی کی خواہش ہوگی پھر اس سے بڑھ کر تجلی ہوگی پھر اس سے بھی بڑھ کر تجلی کی خواہش ہوگی اور پھر وہ تجلی ہوگی وھلم جرا کہیں یہ ترقی ختم نہ ہوگی کیونکہ وہاں تناہی نہیں ہے۔ اس بیان کو طول اس شعر کی تحقیق کی وجہ سے ہوگیا جو مزا انتظار میں دیکھا الخ۔

اصل مضمون یہ تھا کہ ہر چیز کی راحت اس کے مناسب چیز سے ہوا کرتی ہے اور قلب کے موافق اور مناسب چیز محبت ہے تو قلب کو محبت سے راحت پہنچتی ہے گو وصل بھی نہ ہو چہ جائیکہ وصل بھی ہو اور یہ محبت اس قدر لذت کی چیز ہے کہ بعض وقت اس محبت میں آدمی اس قدر محو ہوجاتا ہے کہ وصل کی بھی خبر نہیں رہتی۔ مجنوں کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ لیلیٰ سامنے آگئی تو وہ کہتا ہے من انت تو کون ہے یہاں تعجب ہوتا ہے کہ اس نے لیلیٰ کو پہچانا نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ غایت شوق میں ایسی محویت ہوگئی کہ کچھ بھی خبر نہ رہی حتیٰ کہ محبوب کا بھی ادراک نہ ہوا مگر اس قصہ سے مقصود محض محبت کے لذیذ ہونے پر استدلال کرنا ہے باقی اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ وہ وصل سے افضل ہے یہ تو ظاہر ہے کہ محبت خود اس فصل ہی کی خواہش کا نام ہے تو جس کی خواہش کا نام محبت ہے یعنی وصل محبت محضہ اس سے کیسے افضل ہوگی البتہ دنیا میں کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ اس وصل پر محض محبت غالب آجاتی ہے جیسا کہ لیلیٰ کے قصہ میں ہوا کہ محبت میں ایسی لذت آئی کہ محویت ہوگئی حتیٰ کہ محبوب کو بھی نہ پہچانا مگر وہاں ایسا نہ ہوگا

کیونکہ وہاں مذاق صحیح ہوگا اس لیے وہ حالت نہ ہوگی جو مجنوں کی ہوئی کہ محبوب تک کو نہ پہچانا۔ یہ ایک غلطی کا دفع تھا۔

اصل مضمون یہ بیان کررہا تھا کہ محبت ہی ہر راحت کی بناء ہے جس چیز میں لطف آتا ہے محبت ہی سے آتا ہے محبت نہ ہو تو کسی چیز میں لطف ہی نہیں آسکتا۔ دیکھئے سب سے بڑی اور ضروری چیز جس پر تمام کارخانہ دنیا کا وجود بقاء موقوف ہے وہ کھانا ہے اس میں بھی اگر محبت نہ ہو یعنی کھانے کی خواہش نہ ہو تو لطف نہیں آسکتا اس وقت کھانا مٹی کے برابر معلوم ہوتا ہے اور یوں کوئی فاسد المذاق ہو کہ پیٹ بھی بھرا ہوا ہے اور طبیعت قبول نہیں کرتی مگر زبردستی کھائے چلا جارہا ہے بلکہ قے کرتا جاتا ہے اور کھائے چلا جاتا ہے تو ایسے مذاق والے کا تو ذکر ہی نہیں۔ مذاق صحیح کا ذکر ہے کہ بلا خواہش اور رغبت کے کھانے میں بھی لطف نہیں آتا خواہش رغبت محبت سب ایک ہی چیز ہے غرض ہر راحت کی اصل محبت ہی ہوئی اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ ایک راحت ہی کی کیا تخصیص ہے ہر چیز کی اصل اور بنا محبت ہی ہے حتیٰ کہ ایجاد عالم کی بناء بھی یہی محبت ہے۔ صوفیاء کی روایات میں ایک الہام ہے "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف"[1] یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس واسطے میں نے عالم کو پیدا کیا۔ لفظ احببت محبت سے مشتق ہے اس میں اسناد محبت کی حق تعالیٰ کی طرف ہوئی ہے تو صاف یہی معنی ہوئے کہ خدا تعالیٰ کو اس امر سے محبت ہوئی کہ پہچانا جاؤں۔ لفظ محبت اس میں صریح مذکور ہے اس سے ثابت ہوا کہ ایجاد عالم کی اصل بنا بھی محبت ہی ہوئی ہے یہ اور بات ہے کہ محبت کا اطلاق ذات حق تعالیٰ میں اس معنی پر اس معنی میں نہیں ہوسکتا جس معنی پر مخلوقات میں اطلاق ہوتا ہے کیونکہ مخلوقات میں تو محبت کے معنی میلان وکشش کے ہیں جس سے محبت بالاضطرار محبوب کی طرف کھینچتا ہے اور ذات خداوندی میں اضطرار کا کچھ کام نہیں وہاں تو اختیار مطلق ہے محبت بھی اختیاری ہے وہاں محبت کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنے اختیار سے بلا کسی قسم کی کشش اور اضطرار کے ایک بات کو پسند کرنا۔

---

[1] (الدر المنتشرة فی الاحادیث المشتهرة: ۱۲۶، الأسرار المرفوعه لعلی القاری: ۲۷۳)

لفظ محبت کی ضروری تحقیق

محبت کے حکم کرنے میں آج کل لوگ سخت غلطی کرتے ہیں اور حق تعالیٰ پر اس کا حمل ایسی بیہودگی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس کے تصور سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ عوام کو ان باریک باتوں کی تمیز کہاں‘ خدا تعالیٰ کو عاشق اور شیدا وغیرہ کہہ ڈالتے ہیں جس میں یہی معنی ادا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کے ساتھ محبت‘ کشش اور اضطرار اور بے چینی کے ساتھ ہے جس طرح مخلوق میں ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس قسم کے الفاظ حق تعالیٰ کی شان میں کہنا ہرگز جائز نہیں اس میں حق تعالیٰ کو مخلوق کے برابر کر دینا ہے اور سخت بے ادبی ہے یہ لفظ محبت کی ضروری تحقیق تھی جو رفع غلطی کے لیے بیان کر دی گئی باقی محبت کا اطلاق بمعنی ارادۃ الخیر حق تعالیٰ کے لیے بھی آتا ہے۔ چنانچہ لفظ احببت میں موجود ہے اور اس قسم کے لفظ قرآن شریف میں بھی بہت جگہ موجود ہیں جس میں محبت کا اطلاق حق تعالیٰ کے لیے آیا ہے۔ مثلاً ”واللہ یحب الصابرین“ واللہ یحب المحسنین“ یحببکم اللہ“ وغیرہ وغیرہ غرض جس طرح کہ محبت خدا تعالیٰ کے لائق ہے وہی محبت ایجاد عالم کا سبب ہوئی تو ثابت ہوا کہ محبت ہی بنا ہوئی ہے ایجاد کی جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا۔

محبت کی بناء

اور ایک بات اس سے اور بھی معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ محبت کی ابتداء ادھر سے ہوئی ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود　　　　تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

پھر اس کا عکس ادھر پڑا پھر جانبین میں تعلق ہوا مگر رنگ دونوں طرف مختلف ہیں۔ جیسا کہ سورج کی شعاع صاف اور نورانی ہوتی ہے لیکن سرخ رنگ کے شیشے میں پار ہو جانے سے سرخ دکھائی دیتی ہے اس سے سورج کا اور شعاع کا رنگین ہونا لازم نہیں آتا یہ وہی شعاع نورانی اور صاف ہے مگر سرخ شیشے سے تعلق ہو جانے سے اس میں رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ بلاتشبیہ یہی حالت محبت کی ہے کہ اُدھر سے صاف اور بے کیف اور ادھر سے بے

چینی کے ساتھ اور سوز کے ساتھ اور درد کے ساتھ اور جو جو کچھ عاشق کی گتیں بنتی ہیں سب جانتے ہیں۔ ادھر تو یہ رنگ اور ادھر سکون کے ساتھ اور بلا اضطرار اور بلا بے چینی کے اور بلا سوز و گداز اور ہے دونوں طرف محبت۔ اسی کو عارف رومی کہتے ہیں:

عشق معشوقاں نہانست دستیر عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر
لیک عشق عاشقاں تن رہ کند عشق معشوقان خوش و فربہ کند

وجہ یہ کہ اضطرار ایک صفت نقص ہے جس سے ذات حق جل جلالہ منزہ ومبرا ہے۔ گو محبت اس طرف کی مخلوق کی محبت سے بہت زیادہ ہے جس کا راز یہ ہے کہ محبت کی بناء ہے معرفت اور معرفت ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہی کو زیادہ ہے ہم کو خود اپنی بھی معرفت اتنی نہیں ہوسکتی جتنی کہ حق تعالیٰ کو ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حق تعالیٰ ہم کو ہم سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ کو ہم سے ماں سے بھی زیادہ محبت ہے اور یہ بات بہت ظاہر ہے کیونکہ ماں میں محبت کہاں سے آئی یہ حق تعالیٰ ہی کی محبت کا پرتو ہے اور یہ مضمون حدیث قدسی میں بھی ہے:

"من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا ومن اتانی یمشی اتیته هرولة"[1]

(حق تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص کہ میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو کوئی میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے تو میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو کوئی میری طرف قدم قدم آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں)۔

دیکھیے ادھر سے جتنا ظہور محبت کا ہوتا ہے اس سے زیادہ ادھر سے ہوتا ہے اس میں صریح دلالت ہے کہ ادھر ہی سے محبت زائد ہے وہ تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ ذرا کسی نے ارادہ کیا ان کی طرف آنے کا اور وہ خود اس سے ہزار ہا درجہ زیادہ اس کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ غرض محبت کی شان اور اس کا ہر راحت ولذت کے لیے بلکہ تمام عالم کے لیے اصل الاصول ہونا ثابت ہوگیا۔ اسی دولت کا ذکر ہے جملہ "وھو ولیھم" میں۔ پس یہ جملہ جامع ہوا تمام

[1] (مسند احمد ۲: ۴۱۳، کنز العمال: ۱۱۷۹)

راحات حصول کا اور پہلا جملہ جامع تھا تمام مضار کے زوال کا اور یہی حاصل ہوتا ہے تمام ثمرات کا تو اسلام پر ثمرات کاملہ کا مرتب ہونا ثابت ہوگیا۔ یہ بیان ہوا "لهم دار السلام عند ربهم وهو وليهم" (ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور اللہ کو ان سے محبت ہے) کا۔

بغیر اعمال صالحہ کے صرف محبت کافی نہیں۔

اس کے بعد "بما كانوا يعملون" میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ یہ کہ بعض لوگ ایسے ہوس ناک ہوتے ہیں کہ محبت کو مقصود بالذات سمجھ کر اس میں ایک غلطی کر بیٹھتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ بس کامیابی یہی کافی ہے کہ حق تعالیٰ سے ہم کو محبت ہے اور ہم سے ان کو محبت ہے اور یہ سمجھ کر عمل کا اہتمام مطلق نہیں کرتے اور جاہل صوفی اس غلطی میں بکثرت مبتلا ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ مراقبات وغیرہ میں مشغول رہیں گے وظیفے بہت پڑھیں گے کیفیات کی تحصیل میں سرگرم رہیں گے اگر کشف یا سلب مرض یا اور کوئی کیفیت حاصل ہوگئی تو اس میں مست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کمال حاصل ہوگیا' دن رات انہی دھندوں میں لگے ہوئے ہیں اور اعمال سے غافل ہیں اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم کو محبت حاصل ہے اور محبت ہی ہے جو کچھ ہے۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ محبت کونسی درکار ہے۔

محبت کیلئے محض میلان قلب کافی نہیں

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ محبت بمعنی میلان قلب کافی نہیں یہ محبت تو ایسی ہے جیسے کوئی یہ خیال کرے کہ مجھے کھانے کی طرف تو رغبت ہے نہ کھانا پکائے اور نہ کھائے تو اس سے کیا ہوسکتا ہے پیٹ نہیں بھر سکتا اور زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کھانے کی رغبت نے تو کچھ بھی کام نہ دیا ایسے ہی حق تعالیٰ کی طرف محض میلان قلب کام نہیں دے سکتا کیونکہ جب عمل نہیں اور رضا اسی پر موقوف ہے تو رضا حاصل نہیں اور وہی بڑا مقصود ہے تو اس محبت کا حاصل یہ ہوا کہ تم کو تو خدا تعالیٰ سے محبت ہوئی مگر خدا تعالیٰ کو تم سے نہ ہوئی تو یہ مطلوب نہیں بعض لوگ اسی کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں۔

نسبت مطلوبہ

خوب سمجھ لو کہ نسبت مطلوبہ وہ ہے جو دو طرف سے تعلق ہو اور یہ موقوف ہے عمل پر نہ کہ صرف ایک طرف سے اس کی مثال تو اس طالب علم کے قصہ کی سی ہے کہ ایک طالب علم

تھے دل لگی باز، ان سے ان کے ایک دوست نے پوچھا آج کل کس شغل میں ہو' کہا شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں' کہا مبارک ہو بڑا کام مارا کیا' اس کی کوئی صورت ہوگئی ہے' کہا جی ہاں آدھا کام بھی تو ہوگیا' آدھا باقی ہے پوچھا کیونکر کہا ہم تو راضی ہیں مگر وہ راضی نہیں تو آدھا کام ہوگیا اور آدھا باقی ہے تو بھلا اس سے کیا کام چلا کہ ہم راضی ہیں مگر وہ راضی نہیں اور کیا اس نیم رضا سے شہزادی مل گئی۔ اسی طرح یہ عاشق ہونے کے مدعی ہیں کہ وہ تو اللہ سے راضی ہیں مگر اللہ ان سے راضی نہیں بہت سے پڑھے لکھے بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں۔

نسبت باطنی کو بلا اعمال کے کافی سمجھنا غلط ہے

کہ یہ لوگ نسبت باطنی کے معنی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ حق تعالیٰ سے لگاؤ پیدا کرلو اور لگاؤ کے معنی یہ۔لیے ہوئے ہیں کہ ہر وقت یاد رکھو زبان سے یا خیال سے بس یہی کافی ہے اور اعمال کو مقصود نہیں سمجھتے خود اعمال کو بھی صرف یاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو جب یاد پیدا ہوگئی خواہ اعمال سے یا اور کسی ذریعہ سے تو اعمال کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ یہ لوگ کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اعمال کی مطلق پرواہ نہیں نہ نماز نہ روزہ نہ زکوٰۃ اور دوسرے اجزاء دین کا تو کیا ذکر اگر کسی نے نماز پڑھی بھی تو ولایتی نماز جس کا نہ رکوع صحیح نہ سجدہ درست نہایت ہی بے توجہی کے ساتھ کیونکہ کوئی ضروری چیز تو ہے ہی نہیں یہ بھی ان کی عنایت ہے کہ ایسی بھی پڑھ لیں' البتہ تسبیحیں بڑی بڑی رکھتے ہیں ایک مٹروشاہ تھے۔ ان کے نام بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں جو بعضے خاندانوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں شیطان شاہ لعنت شاہ وہ مٹروشاہ کہا کرتے تھے کہ تسبیح ایسی بڑی اور بھاری ہونی چاہیے کہ ضرورت کے وقت ہتھیار کا بھی کام دے جائے اور کسی سے لڑائی جھگڑائی ہوجائے تو سر پر ماردیں تو ایک دفعہ سر تو پھٹ جائے' کپڑے گیروا ہوتے ہیں۔غرض ہر بات میں تصنعات اور رسوم رہ گئے ہیں اسی کی نسبت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں نسبت صوفیاء غنیمتے است کبری اما رسوم شان ہیچ نیرزد۔مگر اب درویشی ان ہی رسوم کا نام رہ گیا ہے جس میں رسوم نہ ہوں اس کو کہتے ہیں فلانے بزرگ مشہور تو بہت ہیں مگر ہم نے تو کوئی بات درویشی کی ان میں دیکھی نہیں واقعی گیروا کپڑے نہیں دیکھے' بڑی سی ٹوپی سر پر نہیں دیکھی' بڑی سی تسبیح گلے میں پڑی نہیں دیکھی' موٹا سا سوٹا

ہاتھ میں نہیں دیکھا' واہی تباہی الفاظ زبان سے بکتے نہیں دیکھا۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہوا کہ شریعت کے پابند ہیں وضع میں قطع میں بول چال میں معاشرات میں معاملات میں اور رسوم کو فضول سمجھتے ہیں اس واسطے درویش کہے جانے کے مستحق نہیں رہے غرض اس خیال میں بہت لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ وظیفے پڑھ پڑھ کر حق تعالیٰ سے تصور کا لگاؤ پیدا کر لینا کافی ہے نماز روزے کی ضرورت نہیں اسی پر بھولے بیٹھے ہیں اور اسی کو کمال اور وصول سمجھتے ہیں۔ خیر یہ تو جہلاء کی باتیں ہیں اور بعضے یہ تو نہیں کہتے کہ نماز روزے کی ضرورت نہیں مگر ایک غلطی میں وہ بھی مبتلا ہیں اور یہ بات اچھے اچھے سمجھ داروں اور ذاکرین میں بھی پائی جاتی ہے کہ اعمال کے ساتھ قلب اہتمام ہے جس اہتمام کے ساتھ وظیفے اور اشغال وغیرہ کرتے ہیں اہتمام کے ساتھ اعمال نہیں کرتے۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ صرف لگاؤ اور نسبت کو گو یک طرفہ ہی ہو مقصود سمجھتے ہیں اسی غلطی کو میں بیان کر رہا ہوں۔

نسبت کی بینظیر تحقیق

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ نسبت کہتے ہیں لگاؤ اور تعلق کو اور اس نسبت کی دو قسمیں ہیں (لاکھوں روپے کی بات ہے جو میں بتلا رہا ہوں) ایک قسم تو یہ ہے کہ بندہ کو خدا سے نسبت ہو اور خدا کو بندہ سے نہ ہو اور دوسری قسم یہ کہ بندہ کو خدا سے نسبت ہو اور خدا تعالیٰ کو بندہ سے ہو۔ نسبت کا لفظ لغتاً دونوں قسموں پر بولا جا سکتا ہے مگر مطلوب نسبت کی صرف یہ دوسری قسم ہے نہ کہ پہلی قسم ورنہ ایسا تو کوئی بھی آدمی نہ نکلے گا جو پہلی قسم کی نسبت نہ رکھتا ہو' ایسا کون شخص دنیا میں ہوگا جو خدا کا قائل ہو اور بزعم خود خدا سے تعلق نہ رکھے اور اس کی تدبیر نہ کرے اس کی دلیل قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے مشرکین کا قول نقل کیا ہے **"مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ"** یعنی مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ان کی پرستش اس واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو حق تعالیٰ کے قرب میں پہنچا دیں تو اس غرض حصول قرب الی اللہ سے مشرکین بھی خالی نہ ہوئے اور یہود اور نصاریٰ تو اہل کتاب ہی ہیں وہ تو کتاب کو حکم الٰہی سمجھ کر اس کو ذریعہ رضاء و قرب کیوں نہ بناتے تو پہلی قسم نسبت کی تو ان کو بھی حاصل ہے۔ اگر یہ کافی ہوتی تو پھر خود اسلام ہی کی کچھ ضرورت نہ ہوتی اور نماز روزہ کا تو کیا

ذکر دیکھئے کیسی صاف غلطی ہے۔ پس یہ لفظ کہ فلانے صاحب نسبت ہیں خوش کن تو بہت ہے لیکن جب تک کہ یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ کون سی قسم کے صاحب نسبت ہیں اس وقت تک اس کی کچھ بھی حقیقت نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہی نسبت رکھتے ہوں جو کفار کو بھی حاصل ہے جو کسی درجہ میں بھی مطلوب اور محمود نہیں۔

نسبت محمود

نسبت اگر قابل شمار اور مطلوب ہے تو دوسری قسم کی ہے یعنی یہ کہ بندہ کو خدا سے ہو اور خدا کو بندہ سے ہو اس میں رضا ہوتی ہے یہ ہے تحقیق نسبت کی اور یہ نسبت اعمال میں اہتمام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی واسطے آگے فرماتے ہیں **"وھو ولیھم بما کانوا یعملون"** یعنی جو کچھ یہ عطا ہوگا وہ اس کی بدولت ہوگا کہ جو وہ عمل کرتے ہیں یعنی آفات سے حفاظت اور راحتوں کا نصیب ہونا اور ہمارا قرب یہ سب اعمال سے ہوگا کوئی خالی محبت میں مغرور نہ ہو جائے خوب سمجھ لے کہ ہم بلا عمل نہیں مل سکتے اور ان کی تو بڑی شان ہے کبھی کسی کو دنیا میں بھی کوئی محبوب بلا عمل ملا ہے' ذرا سا طبیعت کا لگاؤ کسی سے ہو جاتا ہے تو اس کی کتنی ناز برداریاں کرنی پڑتی ہیں اور کتنی مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں روپیہ مٹی کر دیا جاتا ہے جان خاک میں مل جاتی ہے مدتوں حیران رہنا پڑتا ہے نہ دن کو چین نہ رات کو نیند' مال دولت سب برباد ہو جاتا ہے تب کہیں منہ لگاتے ہیں عاشق کی جو گت بنتی ہے دنیا جہان کو معلوم ہے کچھ شرح کی ضرورت نہیں عشق کا نام آنا تھا اور جان اور مال سے ہلاک اور برباد ہونا۔ جب دنیا کا ادنیٰ سا محبوب لڑکا یا عورت بھی بلا محنت نہیں ملتا تو حیرت کی بات ہے کہ خدا کی نسبت یوں خیال رکھا جائے کہ بلا محنت مل سکتا ہے عمل اس محنت ہی کو تو کہتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی تلاش میں کچھ بھی محنتیں نہیں رکھیں وہ طریقے بتلائے ہیں جن کو اگر ان مشقتوں کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھا جائے جو ادنیٰ سے ادنیٰ اور گندے ایک دنیاوی محبوب کے لیے کرنا پڑتی ہیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی مشقت نہیں ہے دنیا کا محبوب روپیہ بھی مانگتا ہے اور اس کے لیے کوئی مقدار مقرر نہیں کرتا نہ کوئی نصاب ہے نہ کوئی وقت ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ سارا ہی روپیہ چاہیے اور جان بھی مانگتا ہے اس کے لیے بھی

کوئی قاعدہ یا کوئی وقت مقرر نہیں اس کا بھی مطلب یہی ہوا کہ جان بھی بلاعذر ہمارے اوپر قربان کردو خواہ تمہارا کوئی کام دنیا یا دین بگڑے یا بنے ہم کو اس سے بحث نہیں۔

محبوب حقیقی کے مالی مطالبہ کی کیفیت

اس کے مقابلہ میں محبوب حقیقی کو دیکھئے کہ روپیہ ہی مانگتے ہیں تو کتنا چالیس میں سے ایک اور پھر اس کے لیے بھی شرائط ہیں مثلاً حولان حول یعنی سال بھر گزر جائے تب چالیس میں سے ایک دینا ہوتا ہے اور مثلاً نصاب یعنی مقدار خاص مال کی بھی جیسے ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا چنانچہ جس کے پاس اتنی مقدار نہ ہو اس کو ذرا بھی نہیں چھیڑتے یعنی اس پر بلا اس مطالبہ کے ہی عنایت فرماتے ہیں۔ اگر مقدار بھی ہو اور سال بھی گزر چکا ہو لیکن قرض اس کے ذمہ ہو تب بھی اس سے مطالبہ نہیں کرتے یہ تو مالی مطالبہ کی کیفیت ہے اب جانی مطالبہ کو لیجئے اس میں بھی کوئی کام ایسا سر نہیں ڈالتے جس میں ناقابل تحمل مشقت ہو مثلاً پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے اس کے بھی قواعد اور شرائط ایسے نرم ہیں جس کی نظیر ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی اور محبوبوں کا برتاؤ تو الگ رہا۔ مثلاً نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کا حکم ہے اگر نہ ہو سکے بیٹھ کر پڑھ لو اگر بیٹھ کر بھی نہ ہو سکے لیٹ کر پڑھ لو وضو نہ ہو سکے تو ایک بہت آسان بدل اس کا تیمم مقرر کر دیا ہے سفر میں دو ہی رکعت پڑھ لو غرض تمام جانی اعمال کو اور مالی اعمال کو ان اعمال سے موازنہ کر کے دیکھو جن کا مطالبہ محبوبان دنیا کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ کے مطالبات عشر عشیر بھی نہیں حالانکہ اگر اس کے برعکس ہوتا یعنی حق تعالیٰ کے مطالبات عشاق سے بہ نسبت مطالبات محبوبان دنیا کے دس حصے اور بیس حصے بھی زیادہ ہوتے تو حق تھا لیکن یہ رحمت اور رافت ہی تو ہے کہ اپنے بندوں کو دق کرنا نہیں چاہتے بلکہ برائے نام حیلہ رکھ کر کچھ دینا اور کرم کرنا چاہتے ہیں مگر ہم کو بھی تو کچھ انصاف کرنا چاہیے اس کی قدر ہم کو یہ کرنا چاہیے تھی کہ دل و جان سے فدا ہو جاتے اور اس سے زیادہ کر کے دکھاتے جو محبوبان دنیا کے ساتھ کرتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود ۔۔۔ گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

عشاق نے کیسی کیسی مشقتیں اٹھائی ہیں مجنوں کا قصہ سنا ہوگا کہ ایک دفعہ لیلیٰ کے گھر کی طرف چلے اونٹنی پر سوار ہوئے' اونٹنی کے بچہ بھی تھا وہ اونٹنی چلتی اور بار بار پیچھے کو دیکھتی اور ذرا باگ سست دیکھتی تو پیچھے کو لوٹ پڑتی جب مجنوں کو کچھ افاقہ ہوتا تو پھر آگے کو چلاتا مگر اس طرح چلنے سے راستہ کچھ بھی قطع نہ ہوا' آخر سمجھا کہ بچہ کی محبت اس کو روک رہی ہے تو کہتا ہے:

هوى ناقتي خلفي و قدامي الهوى　　فاني　　واياها　　لمختلفان

یعنی میری اونٹنی کا محبوب پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے' میں آگے جانا چاہتا ہوں اور وہ پیچھے جانا چاہتی ہے میری اور اس کے ارادہ میں ضدین کا تقابل ہے یہ ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ لہٰذا چھوڑ دو اسے' اب چھوڑنے کی ترکیب یہ بھی تھی کہ اونٹنی کو بٹھا کر اتر کر اس کو چھوڑ کر پیادہ چل دیتا مگر عشق میں اتنا صبر کہاں' بس فوراً دھڑام سے اوپر سے گر پڑا (عاشق کو فرصت مصالح کے سوچنے کی کہاں ہوتی ہے) تمام بدن چھت گیا اور خونا خون ہو گیا سر پھوٹ گیا ہاتھ پیر زخمی ہو گئے' اب اُٹھ نہیں سکتا جس غرض کے لیے کودا تھا کہ لیلیٰ کی طرف جلدی سے چل دے وہ بھی حاصل نہ ہوئی تو پڑے پڑے کہتا ہے کہ پیروں سے نہیں چل سکتا تو لڑھک کر تو چل سکتا ہوں' بس لڑھکنا شروع کیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو اس کی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

یہ مشقتیں اور محنتیں اٹھائی ہیں عشاق نے جب یہاں کا ایک معشوق بلا محنت نہیں ملتا تو اللہ کیسے مل جائے گا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل نہ کرو' محض یہ خیال دل میں جما کر فرصت سے بیٹھ رہو کہ ہم کو اللہ سے محبت ہے۔ بس کمال بھی ہو گیا اور وصال بھی ہو گیا اور سبھی کچھ ہو گیا۔ حضرت بڑی مشقتیں بڑی محنتیں اٹھانی چاہئیں۔ ایک عاشق کہتا ہے:

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

اور بے عمل تو کیا ہوتا عاشق تو عمل کر کے بھی چین نہیں پاتا اس کو تو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے یہ عمل میرا محبوب کی نظر میں آیا یا نہیں اس کو تو اس بیم و رجاء میں ہر وقت موت اور زندگی کا مزہ آتا ہے۔

کشتگاں خنجر تسلیم را　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(تسلیم و رضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے)

ہر وقت مرنا ہے اور ہر وقت جینا ہے فارغ کسی وقت نہیں بیٹھ سکتا اس کا تو یہ شغل رہتا ہے:

اندریں رہ میتراش و میخراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس راہ سلوک میں اُدھیڑ بن میں لگے رہو یعنی خوب کوشش کرو آخر دم تک بے کار نہ رہو آخری وقت تو کوئی گھڑی ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

محبت میں چین کہاں

بھلا محبت اور چین استغفر اللہ وظیفے گھونٹ کر عاشق کیا چین پاتا جان و مال کھپا کر بھی اس کو چین نہیں آتا اس کے وظیفے تو یہ ہیں:

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا' جلنا' بھننا اور کپڑے پھاڑنا' پروانہ' شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے)

عاشق یہ وظیفے گھوٹتا ہے اور ایسے گھوٹتا ہے کہ دوسرا کوئی گھوٹ ہی نہیں سکتا' ساری دنیا اس میں اسی کی شاگرد ہے جو کوئی بھی ان اشغال میں دم بھرتا ہے تو اسی کی نقل کرتا ہے ان محنتوں سے آدمی محب کہا جا سکتا ہے کہ بلا عمل صرف خیال باندھ لینے سے اسی کو فرمایا ہے "بما کانوا یعملون" (ان کے اعمال کی وجہ سے) اب اس غلطی کا پورا وفعیہ ہو گیا کہ بدحواسی میں آ کر محبت کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور عمل کی ضرورت کا انکار یا عمل کے اہتمام میں تساہل کرتے ہیں۔ صاف فرما دیا کہ یہ سب نتائج ہیں عمل کے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ عرض کرتا ہوں۔ حاصل یہ ہے کہ اس روز اسلام کامل کی فضیلت بیان ہوئی تھی آج

اسلام کامل کے ثمرات کا بیان ہوا' اسلام کامل کی حقیقت کو بھی اس وقت مختصراً اعادہ کیے دیتا ہوں تاکہ اس کے حاصل کرنے میں سہولت ہو اور اس پر یہ ثمرات مرتب ہوں جو آج بیان ہوئے اسلام کامل کا خلاصہ انقیاد ہے یعنی سپرد کردینا اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے تکوینی احکام اور حوادث میں بھی اور تشریعی احکام اور اعمال میں بھی اور سپرد کردینے کے معنی یہ ہیں کہ ان سب باتوں میں یہ پیش نظر رکھے کہ کوئی بات حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف مجھ سے نہ ہونے پائے تکوینی احکام میں تو اس طرح کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور ہر حال میں راضی رہے اور حق تعالیٰ کو راضی رکھے کہ نہ خوشی میں کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف کرے نہ رنج میں بس اپنے آپ کو بندہ سمجھے جس طرف کو وہ چلائیں اس طرف کو چلے۔ حق تعالیٰ کو اپنی جان میں مال میں ہر قسم کے تصرفات کا مختار سمجھے اور تشریعی احکام میں اس طرح کہ شریعت کو ہر وقت پیش نظر رکھے' ہوائے نفسانی اور اغراض کو امام نہ بناوے بلکہ شریعت کو امام بناوے' خواہ وہ حکم اپنی طبیعت کے موافق ہو یا مخالف کسی قسم کی تاویل وتحریف وقطع برید نہ کرے جس طرف شریعت چلاوے اس طرف چلے اور دین کے تمام اجزاء کو کامل کرے صرف نماز پڑھ لینے سے اور روزہ رکھنے سے دین کا کمال نہیں ہوتا' دین کے اجزاء پانچ ہیں' عقائد عبادات' معاملات' معاشرات اخلاق ان سب کی تکمیل کر لینے سے کہا جائے گا کہ اسلام کامل ہوا اور ان سب کی تکمیل کے لیے کچھ محنت بھی اٹھائے نرے وعظ سننے اور ثمرات کی تمنا کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال میتواں بتمنا گریستن

(عرفی اگر گریہ سے وصال میسر ہو جاتا تو سو سال اس تمنا میں رونے کے لیے تیار ہوں)

اگر آدمی کھانا نہ پکائے فقط کھانوں کا تصور دل میں کرتا رہے اور مزے لیتا رہے تو اس سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اجزائے دین کا طریق تکمیل

نیز ان اجزاء کی تکمیل کے لیے ضرورت ہوگی علم کی اس کو بھی حاصل کیجئے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ سب باقاعدہ مولوی بن جائیں بلکہ علم کے معنی ہیں جاننا۔ اجزاء دین کو معلوم

کر لیجئے جس سے جس طرح ہو سکے جس کو فرصت ہو باقاعدہ مولوی بنے اور جو باقاعدہ مولوی نہ بن سکے تو اردو فارسی کی کتابوں ہی سے دین کی واقفیت پیدا کرے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکے تو مولویوں کے پاس نشست برخاست رکھے جو کام کرے ان سے پوچھ کر کرے اگر کوئی مولوی بھی اس طرح کا قریب میں نہ ہو تو آج کل تو ڈاک کا راستہ کھلا ہوا ہے دو چار پیسے میں جو چاہو معلوم کرلو یہ بھی ایک طریقہ ہے علم حاصل کرنے کا۔ غرض غافل نہ رہو ہر وقت خیال رکھو کہ کوئی بات حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور مسئلے مسائل کا بھی مشغلہ رکھو جہاں اور بہت سے کام ہیں ایک یہ کام بھی اپنے ذمہ سمجھو اور اس کے واسطے کچھ اپنا حرج اور مشقت بھی گوارا کرو نری تمناؤں پر اکتفا نہ کرو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

لو کان هذا العلم يدرک بالمنى ماکان يبقى فى البرية جاهل

فاجهد ولا تكسل ولاتک غافلا فندامة العقبى لمن يتكاسل

یعنی اگر یہ علم نری تمناؤں سے حاصل ہو جایا کرتا تو دنیا میں کوئی بھی جاہل نہ رہتا کوشش کرو اور سستی مت کرو اور غافل مت رہو کیونکہ آخرت کی ندامت اسی شخص کو ہوگی جو سستی کرے گا۔

بیداری اور ہمت کی ضرورت

اگر محض تمنا سے کچھ ہو جایا کرتا تو ساری دنیا کامل ہو جاتی ہے اس کے ساتھ دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ بیداری اور ہمت یعنی ہر وقت ہوشیار بھی رہو کہ تمہارے پیچھے نفس و شیطان بڑے دشمن لگے ہوئے ہیں ان سے دھوکہ مت کھانا جو کام کرو ان کے کہنے کے موافق مت کرنا حق تعالیٰ کے کہنے کے موافق کرنا یہ تو بیداری ہے اور احکام الٰہی کی پابندی میں طبیعت سستی کرے تو بتکلف کام لو یہ ہمت ہے ہر وقت اسی میں رہو تب بھی محبوب مل جاوے تو غنیمت ہے۔ اسلام کامل کا تو یہ حاصل ہوا اور ثمرات کا بیان آپ نے آج سن ہی لیا۔ پس اسلام کامل حاصل کیجئے حق تعالیٰ اس پر ثمرات ضرور مترتب فرماویں گے۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم اور ہمت عطا فرماویں۔

دعوتم بحمدالله الذى بعزته وجلاله تتم الصالحات

وصلى الله تعالى على سيدالكائنات صلوٰة تسبق الغايات.

التماس کاتب

احقر نے بمعاونت اپنے ایک مخلص دوست منشی ولی محمد صاحب پنجابی حال مقیم میرٹھ کے یہ وعظ از جانب اپنے والد ماجد مرحوم کے لکھا ہے۔ ناظرین ان کے واسطے دعا فرماویں اور جب وعظ ہذا کا مطالعہ ختم کریں یہ دعا پڑھیں۔

ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحسابo رب ارحمھما کما ربیانی صغیراً رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین یوم یقوم الحسابo ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیمo

اور ناظرین حضرت مولانا کے واسطے بھی دعا کریں کہ یہ جو کچھ ہے سب حضرت ہی کی برکت ہے اور اخیر میں احقر اور منشی ولی محمد صاحب کے لیے بھی دعا کریں۔ والسلام

فضائل العلم والخشية

بانس بریلی مدرسہ اشاعت العلوم میں ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۲۹ ہجری کو ۴ گھنٹے تک کھڑے ہوکر بیان فرمایا۔ موضوع ''فضائل علم دین وخشیت حق'' تھا۔ تقریباً ۵۰۰ افراد نے سنا جبکہ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی نے اسے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

قال اللّٰه تعالٰی انما یخشی اللّٰه من عبادہ العلمؤا ان اللّٰه عزیز غفور ○ (سورہ فاطر' آیت نمبر ۲۸)

ترجمہ: ''خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔''

غایت شفقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس مضمون کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے اس کے لیے چونکہ یہ ٹکڑا کافی تھا اس لیے اس پر اکتفا کیا گیا۔ مضمون کی تعین آیت کے ترجمے سے معلوم ہو جائے گی اور اس کا ضروری ہونا بھی اجمالاً ساتھ کے ساتھ ہی معلوم ہو جائے گا۔ اس جملہ کے قبل آیت میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے مضامین ہیں اس جملے سے بھی ان ہی مضامین کی تقویت مقصود ہے۔ بوجہ اس کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی مخالفت سے حزن وغم غالب رہتا تھا اور اس سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت شفقت وصفت تراحم کی ثابت ہوتی ہے یعنی آپ ان لوگوں کے راہ راست پر نہ آنے سے بہت ہی بے چین ہوتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ کون سی تدابیر ایسی ہوں کہ یہ لوگ اس کفر

وضلالت سے باز آ کر سیدھے راستہ پر آ جائیں اور عذاب دائمی سے نجات پائیں۔آپ کی وہ حالت تھی جیسا کہ ایک شفیق باپ اپنے نافرمان بیٹے کی حرکات پر کڑھتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور ہر وقت کسی نہ کسی تدبیر میں لگا رہتا ہے کبھی مصلحین سے مشورہ کرتا ہے کبھی کسی سے دعا کراتا ہے کبھی تعویذ لکھواتا ہے کہ کسی طرح یہ ٹھیک رستہ پر آ جائے۔غرض اس کو بیٹے کی نافرمانیوں پر اس سے عداوت نہیں ہوتی بلکہ اس پر رحم آتا ہے اور کڑھتا ہے اگر کبھی اس کو اپنے گھر سے نکالنے کا قصد بھی کرتا ہے تو یہ نیت ادخال کے کرتا ہے۔اس کو چھوڑ دینے یا اس سے قطع تعلق کر لینے کی نیت کبھی نہیں ہوتی اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کفار سے یہ حالت تھی کہ تمام عمر آپ کو یہی غم لگا رہا۔

آیات تسلی

حتیٰ کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کیلئے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل ہوئیں۔چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے "**لعلک باخع نفسک ان لایکونوا مؤمنین**" جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔دوسری جگہ ارشاد ہے "**لاتسئل عن اصحاب الجحیم**" کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں۔ایک اور جگہ ارشاد ہے "**لست علیھم بمصیطر**" کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے تعمیل کرا لیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہیں ہوئے۔پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے۔ایک اور جگہ فرماتے ہیں: "**وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقاً فی الارض او سلماً فی السمآء فتاتیھم بایتہ**" (اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ) ایک جگہ فرماتے ہیں: "**ولوشاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ**"

الناس حتّٰی یکونوا مؤمنین" کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گو ان کی قسمت میں دولت ایمان نہ ہو۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے "ولاتحزن علیھم ولاتک فی ضیق مما یمکرون" کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہو جائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: "ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون فسبح بحمد ربک وکن من السجدین" کہ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے سو آپ تسبیح وتحمید میں لگئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنا لیجئے کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہو جائے گی اور یہ غم ہلکا ہو جائے گا۔

رسول اکرمؐ کے غم وحزن کا منشاء

غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن وغم تھا۔ نیز ان آیات سے اس کے منی کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر وضلالت سے باز آ جائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردی حالت پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آ جانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ یہ لوگ ساری عمر اس کفر وگمراہی کے تیرہ وتاریک غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لیے انسان خیرخواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادتاً اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیرخواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتیٰ کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں اور اپنی حالت درست کر لیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ رؤسا مکہ نے یہ درخواست کی کہ آپ ان غریب لوگوں کو جو کہ آپ کے پاس میں ہمارے آنے کے وقت علیحدہ کر دیا کریں تو ہم ایمان لے آئیں۔ جیسا کہ آج کل کے رؤسا کہ وہ بھی اس قسم کی فرمائش علماء سے کیا کرتے ہیں اور کہا

کرتے ہیں کہ اگر ان جولاہے تیلیوں کو مساجد وغیرہ میں آنے سے روک دیا جائے تو ہم مساجد میں آنے لگیں اور جماعت سے نماز پڑھنے لگیں۔ یہ تو ہم سے نہ ہوگا کہ کسی سقے یا جولاہے کے پیچھے مقتدی بن کر کھڑے ہوں حالانکہ ان کو غیرت کرنی چاہیے اس لیے یہ کہنا کہ ہم ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے درحقیقت اپنے اوپر اعتراض کرنا ہے کہ یہ خود اس قابل نہ ہوسکے کہ امامت کا منصب ان کو عطاء ہوتا اور یہ دوسروں کے امام بنتے' غریب لوگ تو بیچارے خود ہی دب جاتے ہیں اگر ان میں لیاقت اور قابلیت ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ اگرچہ یہ لوگ سمجھتے نہیں کہ ہم میں لیاقت نہیں ہے کیونکہ آج کل روشن دماغی کے زمانے میں ذرا سا دنیاوی عزو جاہ بھی لیاقت اور قابلیت سمجھا جاتا ہے۔ دنیادار لوگ کچھ ایسے مغرور و مست ہوتے ہیں کہ گو وضو کے فرائض وسنن سے بھی واقفیت نہ رکھتے ہوں لیکن اپنے کو علوم دین ودنیا دونوں کا محقق سمجھتے ہیں حالانکہ واقفیت یہ ہے کہ:

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے　　حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(بعض عقلمند سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کچھ رتبہ حاصل کرلیا ہے حالانکہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سوائے تکبر اور بڑائی کے کچھ بھی حاصل نہیں کیا)

کفار رؤسا کی درخواست

میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک رئیس صاحب کو عید کی امامت کا شوق پیدا ہوا اور وہ امامت کو چلے اس کے قبل کبھی کیوں امامت کی تھی بلکہ شاید نماز کا بھی کبھی کبھی اتفاق ہوتا ہو اور وہ بھی کسی مجبوری ہی کی وجہ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تکبیرات بھول گئے اب کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کروں' آخر میں نے تکبیرات بتلائیں تو انہوں نے پوری کی۔ جب یہ حالت ہے تو اب بتلایئے اگر سقے امامت نہ کریں تو کون کرے اور وہ بیچارے بھی آگے نہ بڑھیں تو کون بڑھے تو جیسے ان کی حالت ہے اسی طرح اس زمانہ میں بھی رئیسوں کی یہی حالت تھی اس لیے ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ آپ ہمارے آنے کے وقت ان لوگوں کو ہٹا دیا کیجئے تو ہم آپ کے پاس آیا کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ شفقت کہ شاید اسی سے یہ لوگ کچھ مانوس ہوں اور رفتہ رفتہ راہ راست پر آجائیں ان کی

درخواست کو منظور فرمانے سے منع فرمایا اور درخواست کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تطرد الذين يدعون ربهم بالغدوة والعشي يريدون وجهه ما عليك من حسابهم من شئي وما من حسابك عليهم من شئي فتطردهم فتكون من الظالمين

کہ آپ کبھی ان لوگوں کو نہ ہٹایئے ان کا کچھ لین دین آپ سے نہیں ہے اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ بے موقع کام کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

یہ بات طالب علموں کے یاد رکھنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کو جو خدا تعالیٰ نے ظلم فرمایا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز ناجائز کیونکہ لفظ ظلم کلی مشکک ہے جس کے افراد مختلف مراتب کے ہیں۔ جیسا کہ امر ممنوع کو ظلم کہا جاتا ہے اسی طرح اس امر جائز حسن کو بھی کہ اس کے مقابلے میں کوئی امر اس سے احسن ہو ظلم سے تعبیر کر دیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تجویز فرمائی تھی وہ حسن تھی جیسا ابھی آتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز اس سے احسن تھی اس لیے اس کے اعتبار سے اس کو نامناسب کہہ دیا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کا حسن ہونا ظاہر ہے کہ اس تجویز سے یہ نیت تھی کہ کفار ہدایت پا جائیں اور اپنی حالت موجودہ سے نکل جائیں اور ظاہر ہے کہ اہتمام ہدایت حسن ہی ہوگا اس کے حسن ہونے میں شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرات صحابہ کرامؓ کی رسول اکرمؐ سے محبت کا حال

رہا یہ شبہ کہ تجویز اگرچہ کفار کیلئے ہدایت کا سامان تھی لیکن اس سے مسلمانوں کی تو دل شکنی ہوتی تو سمجھ لو کہ صحابہ کرامؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت تھی اگر آپ ان کی دھجیاں بھی اڑا دیتے تو ان لوگوں کے دل پر ذرا میل نہیں آ سکتا تھا وہ بزبان حال یوں کہتے تھے کہ:

ہرچہ آں شیریں کند خسرو بود

(جو کچھ وہ شیریں کر دیتا ہے وہی پسندیدہ ہوتا ہے) اور ان کی آپ کے ساتھ یہ حالت تھی:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندہ کرتا ہے تو یہ تیری عطاء و مہربانی ہے اور تو موت دے تو میں تیرا ہوں میری جان تجھ پر قربان ہے تو جو بھی کچھ کرے تیری رضا پر راضی ہوں)

جن کی یہ حالت تھی کہ اگر آپ تھوکتے تو اس کو زمین پر نہ گرنے دیتے تھے ہاتھوں میں لیتے اور اپنے چہرے پر مل لیتے اور اگر ہاتھ میں نہ آتا تو دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ پھیر کر چہرے کو مل لیتے اور بزبان حال یوں کہتے کہ:

مرا از زلف تو موے بسند ست　　　　ہوس را رہ مدہ بوے بسند ست

(تیرے بال میری زلفوں کے چند پسندیدہ بال ہیں ہوس کے لیے راستہ مت کھولو کہ بہت ہی پسندیدہ خوشبو ہے)

تو جن عشاق کا یہ مذہب ہو کہ:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(اللہ تعالیٰ دشمنوں کی خواہش پوری نہ کرے کہ تیری تلوار ہی ٹوٹ جائے' دوستوں کا سر سلامت رہے اور تو اپنے خنجر کی روانی کی آزمائش کرتا رہے)

ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ضیع مبارک کیونکر ناگوار ہوسکتا تھا تو یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دل شکنی ہوتی۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنی ذات میں حسن تھا مگر احسن کے مقابلہ میں اس کو نا مناسب کہہ دینا کچھ مضائقہ نہیں۔

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود　　　　لیک بس عالیست پیش خاک تود

(عرش الٰہی کے مقابلہ آسمان نیچے درجہ میں ہے لیکن تیری زمین کے مقابلہ میں ہزاروں درجہ بلندی پر ہے)

تجویز خداوندی

پس چونکہ خدا تعالیٰ کی تجویز احسن تھی اس لیے اس کے سامنے اس تجویز نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو بے موقع فرما دیا۔ باقی اس تجویز خداوندی کا احسن ہونا غور کرنے سے معلوم ہوگا کیونکہ یہ بہت زیادہ نظری ہے اس لیے کہ سب سے زیادہ نظری وہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لیے وحی کی ضرورت ہو اور عقول قدسیہ بھی اس تک بلا وحی نہ پہنچ سکیں۔ مجھے اس موقع پر

ایک بڑی بات یاد آئی۔ ہمارے زمانہ کے عقلاء بڑی غلطی میں ہیں کہ وہ تمام نظریات کو عقل سے دریافت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نظریات کی دو قسم ہیں۔ایک وہ نظریات کہ محض نظر اور فکر ان کے ادراک کے لیے کافی ہو جائے' سماع اور نقل پر موقوف نہ ہو۔ دوسرے وہ نظریات کہ اس میں عقل کے ساتھ نقل کی بھی ضرورت ہو۔سو ایسی نظریات بغیر انضمام نقل شرعی عقل وفکر سے حل نہیں ہوسکتی اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہمارے بعض دنیاوی معاملات بھی ایسے ہیں کہ ان کی نسبت جب تک کہ خود صاحب واقعہ بیان نہ کرے اس وقت تک دوسرے کو کچھ بھی پتہ نہیں چل سکتا۔مثلاً فریمسن زونا کہ اس کے رازوں کو کوئی دریافت نہیں کر سکتا خواہ کتنا ہی عقل مند ہو اس لیے کہ وہ راز معقول محض نہیں کہ عقل سے دریافت ہوسکیں بلکہ ان میں نقل کو بھی دخل ہے تو جب تک کہ نقل کی بھی آمیزش نہ ہو ان کا پتہ نہیں چل سکتا اور نقل مفقود ہے اس لیے کسی کو معلوم نہیں کہ وہاں کیا کیا معاملات ہوتے ہیں اور فریمسن ہونے والے کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر چیز کو اپنی عقل نارسا سے دریافت نہیں کر سکتے۔

قوت بصر کا حال

اور اس میں راز یہ ہے کہ ہر قوت کی ایک حد ہوتی ہے کہ وہ قوت اس حد تک کام دیتی ہے اس کے بعد معطل ہو جاتی ہے۔مثلاً آنکھ کہ اس کا کام دیکھنا ہے مگر وہ ایک خاص حد تک دیکھتی ہے جو لوگ آسمان کے منکر ہیں وہ بھی اس مسئلے کو مانتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ نیلگوں سطح جو جانب فوق میں ہم کو نظر آتی ہے یہ حد بصر ہے یعنی آنکھ کی قوت اس حد تک جا کر ختم ہو جاتی ہے آگے کام نہیں دیتی اس لیے یہ رنگ محسوس ہوتا ہے تو قوت بصر کا محدود ہونا تسلیم کیا۔

انکار سموت محض باطل ہے

اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس حالت میں انکار سموت محض باطل ہے کیونکہ اس حد سے آگے ہونے کا احتمال باقی ہے یا مثلاً آپ کے کان کہ ان میں سننے کی قوت ہے لیکن وہ ایک مقررہ حد تک کی آواز کو سن سکتے ہیں کبھی کسی نے بریلی میں بیٹھ کر کلکتہ کی توپ کی آواز نہ سنی ہوگی حالانکہ یہاں ایک ذریعہ بھی موجود ہے کیونکہ جرم ہوا کہ جس

کے ذریعہ سے کان میں آواز پہنچتی ہے۔ یہاں سے وہاں تک متصل واحد ہے کیونکہ خلا منفی ہے اب خواہ انتفاء امتناع عقلی ہو یا عدم عادی لیکن واقع یوں ہے کہ خلا کا وجود نہیں اور لیجئے آپ کی ناک کہ جس میں قوت شامہ مودع ہے کبھی یہاں بیٹھے ہوئے لکھنؤ کے عطر خانہ کی خوشبو محسوس نہیں کرتی۔ پس جب تمام قوی ایک حد تک کام کر سکتے ہیں۔

عقل کے غیر محدود ہونے کا حال

اور اس سے آگے عاجز ہیں تو عقل کہاں سے غیر محدود ہوگئی کہ اس کی قوت کا سلسلہ غیر متناہی چلا جائے اور کہیں ختم ہی نہ ہو بلکہ جیسے اور قوی ایک مقام تک جا کر معطل ہو جاتے ہیں اسی طرح عقل بھی اس حد تک پہنچ کر کہ وہ نقل ہے عاجز ہوگی خواہ نقل خدا کی ہو یا انسان کی۔ صاحبو! اگر عقل سے ہر بات دریافت کی جا سکتی ہے تو کیا وجہ کہ جب کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ پیش آتا ہے اس میں وکلاء سے رائے لیا کرتے ہو کیونکہ اس کے ہر پہلو کو اپنی عقل سے دریافت نہیں کر لیتے اور کیا وجہ کہ عقل سے ایک قانون تجویز کر کے حاکم کے سامنے پیش نہیں کر دیتے' کیا وجہ کہ ہائیکورٹ کے نظائر کی تلاش کی جاتی ہے کیا کسی صاحب کے پاس اس کا جواب ہے اور اگر کبھی کسی شخص کی سمجھ میں بھی کوئی بات آ جائے تو کیا وہ یہ جرأت کر سکتا ہے کہ خود یا بذریعہ وکیل خلاف قانون ہائیکورٹ کے ججوں کے سامنے پیش کر دے ہرگز نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ خلاف قانون کوئی بات پیش کرنے سے حاکم کان پکڑ کر اجلاس سے باہر کر دے گا۔

نظری عقل محتاج وحی ہے

افسوس مسلمانو! اگر ایک جج اس بناء پر کہ قانون کے خلاف کو قابل سماعت نہ سمجھے اور قانون کی دلیل پوچھنے کو گستاخی قرار دے کر کان پکڑ کر نکال دے تو اس کو متعصب نہ کہا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں اگر کوئی عالم یہی بات کہے کہ خلاف قانون شرعی قابل سماعت نہیں نہ حکمت پوچھنے کا ہر شخص کو منصب ہے تو اس عالم کو متعصب کہا جائے۔ حیف صد حیف کہ ہائی کورٹ کے جج کی تجاویز میں چون و چرا کی جرأت کی جائے۔ غرض جہاں تک عقل نہیں پہنچ سکتی وہ نظرِ وحی کی محتاج ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر وہاں تک نہ پہنچ

سکی۔اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ وہ کونسا جز تھا جس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر نہیں پہنچ سکی اور نہ پہنچ سکتی تھی۔وہ جز یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ایمان لے آنے کا احتمال تھا۔خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بتلا دیا کہ یہ ایمان تو لائیں گے نہیں پھر ان کے لیے کسی اہتمام کی کیا ضرورت ہے کیونکہ ایسے لوگوں کے لیے صرف تبلیغ واجب ہے مگر اہتمام فضول ہے۔اسی کو فرمایا ہے:

"انا اعتدنا للظالمین نارا" (ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے)

غرض آپ کی اس تجویز کی وجہ یہ تھی اور اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تو کبھی آپ مسلمانوں کو علیحدہ کرنا گوارا نہ فرماتے۔اب جبکہ معلوم ہو گیا تو یہی تجویز احسن تھی کہ خواہ آئیں یا نہ آئیں ان کو علیحدہ نہ کیا جائے گا۔یہ شرح اس آیت کی کہ میرا مقصود اس آیت کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کی یہ حالت تھی کہ جو لوگ بھی آپ کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے کفار کے ایمان لے آنے کی امید پر ان کی جدائی کو بھی گوارا فرما لیا۔

ایک صحابیؓ کی محبت نبوی کا عجیب عالم

اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت کی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے ایک مرتبہ آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ یہ تو امید ہے کہ ہم جنت میں جائیں گے لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ آپ کا درجہ جنت میں ہم سے بہت اعلیٰ ہو گا تو جب ہم کو آپ کا دیدار نصیب نہ ہو سکے گا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے۔خوب کہا ہے:

با تو دوزخ جنت ست اے جانفزا　　　　بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(آ محبوب دوزخ بھی تیرے ساتھ رہ کر تو گویا جنت ہے اور اے میرے دل کے بسنے والے تیرے بغیر تو جنت ہی گویا دوزخ ہی ہے)

اس پر یہ آیت نازل ہوئی "من یطع اللّٰہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء الآیۃ" (جس کسی نے اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کی وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء) کہ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

مرتبہ اعلیٰ ہوگا لیکن تم لوگ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم نہ رہوگے بلکہ تم لوگ بھی اس مقام تک پہنچ جایا کروگے جیسے دنیا میں گو مکان الگ الگ ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے اس کے گھر چلے جاتے ہو تو اسی طرح وہاں بھی گو مکان الگ الگ ہوں گے مگر ملاقات ہو سکے گی۔ ارشاد ہے "**ولکم فیها ماتشتهی انفسکم**" کہ جو تمہارا جی چاہے گا وہاں تم کو ملے گا تو اگر کسی کا یہ جی چاہے کہ میں ہر وقت زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف رہوں تو ضرور اس کو زیارت ہو سکے گی۔ رہی یہ بات کہ ایسی خواہش کسی کو پیدا ہوگی یا نہیں یہ ہم کو معلوم نہیں ہے یہ جی کے متعلق ہے ممکن ہے کہ بعض کو یہ دولت نصیب ہو بعض کو نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ جس کو یہ دولت نصیب ہوگی کیا وہ ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر پر پڑا رہے گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اپنے گھر ہی بیٹھے بیٹھے ہر وقت زیارت سے مشرف ہوتا رہے جس کی صورت یہ ہو کہ خدا تعالیٰ نظروں میں ایسی قوت پیدا کردیں کہ وہ درمیان کی حائل چیزوں کو پار کر کے وہاں تک پہنچ جائیں اس زمانے میں بھی ایسے آلات ایجاد ہوئے ہیں کہ ان کے ذریعے سے بہت دور دور کی چیزیں دکھلا دیتے ہیں اور درمیان کے پردے سب دور ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اگر نظروں میں ایسی قوت پیدا کردے تو کیا بعید ہے اور نظیر اس لیے بیان کی گئی کہ آج کل کے روشن دماغ لوگ جب تک کہ ولایت کی کوئی نظیر نہ ہو اس وقت تک منصوصات کو نہیں مانتے ورنہ ہم کو تو شرم آتی ہے کہ خدائی خبریں منوانے کے لیے یورپ کے صنائع پیش کریں۔ غرض صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جنت میں جانا بھی اس وقت تک ان کو پسند نہ تھا جب تک کہ دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حاصل نہ ہو۔

دیدہ از دیدنش نہ گشتے سیر   ہمچناں کز فرات مستسقی

(اس کے دیکھنے سے آنکھ کا جی نہیں بھرتا ایسے ہی جیسے دریائے فرات پر بھی پیاس کی بیماری والے کی پیاس نہیں بجھتی)

حضرات صحابہؓ کا معنوی حضور

تو باوجود اس کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا کرلیا کہ تھوڑی مدت کے لیے یہ لوگ نظر سے غائب رہیں اور حقیقت میں یہ غیبت ظاہری تھی ورنہ اصل غیبت نہ تھی۔ صحابہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار　　　جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

گو اس حضور اور ظاہری حضور میں فرق بھی ہے اور یہی معنوی حضور ہے کہ جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو سب سے بڑے محب تھے وہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستقل رہے۔ یعنی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورنہ کیا ممکن ہے کہ ایسے سانحہ عظیم کی حالت میں اتنی محبت مضبوط رہنے دے یہ اسی معائنہ کی بدولت ہے ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم خود ہی اس سے بے بہرہ ہیں تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گو پوری غیبت نہ ہوتی مگر یہ ظاہری غیبت بھی کب گوارا تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان لوگوں کے ایمان لانے کے احتمال پر اس غیبت کو گوارا فرمالیا۔ یہاں سے بطور تفریع کے کہتا ہوں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شفقت تھی تو ورثۃ الانبیاء کو بلکہ ہر فرد اُمت کو کیونکہ ہر فرد اُمت من وجہ وارث ہے کیونکہ منشاء وراثت علم دین ہے کیا کوئی فرد بشر اُمت محمد یہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دین سے بالکل بے بہرہ ہے ہرگز نہیں۔ خواہ وہ علم لا الہ الا اللہ ہی کا ہو اور جب ہر فرد اُمت کو یہ علم ہے تو کوئی مسلمان وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج نہیں تو جب آپ وارث ہوئے تو آپ کے ذمہ بھی وہی حق ہوگا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یعنی آپ اپنے مخالفین سے وہی برتاؤ کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا' یعنی شفقت۔

اہل دل کا ستانا اچھا نہیں

آج کل یہ حالت ہے کہ ذرا سے اختلاف میں عداوت اور تنفر ہو جاتا ہے بلکہ بعض لوگ تو اپنے مخالف کے اس قدر درپے ہوتے ہیں کہ اس کو دنیاوی نقصان بھی پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے اس کو کوئی دنیاوی نقصان پہنچ جائے تو اس کو اپنی کرامت اور اپنی بددعا کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اہل دل کا ستانا اچھا نہیں اس سے طرح طرح کے نقصان ہوتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد　　　تا دلے صاحبدلے نامد بدرد

(جب تک کسی صاحب دل کے دل کو درد نہیں پہنچتا رسوائی نہیں ہوتی)

خواجہ حافظ کہتے ہیں:

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   با دردکشاں ہر کہ در آویخت بر آویخت

(یہ دنیا ادلے بدلے کی ہے ہم نے اس دنیا میں بہت تجربہ کیا ہے کہ جو شرابیوں کے ساتھ لپٹ گیا وہ لپٹ ہی گیا)

مصیبت زدوں کیلئے دعا کرنا چاہیے

تو یہ بات بالکل سچ ہے مگر یہ کسی کو کب جائز ہے کہ وہ اپنے کو ایسا سمجھے ہاں البتہ اگر کوئی دوسروں کی نسبت یہ گمان کرے تو بیجا نہیں اور اس وقت بھی بیجا نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دیکھ کر خوش ہو بلکہ غمگین ہونا چاہیے اور ان کے لیے دعا کرنا چاہیے اور یہ حالت ہونی چاہیے کہ جیسے کسی کا لڑکا کہ وہ جوا کھیلتا تھا اور اس میں پکڑا گیا تو دیکھئے کہ اس کے باپ کی کیا حالت ہوگی اگرچہ اس خبر کو سن کر زبان سے یہ کہہ دے گا کہ اچھا ہوا پکڑا گیا لیکن دل کی یہ حالت ہوگی کہ بیقرار ہو جائے گا تدبیریں کرے گا دعائیں کرائے گا اور جگہ جگہ کہتا پھرے گا بلکہ اگر کوئی اس کے سامنے یہ تذکرہ کرے گا تو اس کو ناگوار ہوگا' لوگ اگر عیادت کو آئیں گے تو ان کی عیادت لے گا تو صاحبو! کیا وجہ ہے کہ اگر اپنے بیٹے پر کوئی مصیبت آ جائے تو قلب کی یہ حالت ہو جائے اور کسی دوسرے مسلمان پر کوئی مصیبت آئے تو دل کو اثر بھی نہ ہو' میں اس کی شکایت کرتا ہوں۔ ہاں اگر شفقت کی وجہ سے غصہ ہو تو وہ برا نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے غصے کا یہ عالم تھا کہ شاید ہی کوئی شخص ان کے غصے سے بچتا ہو لیکن باوجود اس کے کبھی کسی کو ناگوار نہ ہوتا تھا اس لیے کہ وہ خلوص سے ہوتا تھا۔ خوب کہا ہے:

محبت ہو کسی سے یا عداوت   مزا دی جائے گی جو دل سے ہوگی

صاحبو! تمہارے پاس دل نہیں تمہاری ہمدردی محض لفاظی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

لفظی ہمدردی

میں آج کل کے مدعیان ہمدردی کے لیے ایک مثال پیش کیا کرتا ہوں کہ اگر ایک ایسے شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دی جو کہ اپنے گھر سے خوشحال ہے ایسا کہ اگر نوکری نہ بھی

کرے تو اس کے ضروریات پوری طور سے چل سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسرا ایسا شخص درخواست دے کہ وہ بالکل مفلوک الحال ہے ایسا کہ اگر اس کو یہ ملازمت نہ ملے تو کھانے پینے کی ضروریات بھی اس کی مشکل سے پوری ہوں اور یہ خوش حال صاحب درخواست دینے میں مقدم ہوگئے اور وہ غریب دوسرے نمبر پر ہوگیا تو ہم نے آج تک کسی مدعی ہمدردی کو نہیں سنا کہ اس نے اس غریب آدمی کی غربت پر خیال کر کے اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور میں اہل اللہ میں ہزاروں نظیریں اس سے زیادہ دکھلا دوں جو کہ دنیا داروں میں کبھی نہیں ہوسکتی۔ ہاں دنیاداروں میں ایک وضعداری ہے کہ دنیا کی لاج کے مارے اس کو نباہتے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک تو ہمدردی نہیں ہوتی اور دوسرا فرق ان میں اور اہل اللہ میں یہ ہے کہ اللہ والے کریں گے بہت کچھ اور کہیں گے کچھ نہیں اور یہ لوگ کریں گے خاک نہیں اور دنیا بھر میں غل مچاتے پھریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اہل اللہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ دنیاوی غرض ان کی نہیں ہوتی اور یہ جو کچھ کم وبیش کرتے بھی ہیں تو محض دنیاوی اغراض کے لیے اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ ان دنیا داروں کی ہمدردی کو بقاء و دوام نہیں ہوتا کیونکہ دنیا جس کے لیے یہ ہمدردی کرتے ہیں خود فانی اور متغیر ہے اس کے حالات اغراض و مصالح بھی بدلتے رہتے ہیں صبح کچھ ہے تو شام کچھ ہے تو جب مصالح دنیا متغیر ہیں تو ان کی ہمدردی باقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں بھی تغیر پیش آئے۔ ممکن ہے کہ کل سچ بولنے میں دنیوی مصلحت تھی اور آج جھوٹ بولنے میں دنیوی مصلحت ہے۔

اہل اللہ کی ہمدردی

اور اہل اللہ کی ہمدردی قائم و دائم ہے کیونکہ جس ذات کے خوش کرنے کے لیے وہ ہمدردی کرتے ہیں وہ خود غیر فانی ہے پھر غرض ان کی ایک متعین ہے خدا تعالیٰ کو خوش کرنا اور وہ جس امر سے آج خوش ہیں۔ قیامت تک اسی سے خوش ہیں نیز دنیا داروں کی ہمدردی تو محض قومی ہمدردی ہے یعنی وہ جو کچھ کم زیادہ ہمدردی کرتے ہیں اپنی قوم سے من حیث القوم کرتے ہیں اور اہل اللہ کی ہمدردی عام ہمدردی ہے کہ وہ ہر شخص سے وہی برتاؤ شفقت کا کرتے ہیں جو اپنوں سے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جانوروں تک سے ہمدردی ہوتی ہے ان کی وہ

شان ہوتی ہے جس کو فرمایا ہے "وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین" کہ تمام جہان کے لیے ان کی ذات بابرکات رحمت خداوندی ہوتی ہے۔ چنانچہ ملا دو پیازہ نے اپنے آل نامہ میں لکھا ہے: "الرسول خیر خواہ دشمناں" (رسول دشمنوں کا بھی خیر خواہ ہوتا ہے)

حکایت حضرت جنیدؒ و حضرت شبلیؒ

حضرت جنیدؒ کو ایک مرتبہ خلیفہ وقت نے کسی بات پر برہم ہو کر بلا بھیجا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے جب روبرو ہوئے تو خلیفہ نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ حضرت شبلیؒ چونکہ نوجوان تھے نیز ان کے پیر کو برا بھلا کہا جارہا تھا آپ کو جوش آیا قالین پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی آپ نے اس پر نظر ڈالی تو وہ شیر مجسم ہو کر خلیفہ کی طرف خشم آگیں نظر سے دیکھنے لگا۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی جو اس پر نظر پڑی تو آپ نے حضرت شبلیؒ کو گھور کر دیکھا اور اس شیر کو تھپک دیا وہ مثل سابق شیر قالیں ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں حضرت شبلیؒ نے پھر اسے اشارہ کیا اور وہ پھر مجسم ہو کر سامنے ہوا اس مرتبہ خلیفہ وقت کی نگاہ بھی اس پر پڑی، خوف کے مارے تھرا گیا اور دست بستہ اپنی جرأت کی معافی چاہی۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس شیر کو تو فوراً مثل سابق کر دیا اور خلیفہ وقت سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، آپ خلیفہ وقت ہیں آپ کی اطاعت اور ادب ہم پر واجب ہے یہ لڑکا ہے آداب شاہی سے واقف نہیں ہے آپ کا جو دل چاہے کہیے۔

اہل اللہ کی عجیب شان

صاحبو! آپ نے سنا یہ ہوتی ہے ان حضرات کی شان۔ دنیادار اگر اطاعت کرتے بھی ہیں تو اسی وقت تک اطاعت کرتے ہیں کہ اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے ورنہ اطاعت اور فرمانبرداری سب ختم ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کی یہ حالت ہے کہ گو سب کچھ کر سکتے ہوں مگر کچھ نہیں کرتے کیونکہ جانتے ہیں کہ امر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "اطیعوا اذا امرکم" ان حضرات کی جو بات بھی ہوگی پائیدار ہوگی اس لیے کہ یہ پورے شفیق اور سچے رفیق ہیں۔ اس سے زیادہ کیا شفقت ہوگی کہ شیر کو مار رہے ہیں اور بادشاہ کو خبر بھی نہیں کرتے اس لیے کہ مقصود اس کے ساتھ ہمدردی کرنے سے خدا کو خوش کرنا ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ کی حکایت لکھی

ہے آپ کے زمانہ میں ایک شیخ تھے آپ کو مکشوف ہوا کہ ان کا نام خدا تعالیٰ کے یہاں اشقیا میں لکھا ہوا ہے تو باوجودیکہ ہم عصری میں ایک قسم کی منافست ہوتی ہے لیکن آپ نے ان کو اطلاع کیے بغیر برابر ان کے لیے دعا کی کہ اے خدا ان کا نام اشقیاء سے محو کر کے سعداء کی فہرست میں لکھ دیجئے۔ دیکھئے ان بزرگ کے ساتھ کتنی بڑی ہمدردی کی لیکن ان کو خبر بھی نہیں ہونے دی نہ ہم عصری کی وجہ سے آپ کے قلب میں کسی قسم کی منافست کی شان پیدا ہوئی۔ بعض لوگ شیخ نہیں ہوتے مگر وہ دعویٰ مشیخیت کا کرتے ہیں اور ان کو اہل حق سے کشیدگی ہوتی ہے اور ہونا عجب بھی نہیں کیونکہ یہ حضرات خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اہل باطل کو عداوت ہوتی رہی ان کے ساتھ بھی اہل باطل کو پرخاش ہونی چاہیے۔ محققین نے اس کو علامات کمال میں سے لکھا ہے۔

بزرگی کی علامت

حضرت سلطان جی کے زمانے میں ایک بزرگ تھے ان پر اتفاق سے ایسا افلاس آیا کہ تمام مال و متاع ختم ہو کر صرف ایک لونڈی رہ گئی جب اس لونڈی نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں تو ان سے عرض کیا کہ اب مجھے بیچ دیجئے۔ آخر میں کس کام کی ہوں۔ گو یہ ضرور ہے کہ

ترا بندہ چوں من بیفتد بسے مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

مگر کسی دیندار کے ہاتھ بیچئے گا آپ نے کہا کہ میں تجھے ایسے شخص کے ہاتھ بیچوں گا کہ اس سے زیادہ اس وقت کوئی دیندار نہیں۔ یعنی حضرت نظام الدین سلطانؒ جی کے ہاتھ اس نے عرض کیا کہ حضور ہے تو گستاخی لیکن ان بزرگ کی بزرگی میں تو مجھے شبہ ہے کیونکہ بزرگی کی علامت سے یہ بات بھی ہے کہ کوئی نہ کوئی تو اس کو برا کہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ان کو کوئی بھی برا نہیں کہتا۔ افسوس آج کل یہ علامت بزرگی سے سمجھا جاتا ہے کہ جہاں گئے اس رنگ کے ہو گئے کہ ساری دنیا خوش رہے' گنگا پر گئے گنگا رام جمنا پر گئے جمنا رام۔ نیز حضرت سلطان جی کے در پر بڑے بڑے اکابر دنیا سلاطین و وزراء تک دست بستہ آتے تھے اس لیے بھی اس کو شبہ ہوا۔ اس موقعہ پر ایک حکایت یاد آ گئی کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک وزیر حاضر تھا' کھانے کا وقت آیا' خادم نے کھانا لانے کی اجازت چاہی' وزیر کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ

اگر آج مچھلی کے کباب ہوں تو خوب ہو۔ حضرت سلطان جی اس کے خطرے پر مطلع ہو گئے خادم سے فرمایا ذرا ٹھہرو تھوڑی دیر میں اس نے پھر دریافت کیا آپ نے پھر یہی جواب دیا' حتیٰ کہ کچھ دیر کے بعد ایک شخص ایک خوان میں مچھلی کے کباب لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ مچھلی کے کباب آپ کے لیے لایا ہوں آپ نے دسترخوان لگانے کا حکم دیا وزیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا' آپ نے وزیر سے فرمایا' لیجئے مچھلی کے کباب حاضر ہیں مگر ذرا وقت کی گنجائش رکھ کر فرمائش کیا کیجئے۔ غرض آپ کے اندر ایک محبوبیت کی شان تھی۔ ایک حضرت علاؤالدینؒ تھے کہ گولر کھا کر بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی نہ ہوتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است　　　بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

(پھول کے کان میں جو بات تو کہے کہ وہ تیرا تابعدار ہے اور عندلیب سے جو کچھ بھی آوے کہتے ہیں وہ شکوہ کرتا ہے)

ہر ایک کا رنگ و بوا لگ ہے کوئی کسی شان کا ہے کوئی کسی شان کا ہے تو حضرت سلطان جی کی یہ حالت تھی کہ آپ کے در پر سب سر نیاز خم کرتے تھے اس لیے اس لونڈی کو آپ کی بزرگی میں شبہ ہوا۔ ان بزرگ نے اس سے کہا کہ میں تجھے بیع خیار کے طور پر بیچوں گا دو تین دن کے اندر تو ان کی حالت دیکھ لینا پھر اگر تیری مرضی ہوگی تو رہنا ورنہ میں تجھے واپس لے لوں گا۔ غرض اپنے حضرت سلطان جی کے ہاتھ اس کو فروخت کر دیا وہ چونکہ آپ کی پورے طور پر معتقد نہ تھی اس فکر میں لگی رہی۔ حضرت سلطان جی کو کشف کے ذریعے سے اس کے وسوسہ پر اطلاع ہو گئی آپ نے اس سے فرمایا جا کر پڑوس سے آگ لے آؤ' پڑوسن کے ہاں گئی اور کہا کہ حضرت جی کے ہاں تھوڑی آگ کی ضرورت ہے' پڑوسن نے حضرت کا لفظ سن کر آپ کو بہت کچھ برا بھلا کہا اور کہا کہ ڈاکو کو حضرت کہتے ہیں' لونڈی یہ سن کر بہت خفا ہوئی اور بگڑ کر واپس چلی آئی۔ حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ اب تو معلوم ہو گیا کہ مجھے سب اچھا نہیں سمجھتے' دیکھ میری پڑوسن ہی مجھ کو کیسا برا سمجھتی ہے اس نے کہا کہ حضرت یہ میری جہالت تھی واقعی آپ صاحب کمال ہیں۔ پھر مدت خیار گزرنے کے بعد اس کے پہلے مالک آئے اور آ کر اس سے پوچھا اس نے عرض کیا کہ حضور واقعی یہ بزرگ ہیں اب آپ کو واپس لینے کی ضرورت نہیں۔

کاملین کی حالت

غرض مقبول عام ہونا کوئی بزرگی کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عدم کمال کی علامت ہے۔ کاملین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کو اگر سب بھی برا کہیں تب بھی یہ کسی کو کچھ نہ کہیں' میں یہ نہیں کہتا کہ ان حضرات کو غصہ نہیں آتا' غصہ ضرور آتا ہے مگر وہ غصہ خدا کے لیے ہوتا ہے اپنے نفس کے لیے نہیں ہوتا اپنے نفس کے لیے ان کی وہی حالت ہوتی ہے جس کو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو کہ دس برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے کہ **"ماقال لی قط لما فعلت"** کہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں کام تو نے اس طرح کیوں کرلیا اس طرح کیوں نہیں کیا حتیٰ کہ بوجہ بچپن کے یہ اس قدر بے تکلف تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے کسی جگہ ان کو جانے کو فرمایا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں تو نہیں جاتا مگر دل میں یہ تھا کہ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے انکار پر خفا نہیں ہوئے' اگر کوئی کام ان سے بگڑ جاتا تو آپ فرماتے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا مگر ان پر خفا نہ ہوتے تھے۔

معتقد تقدیر کا حال

آج کل کے روشن خیال لوگوں نے مسئلہ تقدیر کو بالکل ہی چھوڑ دیا' کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر ہی سے مسلمانوں کو تنزل ہو رہا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقدیر ہی کے مسئلے کی بدولت ترقی ہوئی ہے اس سے تنزل ہرگز نہیں ہوا کیونکہ مدار ترقی کا ہمت پر ہے اور ہمت قائل تقدیر کی برابر کسی کو نہیں ہو سکتی منکر تقدیر تو فقدان اسباب کے وقت جی چھوڑ دیتا ہے اور معتقد تقدیر اس وقت بھی خدا تعالیٰ پر نظر کر کے ہمت نہیں ہارتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ:

عقل در اسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبب را نگر

(عقل اسباب اور وسائل پر نظر رکھتی ہے مگر عشق و محبت یہ کہتی ہے کہ اسباب کے پیدا کرنے والے کو دیکھ)

اسی طرح اس شخص کو کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اپنے دل کو یہ سمجھ کر تسلی دے لے گا کہ **"لن یصیبنا الا ماکتب اللہ لنا"** (ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچ

سکتی بجز اس کے کہ جس خدا تعالیٰ نے ہمارے واسطے لکھ دیا ہے) غرض پوری راحت تقدیر ہی کے ماننے سے ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر دو شخص ایسے ہوں کہ تمول میں بھی برابر ہوں دنیاوی عیش بھی دونوں کو برابر حاصل ہو عقل اور مزاج اور قوت وغیرہ سب میں یکساں ہوں دونوں کے ایک بیٹا بھی ہو۔ غرض ہر طرح کے سامان دونوں میں برابر ہوں کسی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہ ہو مگر اتنا فرق ہو کہ ایک مسئلہ تقدیر کا قائل اور دوسرا منکر ہو اور اتفاق سے ایک ہی تاریخ میں ان دونوں کی اولاد مر جائے اور فرض کیجئے کہ ان کے مرنے کا ظاہری سبب یہ ہوا ہو کہ دونوں کی بیماری کی تشخیص ہونے میں اور علاج میں غلطی ہو گئی تھی۔ تو اب بتلایئے کہ ان میں سے کس کا صدمہ جلدی ختم ہو گا اور کس کا صدمہ دیرپا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جو تقدیر کا قائل ہے اس کو بہت جلد راحت نصیب ہو جائے گی کیونکہ صدمہ پڑتے ہی اس کو یہ خیال ہو گا کہ "مااصابکم من مصیبة فباذن الله" (جو کچھ بھی پہنچی تم کو مصیبت میں سے بس وہ خدا کی اجازت سے پہنچی ہے) کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ نیز اس کو فوراً خیال ہو گا کہ ممکن ہے اس کی موت ہی میں کوئی مصلحت ہو۔ ان خیالات کے آتے ہی اس کا صدمہ ختم ہو جائے گا برخلاف منکرین تقدیر کے کہ اس کو ساری عمر یہ غم لگا رہے گا کبھی سوچے گا کہ افسوس میں نے فلاں تدبیر نہ کی ورنہ ضرور میں کامیاب ہوتا اور لڑکا بچ جاتا کبھی کہے گا کہ فلاں بد پرہیزی نہ کی جاتی تو ہرگز نہ مرتا۔ غرض اسی طرح کے پریشان کن خیالات میں تمام عمر غلطاں پیچاں رہے گا۔ اب میں پوچھتا ہوں عقلاء زمان بتلایئے کہ اس موقعہ پر پریشانی کا دفعہ کرنا اور راحت حاصل کرنا ضروری ہے یا نہیں' اگر ضروری ہے تو ذرا مہربانی کر کے بتلا دیجئے کہ سوائے مسئلہ تقدیر کے ماننے کے اور کون سی ایسی صورت ہے کہ اس شخص کی پریشانیاں دور کر دی جائیں اور اسے راحت نصیب ہو جائے۔ افسوس شریعت نے کتنا پاکیزہ مسئلہ ہم کو دیا اور ہم نے اس کی یہ قدر کی۔ ہماری وہ حالت ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔

شدت وحی کا عالم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس تک وحی کا بوجھ اٹھا اٹھا کر اس کی سختیاں برداشت کر کے ہم کو زر و جواہر دیئے اور ہم نے سنگریزوں کی طرح ان کی ناقدری کی۔ وحی کی شدت کا یہ

عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی ران پر زانوں رکھے بیٹھے تھے۔اس وقت وحی نازل ہوئی' حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "کادان ترخی فخذی" یعنی کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران پاش پاش ہو جائے گی۔ایک مرتبہ آپ اونٹنی کے اوپر سوار تھے۔اسی حالت میں وحی نازل ہوئی اس قدر شدت تھی کہ اونٹنی سہار نہ سکی اور بیٹھ گئی۔غرض کتنی تکالیف برداشت کر کے عالم غیب سے فیوض لیے اور آپ کو مفت دیئے۔گویا تخم ریزی کا کھیت کاٹا' آٹا بنایا' پکایا اور لقمہ تیار کر کے آپ کے منہ میں رکھ دیا مگر آپ ہیں کہ اس کو منہ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔صاحبو! اگر قیامت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا ہی دریافت فرمالیا کہ میرے احکام کی تم نے کیا قدر کی تو بتلاؤ تم کیا جواب دو گے۔یہ سب بیچ کے مضامین استطرادی تھے بمناسبت مضمون شفقت کے ان کا ذکر آ گیا۔

اصل مقصود

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ کفار بہت ستاتے تھے (اور جب آج کل مدعیان موافقت ہی طرح طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو صدمہ دیتے ہیں تو وہ لوگ تو کافر تھے آپ کو مانتے بھی نہ تھے' جتنا ستاتے کم تھا) اور آپ غایت شفقت رکھتے تھے تو آپ کو ان کی مخالفتوں سے بہت غم ہوتا تھا اور ان کے مال کو سوچ کر بہت کڑھتے تھے اور چونکہ واقعات بہت زیادہ تھے جن کی وجہ سے غم بھی بہت زیادہ ہو گیا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے جابجا آپ کی تسلی فرمائی ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے جس کو تلاوت کیا گیا۔چنانچہ اسی کی تمہید وتائید میں اس آیت سے پہلے فرماتے ہیں: "انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب واقاموا الصلوٰۃ" (آپ ان لوگوں کو ڈراتے ہیں جو اپنے پروردگار سے غائبانہ طور پر ڈرتے ہیں اور نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں) یعنی آپ کے انذار سے منتفع ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ قلب میں خشیت ہو اور خدا کی اطاعت ہو اور یہ اس سے معرا ہیں اور آگے فرماتے ہیں "وما یستوی الاعمیٰ والبصیر" (اور نہیں برابر ہو سکتے اندھے اور دیکھنے والے) کہ اندھے اور بینا تاریکی اور نور سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہو سکتی تو یہ لوگ تو اندھے ہیں اور ان کے قلب تاریک محض ہیں

پھر یہ کیونکر منتفع ہوسکتے پھر آپ ان کے حالات سے غمگین کیوں ہوتے ہیں۔ آگے ارشاد ہے:"ان اللّٰہ یسمع من یشآء ومآانت بمسمع من فی القبور ان انت الا نذیر" (بیشک خدا تعالیٰ سناتے ہیں جس کو چاہتے ہیں اور نہیں سنا سکتے ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں نہیں آپ مگر ڈرانے والے) کہ خدا جس کو چاہیں سنا دیں آپ ان لوگوں کو جو کہ بے حسی میں مثل مردوں کے ہیں نہیں سنا سکتے۔ (آپ اس غم میں نہ پڑیں) آپ تو ایک نذیر ہیں۔ آگے فرماتے ہیں "الم تر ان اللّٰہ انزل من السمآء مآء فاخرجنا به ثمرات مختلفا الوانها ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها و غرابیب سود" (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی۔ پس نکالا ہم نے اس کے ذریعہ سے رنگ برنگ کے پھل اور پہاڑوں سے چکنے سفید اور سرخ پتھر جن کے رنگ ہیں اور انوکھے نایاب سیاہ پتھر) حاصل یہ کہ جس طرح ثمرات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اعیان بھی مختلف ہیں۔ آگے ارشاد ہے: "ومن الناس والدوآب والانعام مختلف الوانه کذالک" (لوگوں میں سے (انسان) چوپاؤں اور جانوروں میں سے ان کا رنگ بھی اسی طرح مختلف ہوتا ہے) کہ انسانوں میں چوپاؤں میں سب میں مختلف طرح کے ہوتے ہیں پھر اگر یہ لوگ بھی اسی طرح طور کے ہوگئے تو تعجب کیا ہے۔ آگے فرماتے ہیں "انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمٰؤا" (بیشک اس کے بندوں میں سب سے زیادہ ڈرنے والے علماء ہیں) یعنی اوپر معلوم ہوا ہے "انما تنذرالذین یخشون الخ" کہ انذار سے انتفار موقوف ہے خشیت پر اور یہاں فرماتے ہیں کہ خشیت ان لوگوں میں ہوگی کہ جن لوگوں میں علم ہوکہ

غم کی حد

خلاصہ یہ ہوا آپ کے انذار سے وہ منتفع ہوسکتا ہے جس میں خشیت ہو اور خشیت ان میں ہوگی کہ جن میں علم ہو تو آپ کے انذار سے منتفع ہوسکتا ہے جس میں منتفع وہ لوگ ہوں گے جن میں علم ہو کیسی کامل تسلی فرمائی اور ملتجا کیسی اچھی چیز پر رکھا کہ وہ محسوس ہے تاکہ آپ کی پوری پوری تسلی ہوجائے کہ جہاں آپ علم دیکھیں وہاں اہتمام بھی کریں اور جہاں یہ نہ ہو

وہاں غم نہ اُٹھائیں اور اس آیت سے کئی فائدے معلوم ہوئے۔ ایک تو یہ کہ علماء کو چاہیے کہ وہ ایسوں پر بھی شفقت کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ غم کی بھی ایک حد ہونا چاہیے کہ اس حد سے آگے نہ بڑھا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو قوی تھے ہم ضعیف ہیں اگر غم کا زیادہ بار ہم پر پڑے گا تو اندیشہ ہے کہ ہم کو مالیخولیا نہ ہو جائے تو ایسے لوگوں کے لیے زیادہ اہتمام کے بھی درپے نہ ہوں۔ یہ شریعت کی خوبی ہے کہ اس نے افعال حسنہ اور اخلاق حسنہ کی بھی حدود مقرر کر دیں کہ ان سے آگے نہ بڑھا جائے میں اس کی کچھ تفصیل کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "**اسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا وبین معاصیک**" (میں آپ سے درخواست کرتا ہوں آپ کے ایسے خوف کی جو ہمارے اور آپ کی نافرمانی کے درمیان حائل ہو جائے) اور یہ اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آج کل کے عقلاء معلوم کر لیں کہ تعلیم محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر غامض ہے کہ کوئی پہلو اس میں چھوڑا نہیں گیا۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ ہم تو اس کے قائل ہیں اگر منکر ہوتے تو ہمارے سامنے اس کا بیان کرنا ضروری تھا تو میں کہوں گا کہ حضور اگر قائل ہو اور واقعی دل سے یہ کہتے ہو تو پھر احکام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دخل کیوں دیتے ہو اور اگر تم کو کسی حکم کی حکمت نہیں معلوم ہوتی تو اس کو خاموشی کے ساتھ مان کیوں نہیں لیتے۔ آج کل ایسے تو کم ہیں کہ وہ یوں کہہ دیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم پر حکمت ہے اور فلاں حکم میں کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں بلکہ مولویوں کا بنایا ہوا ہے اور یہ مرض اس زمانے میں بھی تھا کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ آپ کا تراشا ہوا ہے چونکہ یہ تکذیب آیات کی تھی آپ کو اس سے حزن ہوتا تھا۔

سبب محزن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

جس پر یہ آیت تسلی کے لیے نازل ہوئی "**قد نعلم انه لیحزنک الذی یقولون فانهم لایکذبونک ولکن الظالمین بایت الله یجحدون**" (تحقیق کہ ہم جانتے ہیں کہ بے شک وہ آپ کو رنجیدہ کرے گا وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں پس بیشک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن بیشک (یہ) ظالم ہیں خدائے تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں) اس کی مشہور

تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ ان کے اقوال سے مغموم ہوتے ہیں سو آپ کیوں غم کرتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے یہ تو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں مگر میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال سے رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے کہ آپ اس پر صبر کر لیں بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں جس پر آپ کو صبر ہو ہی نہیں سکتا اور اس کو کوئی تفسیر بالرائے نہ سمجھے کیونکہ تفسیر بالرائے وہ ہے کہ جو قاعدہ شرعیہ و قواعد عربیہ کے خلاف ہو اور یہ تفسیر نہ قواعد عربیہ کے خلاف نہ شرعیہ کے یہ مضمون کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی برائی سننا اتنا ناگوار نہ ہوتا تھا جتنا خدا کی برائی سننا۔ خود حدیث سے ثابت ہے۔ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذمم رکھا تھا اور یہی نام لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ناگوار نہیں ہوا بلکہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ "انظروا کیف صرف اللہ عنی شتم قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمّد" (دیکھو کس طرح پھیر دیا خدا تعالیٰ نے قریش کی گالیوں کو جو گالیاں دیتے برائی کیے ہوئے کو اور لعنت بھیجتے برائی کیے ہوئے (محمد) کو حالانکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں کفار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بجائے محمد (تعریف کیے ہوئے) مذمم (برائی کیے ہوئے) کہا کرتے تھے) (نعوذ باللہ) اور خدا کو برا کہنے میں کبھی آپ نے اس قسم کی توجیہ نہیں کی بلکہ آپ کو سخت ناگوار گزرتا تھا چاہے جس انداز سے بھی وہ برا کہتے۔

مثال تفسیر بالرائے

تفسیر بالرائے کی مثال میں آپ کو بتلاتا ہوں آج کل کے روشن دماغوں میں سے ایک صاحب نے ربوا کو حلال لکھا اور فرمایا کہ "احل اللہ البیع وحرم الربوا" (اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا اور سود کو حرام کر دیا ہے) میں یہ لفظ ربوا نہیں بلکہ ربا بضم الرا ہے جس کے معنی ہیں اچکنے کے۔ گویا یہ فارسی کے مصدر ربودن سے ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اعراب تو قرآن پر تھے نہیں بعد میں مولویوں نے جو چاہا اعراب لگا دیا۔ غرض قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج اس واسطے ہوا تھا کہ وہ لوگ خدا کو

برا بھلا کہتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتے تو آپ کو اس قدر نا گوار نہ ہوتا۔ اسی طرح ہم لوگ بھی خوش ہیں کہ آج کل کے روشن دماغ جو کچھ الزام لگاتے ہیں ہمیں پر لگاتے ہیں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں کہتے مگر ان پر اتنا افسوس ہے کہ انہوں نے محض اس وجہ سے کہ کسی قول میں ان کو کوئی حکمت معلوم نہیں ہوئی اس قول کو قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا انکار کر دیا۔ میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ صاحبو! کیا تمہاری عقل تمام حکم کو حاوی ہوگئی ہے ہرگز نہیں؛ جب یہ ہے تو بس تمہاری یہ حالت ہونی چاہیے کہ:

زباں تازہ کردن باقرار تو ۔ نینگیختن علت ازکار تو

(زباں سے تیرے اقرار سے تر و تازہ کرنا)

علماء کو وصیت

اور اگر عقل سے کام لو تو صاف طور سے معلوم ہو جائے کہ علماء سے جو یہ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے یہ سراسر غلطی ہے اور علماء کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ شفقت کر کے جواب کی مصیبت میں نہ پڑیں اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی جج کے یہاں آپ کا کوئی مقدمہ ہو اور وہ کسی قانون کی رو سے اس مقدمہ کو خارج کر دے تو کیا آپ اس کے بنگلے پر پہنچ کر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس قانون کے تقرر میں کیا حکمت ہے اور اگر آپ دریافت کریں تو کیا جج کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کو اس قانون کی حکمت بتلائے اور سمجھا دے کہ یہ وجہ ہے اگر کہئے کہ ضروری ہے تو میں آپ کو قوانین کے متعلق چند سوالات دیتا ہوں ذرا مہربانی فرما کر ان کی حکمت جج صاحب سے لکھوا لائیے اور اگر کہئے کہ اس کے ذمہ ضروری نہیں کیونکہ وہ عالم قانون ہے واضع قانون نہیں اور حکمت بتلانا واضع قانون کا منصب ہے تو میں کہتا ہوں کہ علماء بھی تو عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں پھر ان سے کیوں قوانین شرعیہ کی حکمتیں دریافت کی جاتی ہیں اور ان کا انکار زبردستی کا جواب کیوں سمجھا جاتا ہے اور اگر ان کا انکار زبردستی کا جواب ہے تو کیا وجہ ہے؟ جج صاحب کا انکار زبردستی کا جواب نہیں سمجھا جاتا' ایک جج کے جواب کی وقعت کے برابر علمائے اُمت کے جوابوں کی قدر نہیں۔

بانی اسلام صرف خدا ہے

اور علماء تو کیا واضع قانون ہوتے خود ہمارے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی واضع وبانی قانون نہیں ہیں صرف عالم وحاکم بالقانون ہیں اور یہیں سے مسلمانوں کی ایک اور غلطی بتلاتا ہوں کہ اکثر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بانی اسلام کے لقب سے ملقب کرتے ہیں حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ یہ لقب عیسائیوں نے تجویز کیا تھا کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے احکام کو آپ کا تجویز کردہ کہتے ہیں مگر مسلمانوں نے محض تقلیداً یہ لفظ اختیار کرلیا۔ صاحبو! یاد رکھو بانی اسلام صرف خدا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حالت ہے کہ:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

شان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا فرماتے ہیں کہ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ان کا کہا ہوا خدا کا کہا ہوا ہے اگرچہ عبداللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے زبان مبارک سے نکلے)

تو آپ کا ارشاد خدا کا ارشاد ہے: ”وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی“ (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے وہ تو وحی من جانب اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجی گئی) اور اس سے اجتہاد کی نفی نہیں ہوتی آپ اجتہاد فرماتے تھے مگر وہ بھی جب کہ وحی اس کی تائید کرتی یا وحی اس پر سکوت کرتی حکم میں وحی کا ہو جاتا تھا کہ اس کا منکر بھی ویسا ہی کافر تھا جیسے وحی صریح کا منکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں بانسری ہو اور وہ اس کو بجا رہا ہو تو ظاہر میں جو کچھ آواز نکلتی ہے بانسری سے نکلتی ہے ناواقف یہی سمجھتا ہے کہ یہ بانسری بول رہی ہے لیکن جو جاننے والا ہے وہ جانتا ہے کہ بانسری کے ایک دوسرا منہ بھی ہے جو بجانے والے کے منہ سے ملا ہے یہ بجانے والے کی آواز ہے جو کہ اس منہ سے ہو کر بانسری میں آ رہی ہے اور بانسری سے ظاہر ہو رہی ہے اسی شان کو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

دو دہاں داریم گویا ہچو نے　　یک دہاں پنہانست درلبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　ہائے وہوئے درافگندہ درسما

اور لیجیے شجرہ وادی ایمن نے انی انا اللہ کہا تھا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ آواز شجرہ کی تھی ہرگز نہیں بولنے والا کوئی دوسرا ہی تھا شجرہ محض مظہر تھا تو جب شجرہ سے کلام خداوندی نے ظہور کیا تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے کلام خداوندی کا ظہور ہو تو کیا تعجب ہے اور جب یہ بات ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بانی اسلام کہاں سے ہوئے مگر ہمارا مذاق کچھ ایسا بگڑا ہے کہ ہم نے اپنے گھر کی سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے اور غیر قوموں کی ہر چیز کو اختیار کر لیا۔ اگرچہ وہ ہم کو اور ہمارے مذہب کو مضر ہی ہو۔ چنانچہ بانی اسلام کا لقب عیسائیوں نے اپنے انکار کی وجہ سے دیا تو ہم نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ علیٰ ھذا معاشرت کہ اس کا ہر ہر پہلو ہم نے غیروں سے لے رکھا ہے وہی بات جو کل علماء کہتے تھے اور اس کو خاطر میں نہ لایا جاتا تھا اگر دوسری قومیں کرنے لگیں اس کی ضرورت ان کو بھی محسوس ہونے لگی۔

حضرات علماء کا نان ونفقہ

چنانچہ علماء نے مدت تک نہایت شدومد کے ساتھ کہا کہ علماء کی ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے کہ وہ صرف خدمت دین کا کام کریں' دوسرا کوئی کام ان کے سپرد نہ ہو تو علماء پر اعتراض کیا جاتا تھا اور سوال کیا جاتا تھا آخر یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے حالانکہ یہ اعتراض واقع میں اپنے اوپر تھا نہ کہ علماء پر۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد　　ہچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اے بھولے مرد اس شیر کی طرح جو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے)

اس کو آپ ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص نے نکاح کیا اور نکاح کرنے کے بعد بیوی کے پاس جا کر کہنے لگا کہ تم نے نکاح تو کیا لیکن یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ وہ بیوی اس کو کیا جواب دے گی' میاں جب میں تمہارے نکاح میں آ گئی تو میری تمام ضروریات کا تکفل خود بخود تمہارے ذمہ ہو گیا اب میں تم سے لے کر کھاؤں گی۔ خلاصہ اس جواب کا یہ ہوا کہ میں چونکہ تمہارے کام میں محبوس ہوں اور محبوس کا

نفقہ "من لہ المحبس" پر ہوتا ہے اس لیے میرا نفقہ تم پر ہے تو حضرات مدت تک تو مولوی خاموش رہے مگر اب آپ صاف صاف کہلاتے ہیں تو سنئے کہ مولوی آپ کی خدمات میں محبوس ہیں تو باقاعدہ مذکورہ ان کا نفقہ آپ کے ذمہ ہے اور یہ قاعدہ تمدنی بھی ہے شرعی بھی اول شرعی پہلو کو بیان کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

"للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللّٰہ لایستطیعون ضربا فی الارض یحسبهم الجاهل اغنیآء من التعفف"

(اس میں حق ہے ان فقراء کا جو کہ اللہ کے راستے میں کھڑے ہوئے ہیں' زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جاصل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے)

دیکھو! لام للفقرآء میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالش کر کے لے سکتے ہیں۔ گو دنیا میں نالش نہ ہو سکے لیکن خدا تعالیٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فقراء ذکر فرمایا ہے۔ فقیر آج کل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے مگر یہ ذلت اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نامعقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہی لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لیے فرماتے ہیں: "یایها الناس انتم الفقرآء الی اللّٰہ" (اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیمانہ میں مست ہیں)

علماء امور دین میں وقف ہیں

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ "لایستطیعون ضربا فی الارض" یہ وہی بات ہے جس کو آپ بروئے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہو جاتے ہیں۔ صاحبو! بیشک اپاہج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں

اس مسئلے کو میں ایک مثال دے کر زیادہ واضح کرتا ہوں ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جوکہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبع کرلیا' شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانہ آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبع بند کردو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے اب تو غالباً تسکین ہوگئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں کہ

حقیقت تنخواہ

بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ واقع میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے چن چن کر جمع کیا جاتا ہے۔ کسی عورت نے پوچھا تھا عورت سے فوج کس کو کہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں بس یہی فوج ہے تو آپ کا پیسہ ان کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے۔ اس کو سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قومی کاموں میں مصروف ہے کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتی اس لیے قوم کے مجموعہ مال میں سے اس کو نفقہ دیا جاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہوگیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہنچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہا ہے۔ اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں دست سلطان کی آڑ میں آگیا ہے اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی کو علماء مدت تک کہتے رہے مگر چونکہ دوسری قوموں نے اس کو شروع نہ کیا تھا جیسے عیسائیوں کا مشن کہ ان کا خلاصہ یہی ہے تو ہمارے مسلمانوں کو خبر نہ تھی اور سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کی کیا حقیقت ہے۔ اب جبکہ ایک دوسری ہمسایہ قوم اٹھی اور اس نے جابجا گروکل قائم کیے اور ایک جماعت کی جماعت کو اپنے مذہب کی خدمت کے لیے وقف کردیا تو اب بعض بعض

مسلمانوں کو جنبش ہوئی کہ جب ہندوؤں نے اس کام کو کیا تو یہ کام بیشک ضروری ہے۔ افسوس ہے تعلیم قرآن محرک نہ ہوئی' تعلیم حدیث سے جنبش نہ ہوئی' اقوال علماء سے ہوش نہ آیا' حرکت ہوئی تو برادران وطن کی مثال دیکھ کر۔

خوف میں اعتدال

بات بھی دور پہنچ گئی' میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب صاحب جج کے اس جواب سے کہ ہم عالم قانون ہیں ہم سے حکمت کا سوال نہیں ہوسکتا' تسلی ہوجاتی تو کیا وجہ کہ اقوال علماء سے تسلی نہیں ہوتی اور ان کو زبردستی کا جواب کہا جاتا ہے اور ان کو عاجز سمجھا جاتا ہے کیا ایسے منہ سے نکلی ہوئی بات کہ وہ لا الہ الا اللہ سے بھی آشنا نہ ہو باوقعت سمجھی جائے اور وارثان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو عجز پر محمول کرنا فساد مذاق نہیں ہے۔ اب علماء کو بھی چاہیے کہ وہ ضابطہ پر رہیں اور کہہ دیں کہ خدا سے پوچھو وہی واضع قانون ہیں۔ بس سنار کی کھٹ کھٹ سے یہ لوہار کی ایک بہت اچھی ہے۔ غرض یہ معلوم ہوگیا کہ گو قانون کی حکمت نہ بتلائی جائے مگر کوئی قانون ایسا نہیں کہ وہ پر حکمت نہ ہو اسی لیے میں یہ نظیریں بتلاتا ہوں کہ جہاں حکمت معلوم نہ ہو وہاں یہ نہ سمجھو کہ حکمت نہیں ہے سو وہ نظیر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا وبین معاصیک" (میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ سے ڈرتے رہنے کا اس چیز سے جو حائل بنے ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان) صاحبو! غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خوف مانگتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قید لگادی ہے کہ خوف اس قدر ہو کہ گناہ نہ ہونے دے اس میں حکمت یہ ہے کہ خوف جب حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو موجب تعطل ہوجاتا ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ دیکھئے ہم لوگ پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں مگر سمجھتے وہی لوگ جن کی شان یہ ہے کہ:

بینی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و استا

(اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم دیکھتا ہے)

کہ ان کے اندر وراثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم انبیاء بھرے ہیں۔ چنانچہ الحمدللہ میں بھی انہی کی تقلید کر کے کہتا ہوں کہ شدت خوف سے امور معاش اور امور دین

سب معطل ہوجاتے ہیں اس میں راز یہ ہے کہ جب کوئی چیز حد اعتدال سے بڑھتی ہے تو اول اس کا اثر مباحات پر ہوتا ہے کہ ان کو ترک کراتی ہے پھر جب اور غلبہ ہوتا ہے تو واجبات تک نوبت آتی ہے پھر جب بالکل ہی انتہا ہوجاتی ہے تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ میں اس قدر گنہگار ایسا شریر ہوں تو میری مغفرت کس طرح ہوسکتی ہے؟ اور جب مغفرت نہیں ہوسکتی تو کیوں بلا وجہ مصیبت بھروں۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ کہتے تھے کہ دوزخ تو میرے لیے ضرور ہی لکھی ہے پھر نفس کے حظوظ میں کیوں کسر رکھوں۔ چنانچہ انہوں نے اس قدر ظلم کیے کہ کچھ انتہا ہی نہیں چھوڑی۔ پس جب اس مقام کا خاصہ تعطل ہے اور وہ غیر محدود ہے تو اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے خدا مجھے اتنا خوف دے کہ وہ گناہوں سے بچائے۔

اخلاق حسنہ کی حد

صاحبو! کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ کسی نے اخلاق حسنہ کی حد بتلائی ہو اور فرماتے ہیں کہ مجھے شوق دے لیکن "من غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة" (بغیر کسی نقصان پہنچانے والے کے نقصان کے اور نہ کسی گمراہ کرنے والے فتنے سے) کہ وہ شوق اتنا نہ ہو کہ میرے جسم کو ضرر دے یا میرے لیے موجب فتنہ ہوجائے کیونکہ شوق کا خاصہ یہ ہے کہ اول جب اس کی شدت ہوتی ہے تو اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے کہ سوزش قلب پیدا ہوتی ہے اور اس سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور قوی مختل ہونے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ضروری عبادات ترک ہونے لگتی ہیں۔ دوسرا ضرر اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب شوق بہت بڑھتا ہے تو اس سے ناز کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور ہیبت خداوندی کم ہوجاتی ہے اور گستاخانہ کلمات زبان سے نکلنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ناز کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کے لیے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تم یہ رکھتے ہو تو بدخوئی کے پاس نہ پھٹکو)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا علاج کیا کہ نہ مجھے اس سے ضرر ظاہری ہو اور نہ ضرر باطنی۔

حد شکن لوگ

جب معلوم ہوا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے تو شفقت کی بھی ایک حد ہونی چاہیے آج کل حد شکن دو قسم کے لوگ ہیں ایک اہل دنیا کہ وہ بھی حد شکنی کرتے ہیں اور دوسرے اہل دین کہ وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اہل دنیا کی حد شکنی تو یہ ہے کہ وہ قوم پر ایسی شفقت کرتے ہیں کہ اس میں دین کا بھی ضرر ہو جاتا ہے بلکہ اکثروں کا تو نصف محض قوم ہوگئی ہے وہ اگر ہمدردی بھی کرتے ہیں تو اس لیے کہ یہ ہماری قوم ہے اس سے ہمدردی کرنا ضروری ہے اور مذہب پر بھی قائم ہیں تو محض اس لیے کہ دنیا کی اقوام ترقی کر رہی ہیں تو ہم کو بھی ترقی کرنی چاہیے اور ترقی بدوں اتفاق کے ممکن نہیں اور اتفاق بدوں اتحاد مذہب کے ہو نہیں سکتا تو ہم کو مجبوراً ایک مذہب پر رہنا چاہیے بلکہ دوسروں کو اگر تبلیغ اسلام کرتے ہیں تو وہ بھی اس لیے کہ اگر یہ ہمارے مذہب میں آ جائیں گے تو گویا ان کے نزدیک اسلام مطلوب لغیرہ ہے فی نفسہ وہ کوئی قابل طلب چیز نہیں اگر اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ترقی کا ممکن الحصول ہو تو ان کے نزدیک مذہب کوئی قابل وقعت چیز ہے تو کیا وجہ کہ اس کے ایک جز کو تو لیا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دیا گیا' مطلوب کا ہر جز مطلوب نہیں ہوتا؟ جب ہوتا ہے تو کیا وجہ کہ حرمت سود کو چھوڑا' نماز کو چھوڑا' صرف ایک اتفاق اور ہمدردی کو لے لیا' اکثر دیکھا گیا ہے کہ قومی چندوں میں ایک ایک روپیہ کو نیلام کیا جاتا ہے اور وہ چار سو پانچ سو کا فروخت ہوتا ہے حالانکہ یہ کھلا ہوا سود ہے صرف ایک قوم کا لفظ یاد کر لیا ہے۔ بس صاحبو! غور تو کرو قوم کی خدمت جو محمود ہے آخر کس لیے اس لیے کہ خدا کا حکم ہے کہ قوم کی خدمت کرو تو جب خدا کو ناراض کر کے تم نے قوم کی خدمت کی تو وہ خدمت محمود کہاں رہی جب خدا ہی سے سلسلہ توڑ دیا تو قوم سے جوڑ کر کیا فلاح ہوگی۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(ہزاروں رشتہ دار جو خدا سے بیگانہ ہیں اس ایک شخص پر قربان جو اللہ تعالیٰ سے آشنا ہو)

جب خدا سے بیگانگی ہوگئی تو کس کی قوم صاحبو! حضرت نوح علیہ السلام سے زیادہ تو خیر خواہ قوم نہیں بن سکتے پھر دیکھ لیجیے انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ جو خدا کی نافرمان تھی کیا

کیا پھر مرض پر مرض یہ ہے کہ ان کی فلاح کی صورتیں جو سوچی جاتی ہیں ان کے مدار کے متعلق آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے کیا ان عوام کالانعام کی اگر ان ہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا' ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی' کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا اسی لیے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی آج کل علماء پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی' یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔

اتفاق کی دو صورتیں

صاحبو! علماء کب اتفاق سے روکتے ہیں لیکن اتفاق کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ علماء اپنے مرکز سے ہٹیں اور آپ کے مرکز پر آجائیں۔ سو یہ اتفاق تو یقیناً محمود نہیں ہاں دوسری صورت اتفاق کی کہ علماء اپنے مرکز پر رہیں اور قوم اپنی وہمی ترقیوں اور مضر خیالوں کو چھوڑ کر ان کے مرکز پر آجائیں' بیشک محمود ہے اور اس طرح اتفاق ہونا چاہیے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قوم کو جو متفق بنایا جائے گا تو اس اتفاق کے لیے آخر کوئی معیار بھی ہوگا یا نہیں کہ قوم کو اس معیار کی طرف بلایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ضرور ہوگا اب میں پوچھتا ہوں کہ وہ معیار کیا ہے سو سب جانتے ہیں کہ وہ معیار حق ہے یعنی حق کی طرف قوم کو بلایا جائے گا کہ یہی ایک مامون اور صاف و ہموار شاہراہ ہے جس میں نشیب و فراز کا نام نہیں اس معیار سے الگ جتنا اتفاق پکارتے ہو اسی قدر نفاق بڑھتا ہے اور جب معیار متعین ہو گیا تو دیکھو کہ کون اس معیار پر چل رہا ہے اور کون اس سے علیحدہ ہے جو شخص صحیح معیار پر ہو اس کو مت کہو کہ تو اتفاق کر بلکہ جو اس معیار سے ہٹ گیا ہے اس کو معیار پر لانے کی کوشش کرو اور اس کو اتفاق رائے دو' دیکھو اگر ایک قوم ٹھکانے پر بیٹھی ہو اور ایک دوسری قوم بھٹکتی پھرتی ہو تو کیا تم پہلی جماعت کو مجبور کرو گے کہ ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو کر اس بھٹکی ہوئی جماعت کے ساتھ ہولے یا اس بھٹکی ہوئی جماعت کو ٹھکانے پر لانے کی کوشش کرو گے پس مولویوں کو اتفاق کی ترغیب دینا

اوران پرنا اتفاقی کا الزام لگانا عجیب بات ہے۔صاحبو! اتفاق تم پیدا کرو کہ جس صحیح مرکز پر وہ ہیں تم بھی اس پر آجاؤ بس اتفاق کی حقیقت یہ ہے۔

زبانی اتفاق

اور جس کو آپ حضرات اتفاق کہہ رہے ہیں وہ محض لفظ ہی ہے معنی نہیں۔جیسا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میم واؤ و میم نون تشریف نیست　　　لفظ مؤمن جز پئے تعریف نیست

یہ الفاظ تو صرف پہچان ظاہری کے لیے ہیں ورنہ ان میں کیا رکھا ہے نرے الفاظ کا تو وہی حال ہے کہ جیسے ایک بنئے کا کارکن بیٹھا کھاتے میں حساب جوڑ رہا تھا کہ پندرہ کا پانچ ہاتھ لگا ایک اور ۲۵ کا پانچ اور ہاتھ لگے دو وغیرہ وغیرہ۔ایک فقیر بھی وہاں بیٹھا تھا اوران سب حاصلوں کو ساتھ ساتھ جوڑتا جاتا تھا شام تک سینکڑوں تک نوبت پہنچ گئی اٹھتے وقت سوال کیا اس نے ناداری کا عذر کیا' سائل نے کہا کہ جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ابھی تو میرے سامنے تو نے سینکڑوں کے حاصل ہونے کا اقرار کیا اس نے کہا بھائی وہ صرف کاغذ میں حاصل ہوئے ہیں واقع میں حاصل نہیں ہوئے' جب الفاظ خلاف معنے ہوں تو وہی مثال ہے کہ:

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　واندروں قہر خدائے عزوجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　وزدر ونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کافر کی قبر زیورات سے لدی ہوئی ہے اوراندر خدائے تعالیٰ کا غضب بھرا ہوا ہے' باہر تو یزید کو برا بھلا کہتا ہے اور تیرا باطن یزید کو رسوا کرنے والا ہے)

تو جہاں نرے الفاظ ہوں وہاں محض ہاتھ لگنے سے کیا جمع ہوتی ہے تو یہی آج کل کے اتفاق کے معنے رہ گئے ہیں تو ایک شفقت تو یہ ہے کہ غل شور مچا کر دنیا کا بھلا کر لو چاہے دین رہے یا برباد ہو بلکہ اگر مولوی کچھ کہتے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ یہ مذہبی لوگ ہیں یوں ہی کہا کرتے ہیں ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں مذہب کی کچھ وقعت نہیں۔مجھے ایک واقعہ یاد آیا اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں مذہب کی وقعت کس قدر ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حال

میرے ایک دوست لکھتے ہیں کہ آج یہاں چند عقلاء جمع ہوئے اور اس میں گفتگو ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصلی سبب کیا ہے۔ بہت سی گفتگو کے بعد اخیر فیصلہ یہ ہوا کہ اصلی سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہ چھوڑا جائے گا اس وقت تک ترقی ناممکن ہے لیکن مجبوری ہے کہ مذہبی ضرورت روکتی ہے۔ صاحبو! کیا تجویز کے بعد بھی یہ لوگ مسلمان رہے افسوس اسلام کو خار راہ بتایا جائے اور طرہ یہ کہ پھر بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ صاحبو! کیا یہ لوگ اسلامی خیر خواہ ہیں ہاں اسلام بمعنے قوم اگر ہو تو ضرور اسلامی خیر خواہ ہیں اور اسی کو آج کل شفقت سمجھا جاتا ہے مگر یہ شفقت کا ہیضہ ہے کہ ایک بچے کو اس کی ضد پر برابر کھلاتے ہی چلے جاؤ آخر نتیجہ کیا ہوگا یہی کہ اس کا پیٹ پھٹ جائے گا اور مر جائے گا۔ پس یہ خیر خواہی اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی مگر خود اسلام ہی کی ان کے قلب میں کچھ وقعت نہیں۔ ایک قصہ اور یاد آیا کہ دیوبند میں ایک مسلمان جن پر اس نئی تہذیب کا اثر پڑا تھا کہنے لگے کہ قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک ناصح نے ان سے کہا کہ میاں قیامت کے قائل ہونے میں کیا حرج ہے اگر بالفرض تمہارے خیال کے مطابق قیامت نہ ہوئی اور تم اس کے وجود کے معتقد رہے تو تمہارے اس غلط عقیدے کا تم پر کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ باز پرس ہی کرنے والا نہیں اور اگر ہمارے خیال کے مطابق قیامت ہوئی اور تم اس کے منکر ہوئے تو یاد رکھنا بہت جوتیاں لگیں گی۔ یہ جواب اصل میں حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے جو انہوں نے کسی دہری کو دیا تھا اس کو کسی نے نظم میں کیا ہے:

قال المنجم والطبیب کلاھما لاتحشرا لا جساد قلت الیکما

ان صح قولکما فلست بخسارۃٍ او صح قولی فالخسار علیکما

(نجومی اور طبیب دونوں نے کہا کہ اجسام کو جمع نہ کیا جائے گا (مراد قیامت) میں نے کہا یہ بات تمہاری ہی طرف، اگر تمہارا قول صحیح ہے تو میرا کون نقصان اگر میرا قول صحیح ہو گیا تو تمہارا ہی گھاٹا (نقصان) ہے۔

تو ان روشن خیال صاحب نے یہ کہا کہ یہ تو اس کے سامنے کہیے کہ جس کو کچھ احتمال ہو مجھے تو یقین ہے کہ قیامت کوئی چیز نہیں (نعوذ باللہ من شرور انفسنا) حضرات ایسے بہت سے لوگ اس وقت ہم مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کی بدولت پیدا ہو گئے۔ گو وہ زبان سے صاف انکار نہیں

کرتے مگر دل میں محض انکار ہے۔ میرٹھ میں ایک عہدیدار مسلمان کے پاس عید کے دن بہت سے مسلمان ملنے گئے تو وہ عہدیدار صاحب ان لوگوں سے کہتے ہیں آج آپ لوگوں کی عید ہے افسوس ان کو اسلامی عید کا اپنی طرف منسوب ہونا بھی ناگوار ہوا اور لیجئے ایک مسلمان کلکٹر ہو گئے تھے ان کو اسلام سے اس قدر وحشت ہوئی کہ اپنے اصلی نام کو بھی باقی نہ رکھا اس کو کاٹ چھانٹ کر کے انگریزی ناموں کے طرز پر بنایا اور لطف یہ ہے کہ پھر اپنے کو مسلمان بھی کہتے تھے۔

اسلام کا مفہوم

صاحبو! یہ ترقی اسلام کی ترقی تو ہرگز نہیں' اسلام ایسی ترقیوں سے غنی اور بیزار ہے بلکہ سچ پوچھو تو اسلام کی ترقی تو تمہارے صوفی وضع بننے سے بھی نہیں ہوتی۔ جب تک ایمان دل میں پیوست نہ ہو جائے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں "شهادة ان لا الٰه الا اللّٰه وان محمداً رسول اللّٰه" (گواہی دینا اس بات کی کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں) اور شہادت میں بشہادت آیت "اذا جاءک المنفقون الخ" (جبکہ آتے ہیں آپ کے پاس منافقین) توافق قلب ولسان ضروری ہے تو ترقی شہادتین کی یہ ہوئی کہ وہ دل میں رچ جائے اور یہ حال ہو جائے۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مردے کاملے پامال شو

(قیل قال (اعتراض وجواب) کو چھوڑ صاحب حال بزرگ بن جا اور بزرگ کامل کے سامنے پامال (اپنے کو عاجز کر دے) ہو جا)

دوسرے حکیم کہتے ہیں:

علم رسمی سربسر قیل است و قال   نے از و کیفیتے حاصل نہ حال

(رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت   زنگ گمراہی زدل بز دایدت

(علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھلائے اور تیرے دل سے گمراہی کے زنگ کو دور کر دے)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند   خوف وخشیت دردلت افزوں کند

(یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف و عاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کردے)

تو ندانی جز یجوز لایجوز　　　　خود نہ دانی تو کہ حوری یا عجوز

(تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت)

ایها القوم الذی فی المدرسه　　　　کل ماحصلتموه وسوسه

(اے وہ لوگو جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ محض وسوسہ ہے)

علم نبود غیر علم عاشقی　　　　ماقبی تلبیس ابلیس شقی

(سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کارآمد نہیں باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے)

یہ ہے وہ علم جو قلب کے اندر پہنچ جائے پس ترقی اسلام کی یہ ہے نہ کہ مال و دولت کی ترقی بلکہ اگر ساری دنیا کے مسلمان نادار ہوجائیں اور لنگے زیر لنگے بالا کی حالت ہوجائے تب بھی اسلام کی ترقی باقی ہے کیونکہ اسلام فٹن اور چوکڑی کا نام نہیں تو یہ جتنی ترقی ہورہی ہے اسلام کی ترقی نہیں ہے البتہ اہل اللہ کا اسلام اب بھی ترقی پر ہے۔ گو ان کے پاس ظاہری سامان نہ ہو اس بے سروسامانی میں بھی ان کی یہ حالت ہے:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(شراب خانے کا مجاور ہوں لیکن مستی کے وقت دیکھ کہ فلک پر ناز کرتا ہوں اور سیاروں پر حکومت کرتا ہوں)

اور کہتے ہیں کہ:

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم　　　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(عشق حقیقی کے پر چلے کو خیریت جانو کیوں کہ یہ قوم بادشاہ ہیں بغیر کسی سہارا کے ہوں اور بغیر تاج کے بادشاہ ہیں)

حضرات صحابہؓ کا حال

آخر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کیا بات تھی حالانکہ وہ حضرات ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بلکہ کنکریوں پر بیٹھے ہوئے سلطنت فارس و روم کا فیصلہ فرماتے تھے مگر کوئی مال و

دولت ان کے پاس نہ تھی اور نہ اس کی ہوس تھی اسی لیے ان حضرات کو ثروت کے ملنے سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جب انتقال ہونے لگا تو آپ روتے تھے لوگوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا افسوس ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں پلہ داری کرتے تھے اور آج اس قدر مال و دولت جمع ہے کہ بجز مٹی میں دفن کرنے کے اور کہیں رکھنے کی جگہ نہیں۔ حضرات! اگر وہ اصلی ترقی آپ کو نصیب ہو جائے تو واللہ اس ظاہری نمود کو آپ ہیچ در ہیچ سمجھنے لگیں۔ آپ کو معلوم ہوا کہ ان حضرات کے دل میں دنیا کی کیا قدر تھی آپ کی ساری عمر دنیا پرستی میں گزری ہے اس لیے آپ کو کچھ خبر نہیں۔

تو نہ دیدی کہے سلیمان را   چہ شناسی زبان مرغاں را

(تو نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں دیکھا' تو پرندوں کی بولی کو کیسے پہچانے گا)

سلطنت کی قیمت

ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے پوچھا کہ اگر اتفاقاً تم شکار میں نکل جاؤ اور تن تنہا رہ جاؤ اور اس وقت تم کو شدت سے پیاس لگے کہ تمہارا دم نکلنے لگے اس وقت اگر کوئی شخص تمہارے پاس ایک پیالہ پانی لائے اور نصف سلطنت اس کی قیمت بتلائے تو تم اس کو خرید لو گے کہ نہیں اس نے کہا میں ضرور خرید لوں گا' پھر ان بزرگ نے کہا کہ اور اگر اتفاق سے تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور کسی طرح ادرار نہ ہو اور ایک شخص اس شرط پر کہ بقیہ نصف سلطنت اس کو دیدو پیشاب اتار دینے کا وعدہ کرے تو تم کیا کرو گے۔ اس نے کہا کہ میں بقیہ نصف بھی اس کو دیدوں گا تو ان بزرگ نے کہا کہ آپ کی سلطنت کی یہ قیمت ہے ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ پیشاب جس کے لیے آپ اس قدر منہمک ہیں تو ان حضرات کو دنیا کا یہ نرخ معلوم ہے اسی لیے صحابہؓ نے توسیع سلطنت پر بھی دنیا کا کام نہیں کیا وہ کام کیا جس کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے: "الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونهوا عن المنکر" (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت دیدیں تو نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کام کرنے کا حکم دیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے اور نیک کام کریں)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ وقت تھے مگر کھانا کپڑا جو تھا معمولی سے بھی کم تھا کیونکہ وہ حضرات جانتے تھے کہ اصل چیز دوسری ہے ہمارے بعضے بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے لڑتے ہیں کہ شیخین نے خلافت لے لی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دی' میں کہتا ہوں کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے دعا کیجیے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت وتعب دین کے لیے اور قلت دنیا کے لیے معلوم ہو چکی تو ان کو کس قدر مزید کلفت ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی۔ ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رنجی ہوئی اول تو بہت واقعے غلط مشہور ہیں دوسرے جب اتحاد ودوستی ہوتی ہے تو شکر رنجی بھی ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا کہ تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے کہ نہیں انہوں نے عرض کیا کہ حضور کبھی کبھی ہو جاتی ہے مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے' فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائیدار ہے۔ ذوق کہتا ہے:

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے ۔۔۔ بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی عجیب شان

ایک عربی حکیم لکھتا ہے: "ویبقی الود مابقي العتاب" (اور باقی رہے گی محبت جب تک عتاب باقی رہے گا) اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے اور اگر عتاب نہ کیا جائے اور بات کو دل میں رکھا جائے تو تمام عمر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محبّ اور محبوب تھیں وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہارے خوشی اور ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی ہو تو قسم میں "لاورب ابراهیم" (نہیں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم) کہتی ہو اور جب خوش ہوتی ہو تو "لاورب محمد" (نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی قسم) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض

کرتی ہیں: "وھل اھجر الااسمک" (نہیں چھوڑتی ہیں لیکن آپ کے نام کو) کہ حضور اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک کا دوسرے پر ناز ہے ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

حضرات صحابہؓ کی عجیب شان

کانپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا انہوں نے وہی تذکرہ چھیڑا اور حدیث پڑھی۔ "من سب اصحابی فقد سبنی ومن سبنی فقد سب اللّٰہ"[1] (جس نے صحابہ کو گالی دی پس تحقیق کہ اس نے مجھ کو گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی پس تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی) اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہہ دیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا' اس حدیث کے یہ معنیٰ نہیں جو آپ نے سمجھے بلکہ اس کے معنے دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لیے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلایئے کہ یہ وعید کس شخص کے لیے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لیے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی یہی کیا جائے گا یا غیروں اور اجانب کے لیے ہے۔ ظاہر ہے کہ اجانب کے لیے یہ وعید ہے پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لیے یہ حکم ہے اس کو سن کر وہ کہنے لگے کہ یہ ذہانت کی باتیں ہیں میں نے کہا کہ صاحب پھر کیا غباوت کی باتیں کہوں اس پر وہ شرمندہ سے ہو گئے تو مجھے بہت حجاب ہوا۔ اسی لیے میں نے اپنا یہ معمول کر لیا ہے کہ اگر کوئی بڑا آدمی مجھے بلاتا ہے تو اول یہ شرط کر لیتا ہوں کہ خلوت میں گفتگو کروں گا کیونکہ جلوت میں گفتگو کرنے سے اکثر مخاطب لاجواب ہو کر شرمندہ ہو جاتا ہے اور میں اس کو باوجاہت

---

[1] (الکامل لابن عدی ۴: ۱۵۲۶)

لوگوں کے لیے پسند نہیں کرتا۔ آخر میں ان کی شرم یوں اتاری کہ میں نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے آپ عامل ہیں مجھ کو نیند کم آتی ہے اگر آپ پانی پڑھ کر بھیج دیا کریں تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ وہ اس سے خوش ہوئے اور تشتری لکھ دینے کا وعدہ کیا۔ غرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف داری کر کے دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو برا نہ کہنا چاہیے اور صاحبو! اس وقت کی سلطنت ہی کیا تھی جس پر کوئی لالچ کرتا اس وقت کی سلطنت یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوپہر کے وقت گرمی میں چلے جارہے تھے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا پوچھا کہ امیر المومنین کہاں چلے آپ نے فرمایا کہ بیت المال کا ایک اونٹ غائب ہوگیا ہے اس کی تلاش کو جارہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضرت آپ نے اس گرمی میں کیوں تکلیف کی کسی کو حکم دیا ہوتا کہ وہ تلاش کر لیتا آپ نے فرمایا کہ اے عثمانؓ میدان قیامت کی گرمی اس گرمی سے اشد ہے۔

غرض کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ترقی پر نہ تھے۔ یہ حضرات اس ترقی پر تھے کہ ساری دنیا جانتی ہے بلکہ مانتی ہے حالانکہ نہ ان کے پاس فٹن تھی نہ سامان آرائش اور فٹن تو کیا ہوتی واقعہ یرموک میں جو کہ ایک عظیم الشان جنگ تھی جب ایک شخص اونٹنی پر سوار فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو کہ روزانہ انتظار خبر میں باہر جا کر گھنٹوں کھڑے رہتے تھے' جنگل میں ملاقات ہوئی آپ نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں سے آیا ہے معلوم ہوا یرموک سے آپ نے جنگ کا حال پوچھا وہ چونکہ پہچانتا نہ تھا اس لیے کہ کوئی نشان خلافت نہ تھا کوئی تاج نہ تھا' اس نے ان کی طرف التفات نہیں کیا اور اونٹنی دوڑائے ہوئے چلا جاتا تھا اور یہ اونٹنی کے ساتھ دوڑتے جاتے تھے۔ جب آبادی کی طرف قریب آئے تو لوگوں نے پہچانا اور امیر المومنین کو سلام کیا اس وقت اس کو معلوم ہوا تو اس نے بہت معذرت کی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے ثواب کے لیے اٹھایا ہے تجھے عذر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حالت تھی۔ ایک ہماری حالت ہے کہ جو قدم اٹھتا ہے خود بینی اور خودداری کیلئے۔

غیر قوموں کی تقلید

ایک صاحب معزز مجھ سے فرمانے لگے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا لڑکا ایسا ہو جائے کہ پندرہ روپے میں گزر کرلیا کرے اور حالت لڑکے کی یہ تھی کہ پندرہ سے زیادہ کا اس کا ایک کوٹ ہی تھا۔ افسوس ہے کہ ہم کو دوسری قوموں کی تقلید نے برباد کیا ہم تقلید کرتے ہیں اور وہ بھی بری باتوں کی۔ انہوں نے ہماری تقلید کرکے اپنا گھر آباد کرلیا اور ہم ان کی تقلید کرکے اپنی رہی سہی حالت بھی برباد کیے دیتے ہیں۔ دعویٰ ہے قومی ہمدردی کا اور اجنبیت یہ ہے کہ شہر میں رہنا بھی گوارا نہیں' الگ جنگل میں جا کر رہتے ہیں۔ صاحبو! کیا ترقی اس پر موقوف ہے کہ قوم کا قرب بھی چھوڑ دیا جائے۔ دیکھئے! رئیسہ بھوپال والی سلطنت ہیں آج کل کے ترقی یافتہ لوگوں سے تو بہرصورت بہت زیادہ ترقی پر ہیں مگر معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی غریب رعایا میں سے شادی وغیرہ میں ان کی دعوت کرتا ہے تو قبول کرتی ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ہمارے روشن خیال سب سے زیادہ دعوت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ مجھے ایک لکھنؤ کی حکایت یاد آئی۔ ایک مولوی صاحب کی دعوت ایک سقے نے کی' مولوی صاحب اس کے گھر جا رہے تھے کہ ایک رئیس صاحب ملے پوچھا کہ مولوی صاحب کہاں جا رہے ہو' مولوی صاحب نے بیان کیا کہ اس سقے نے دعوت کی ہے اس کے ہاں جا رہا ہوں تو رئیس صاحب فرمانے لگے کہ مولوی صاحب آپ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی کیا سقوں کی دعوت بھی کھانے لگے۔ مولوی صاحب نے یہ سن کر سقے سے فرمایا کہ بھائی میں تو دعوت میں نہیں جاتا یہ رئیس صاحب اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔ البتہ اس شرط سے چلتا ہوں کہ ان رئیس صاحب کو بھی لے چل۔ چنانچہ اس سقے نے ان کی منت کرنا شروع کی' اب تو رئیس صاحب بہت گھبرائے' اول تو عذر کیا مگر جب اس نے بہت ہی لجاجت کی اور دو چار ہم رتبہ آدمیوں نے بھی جو کہ اتفاقاً جمع ہو گئے تھے ملامت کی کہ ایک غریب آدمی اس قدر لجاجت کرتا ہے اور تم مانتے نہیں عجب سنگدل ہو تو مجبوراً ان رئیس صاحب کو ماننا پڑا۔ آخر اس کے گھر گئے وہاں جا کر دیکھا کہ تمام گھر میں فرش لگا ہوا ہے اور سقے دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں کوئی ہاتھ چومتا ہے کوئی پاؤں پکڑتا ہے' آخر کھانا کھلایا اور خود غلاموں کی طرح کھڑے رہے جب

وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو کہا کہ حضرت واقعی میں غلطی پر تھا آج مجھے معلوم ہوا کہ عزت و حرمت غرباء کے ساتھ رہنے میں ہے میں نے آج تک یہ تعظیم نہیں دیکھی تھی جوان لوگوں نے کی۔ سچ یہ ہے کہ محبت کے لوگ یہی ہیں رؤسا کو جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اپنے نوکروں یا ماتحتوں میں حق یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعظیم صرف ظاہری تعظیم خوف کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے بھیڑیئے کی تعظیم کی جاتی ہے۔

غرض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ معاشرت تھی اور وہی حقیقی ترقی تھی اگر دنیا میں اس کی ترقی ہو تو اسلام کو بیشک ترقی ہے لیکن اگر ساری دنیا کے پاس مال و جاہ ہو جائے تو اسلام کی کچھ بھی ترقی نہیں یہ تو اہل دنیا کی شفقت کے متعلق بیان تھا۔

اہل دین کا شفقت میں غلو

اب ایک شفقت اہل دین کی ہے کہ ان لوگوں کو جوش اٹھتا ہے کہ جس طرح ہو سکے قوم کی اصلاح ہو جائے اس کوشش میں مختلف طرح کی مشکلات ان کو پیش آتی ہیں اور ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جو کچھ مدارس یا انجمنیں قائم کرتے ہیں ان سے مقصود صرف اپنا نفع ہوتا ہے کہ ہم کو خوب روپیہ ملے یا ہمارا خوب نام ہو۔ یہ لوگ تو مصلحین کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں دوسرے وہ لوگ ہیں کہ واقعی وہ اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی سچی تمنا یہ ہے کہ قوم کی حالت درست ہو جائے مگر ان کو شفقت میں غلو ہو گیا ہے اس میں اول تو جسمانی تکلیف ہوتی ہے دوسرے بعض اوقات دین کی بھی خرابی ہو جاتی ہے کہ اس کے اہتمام میں بعض ناجائز طریقوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے بہت پیچھے پڑنے سے عداوت ہو جاتی ہے۔ یاد رکھو "**لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا**" خدا تعالیٰ کے دربار میں وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی مجھے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یاد آتا ہے اگر ان کے پاس کوئی فہرست مسجد کے چندہ وغیرہ کی لے کر آتا اور دستخط کرنے کی درخواست کرتا تو فرماتے کہ یہاں کیوں لوگوں کے پیچھے پڑے ہو مسجد یا مدرسہ بنانا ہی ہے تو کچی دیواریں اٹھا کر بنالو اگر وہ کہتا کہ حضرت کچی دیواریں گر جائیں گی تو فرماتے کہ میاں پکی بھی آخر گریں گی تو جب گر جائیں گی کوئی دوسرا بنا دے گا تم

قیامت تک کا بندوست کرنے کی فکر میں کیوں پڑے۔ بات یہ ہے کہ:

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ — برنتابد کوہ رایک برگ کاہ

چار پارا قدر طاقت بار نہ — بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(تمنا کر لیکن اپنے مرتبہ کے موافق کر اس لیے کہ پہاڑ کو ایک گھاس کا پتہ نہیں اٹھا سکتا' چوپایوں پر ان کی طاقت کے بقدر بوجھ رکھ' کمزوروں پر ان کی ہمت کے بقدر کام رکھ یعنی کام سپرد کر)

تو بوجھ اسی قدر اُٹھاؤ کہ تم سے اُٹھ سکے۔ ترمذی شریف میں حدیث ہے: "لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسه"[1] (کسی مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے) کہ مومن کو چاہیے کہ اپنے کو ذلیل نہ کرے اگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ فرمالیتے تو آج کل کے مدعیان اجتہاد اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ مومن کو پھٹا کپڑا نہ پہننا چاہیے بلکہ خوب بن سنور کر عمدہ پوشاک میں رہنا چاہیے۔ "ومثل ذلک" لیکن صحابہؓ نے پوچھ کر حل کر دیا "قالوا یا رسول اللہ وما یذل نفسه" (انہوں (صحابہؓ) نے کہا اور اپنے نفس کو ذلیل کیا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفسیر میں فرمایا: "ان یتحمل من البلاء لما لایطیقه" (ایسی مصیبت کہ جس کے برداشت کرنے کی وہ اپنے اندر طاقت نہیں رکھتا) اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ تعلیم اسلامی ذلت اختیار کرنے سے مانع ہے مگر آج کل روشن خیالوں نے ذلت کو مولویت کا اثر سمجھ لیا ہے حالانکہ مولویوں سے زیادہ یہی لوگ اس ذلت کو اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے وہاں مثل دیگر قصبات کے یہ رسم ہے کہ شادی میں دلہن کے میانہ پر بکھیر ہوتی ہے اس بکھیر کو بھنگی اٹھاتے ہیں چندروز ہوئے کہ وہاں شادی ہوئی اور اس موقعہ پر ایک دلدادہ تہذیب جدید نے ان بھنگیوں کے ساتھ مل کر بکھیر کے پیسے جمع کیے' مشکل سے شاید تین چار آنے پیسے ان کے ہاتھ لگے' کیوں صاحب جب کالجوں اور یونیورسٹی کے چندے کے واسطے یہاں تک گوارا کرلیا جاتا ہے تو اگر کوئی مولوی اسلامی

---

[1] (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۵۰۳' کنز العمال: ۵۳۰۴)

مدارس کے لیے چندہ جمع کرے تو اس کو بھک منگے کیوں کہا جاتا ہے؟ اور اس پر ذلت کا اطلاق کیوں کیا جاتا ہے۔ آخر جب نماز کا وقت آیا اور وہ نماز پڑھنے کے لیے آئے تو ایک ظریف نے ان کی خبر لی' کہا کہ تم ہماری جماعت سے الگ ہو جاؤ کیونکہ تم نجس ہو' انہوں نے کہا کہ میرے نجس ہونے کی وجہ۔ ان ظریف نے جواب دیا کہ چونکہ تم بھنگیوں کے ساتھ مل کر پیسے لوٹ رہے تھے اور اس وقت تم کو بھی پسینہ آ رہا تھا اور ان کو بھی اور ان کے ناپاک بدن سے تمہارا بدن مس کرتا تھا مگر وہ ایسا باہمت تھا کہ اس کو اس سے کچھ بھی اثر نہ ہوا' پھر جب نیگ لینے کا وقت آیا تو آپ وہاں بھی جا موجود ہوئے آپ کو بھی ملا۔ الحمد للہ کسی مولوی نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی مگر چونکہ ان بیچاروں کی صورت غریبانہ صورت ہے وہ ایسی حرکات نہ کرنے پر بھی بھک منگے ہیں اور ان کی صورت چونکہ معزز ہے یہ بھیک مانگ کر بھی معزز رہے۔ مولویوں کے صدہا وعظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں چندہ کا نام بھی نہیں ہوتا اور ان صاحبوں کا کوئی لیکچر بھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں چندہ کی ترغیب نہ ہو۔ سید اکبر حسین صاحب جج نے خوب تضمین فرمائی۔

درپس ہر لیکچر آخر چندہ ایست   مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(ہر لیکچر کے پیچھے چندہ ہے انجام کا دیکھنے والا آدمی خدا مبارک بندہ ہے)

دوسرے یہ کہ بعضے مولوی اگر چندہ لیتے بھی ہیں تو دباؤ ڈال کر نہیں لیتے کیونکہ دباؤ ڈال کر وہ لے سکتا ہے کہ جس کا کچھ اثر ہو ان بیچاروں کا اثر ہی کیا ہے کہ ان کے دباؤ کا اثر پڑے۔ برخلاف ان حضرات کے کہ دباؤ ڈال کر ظلم کر کے وصول کرتے ہیں۔ غرض میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ تم کو اس حالت تک صرف تمہاری ضرورت سے زیادہ شفقت علی القوم لائی ہے پس تم اسی قدر شفقت کرو کہ جو تم کو تمہارے دین میں مضر نہ ہو بعضے اس لیے ناجائز کوشش کرتے ہیں کہ بدون اس کے کام نہیں چلتا اسی طرح کام بند ہو جائے گا مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کو کیا فکر قیامت میں اگر باز پرس ہو گی کہہ دینا کہ میں نے لوگوں کو ترغیب دی تھی مگر لوگوں نے نہ مانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس جواب کے بعد تم پر کوئی الزام نہ ہو گا۔ ہم نے اپنے وطن میں ایک مدرسہ کر رکھا ہے مگر اس انداز سے کہ نہ کسی سے چندہ مانگا جاتا ہے نہ

کسی کو ترغیب دی جاتی ہے طلبہ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر توکل کر کے رہیں تو رہیں ہم ذمہ داری نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے دیا تو ہم دیدیں گے مگر باوجود اس استغناء کے اچھی خاصی طرح مدرسہ چل رہا ہے بلکہ یہاں تک انتظام کیا کہ طلبہ کی دعوت بھی جس میں کسی کے گھر جانا پڑے قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ دعوت کا کھانا لینا بھیک نہیں ہے مگر چونکہ آج کل طلبہ کی دعوت اکثر لوگ ان کو ذلیل سمجھ کر کرتے ہیں اس لیے ہم ان اس کو بھی قبول نہیں کیا اور میں دینے والوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ طلبہ کو کچھ دیں تو عزت سے دینا چاہیے وہ آپ کے مہمان ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کا کوئی مہمان آ کر مسجد میں ٹھہرے اور کھانے کے وقت گھر جانے سے انکار کرے تو آپ کیا کریں گے؟ آیا اس مہمان سے کہیں گے کہ دروازے پر جا کر کھانا لے آؤ یا مسجد میں جا کر خود اس کو کھانا دیں گے۔ پھر طلباء کے ساتھ یہ کیوں نہیں کیا جاتا اور جب تم نے خود ان کو دروازے پر بلایا تو گویا اپنے مہمانوں کو تم نے خود ذلیل کیا پھر کس منہ سے خود ہی ان کو ذلیل کہتے ہو۔ غرض بحمداللہ مولویوں کی حالت تو ایسی گئی گزری نہیں ہے۔ بہرحال میں دونوں جماعتوں کو کہتا ہوں کہ اپنی یہ حالت چھوڑ دو اور کام کو چھوٹے پیمانے پر شروع کرو تم لوگ یہ کرتے ہو کہ اول ہی سے کام کو بڑے پیمانے پر اٹھاتے ہو اس کے لیے لابدی زیادہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے مجبوراً تم کو ناگوار کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔

کام کرنے کی سہل ترکیب

ایک سہل ترکیب آپ کو بتلاتا ہوں کہ جو کام شروع کرنا ہو اتنا شروع کیجئے جو آپ اپنی ذات سے کر سکیں جب کام شروع ہو جائے گا اور دوسرے دیکھیں گے خود بخود تمہاری مدد کریں گے۔ دیکھئے! اسلام کا کام بھی یوں ہی ترقی پذیر ہوا اگر اسلام کا کام متعارف ضابطے سے ہوتا تو کم سے کم ایک جماعت تو ہوتی حالانکہ وہاں صرف ایک تن تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک دم تھا' خدا تعالیٰ اسلام کی ترقی کو بیان فرماتے ہیں: "کزرع اخرج شطاہ فازرہ الخ" (مانند اس کھیتی کے جس کو اس نے اُگایا ہو پھر اس کو ہلاک کر دیا ہو) تو صاحبو! ترقی اسلام کی ہمیشہ یوں ہی ہوئی ہے۔ خلاصہ اس تقریر کا یہ ہوا کہ شفقت کی بھی ایک حد معین ہے تم بھی اس پر رہو چنانچہ اس آیت میں اس مضمون کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی

کہ شفقت ان لوگوں پر کیجئے کہ جن میں خدا کا خوف ہو اور وہ علماء ہیں۔ فرماتے ہیں: "انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلمٰؤا" (بیشک ڈرتے (خوف) کرتے ہیں اس کے بندوں میں سے علماء) ایک بات تو اس سے یہ ثابت ہوئی۔ دوسری بات اس آیت سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ نہایت عظیم الشان ہے کہ خدا تعالیٰ کو آپ کا غمگین ہونا کسی طرح منظور نہیں، جب کوئی بات ہوتی ہے فوراً تسلی فرمائی جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اور ہی ہے آپ کے اولیاء امت کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے۔ فرماتے ہیں: "لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا و فی الآخرۃ" (بشارت ہے ان لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں) ان کی ہر وقت یہ حالت ہے کہ:

کوئے نومیدی مرو کامید ہاست　　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کے راستہ کی طرف مت جا کہ امید بہت ہیں تاریکی اور اندھیرے کی طرف مت جا کہ بہت سے سورج موجود ہیں)

کبھی ان حضرات کا دل منقبض نہیں ہوتا ہمیشہ شاداں رہتے ہیں اور کیونکر نہ رہیں ان حضرات کے پاس وہ چیز ہے کہ جس کے پاس ہوگی شاداں ہی رہے گا بلکہ ان حضرات کے سرور کی یہ حالت ہے کہ ان کو سلاطین پر رحم آتا ہے اور لوگ تو ان کی ظاہری حالت پر رحم کرتے ہیں کہ ان بے چاروں کو کھانے کو نہیں ملتا، بھوکوں مرے جاتے ہیں اور یہ حضرات اہل دنیا پر رحم کھاتے ہیں کہ ان کو ہیضہ ہو رہا ہے سمیت تمام جسم میں سرایت کر گئی ہے اور ان کو حس تک نہیں اس مرض کو مبارک مرض سمجھ رکھا ہے۔ صاحبو! تم ان فاقہ مستوں اور روزہ داروں پر رحم مت کرو اپنی حالت پر رحم کرو ان کے لیے خوان نعمت تیار ہو رہا ہے ان کو کہا جائے گا "کلوا واشربوا ھنیئاً بما کنتم تعملون" (خوشی خوشی کھاؤ اور پیو اس چیز کی وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے) اسی لیے ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کو ایک قطعہ لکھا ہے جس میں اپنا کھانا اس کا کھانا اپنا پہننا اس کا پہننا سب بیان کر کے آگے فرماتے ہیں:

نیک ہمیں ست کہ مے بگذرد　　　راحت تو محنت دوشین ما

(یہ ہی ہے کہ گزرتی ہے تیری راحت ہماری گزشتہ راحت کی محنت ہے)

یعنی یوں ہی کام چلنے دو۔

باش کہ تا طبل قیامت زنند　　آں تو نیک آید ویا ایں ما

(تو ٹھہر یہاں تک کہ قیامت کا نقارہ بجادیں تیری ملکیت اچھی ثابت ہوتی ہے یا ہماری)

یعنی اس روز معلوم ہوجائے گا کہ کونسی حالت عمدہ تھی۔غرض اہل دنیا کو ان پر رحم آتا ہے مگر رحم کے قابل درحقیقت وہ ہیں۔حاصل یہ کہ اللہ والوں کے غم کے وقت اب بھی تسلی ہوتی ہے تو اس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی گئی ہے چونکہ تمہید میں بہت سا وقت ختم ہوگیا ہے۔

خشیت صرف علم سے ہوتی ہے

اس لیے مقصود کو اب مختصراً بیان کرکے ختم کردیا جاتا ہے اور مقصود کے اختصار کا اس لیے مضائقہ نہیں کہ نتائج اکثر مختصر ہی ہوا کرتے ہیں اور یہی راز ہے: "الدین یسر "[1] کا کہ یہ یسر مختص ہے مقصود کے ساتھ آج کل ہمارے بھائیوں نے غلطی کی ہے کہ ہر جگہ "الدین یسر" لے لیا حالانکہ مصداق اس کا صرف نتیجہ ہے۔ذرائع مراد نہیں مثلاً اگر یوں کہیے کہ "الاکل یسر" تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اکل کے ذرائع مثلاً کھیتی کرنا وغیرہ وغیرہ یہ بھی آسان ہیں بلکہ معنے یہ ہیں کہ کھیتی وغیرہ کا جو نتیجہ ہے یعنی اکل وہ آسان ہے ہمارے بھائیوں نے یہ معنی سمجھ لیے کہ نہ علم کی ضرورت نہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت نہ محنت و مشقت کی ضرورت نہ اعمال وطاعات کی ضرورت کیونکہ "الدین یسر "غرض مقصود مختصر بھی ہے اور وقت بھی کم رہ گیا ہے اس لیے اس کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کیوں غم فرماتے ہیں آپ تو ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جن کو خشیت ہو اور خشیت صرف علم سے ہوتی ہے اسی لیے بصیغہ حصر فرمایا اور علم ان کو ہے نہیں مگر ان کا ہونا ان کے قبضے کی بات تھی۔پس جب یہ خود ہی توجہ نہیں کرتے آپ بھی غم نہ فرمائیے۔اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ علم میں کیا فضیلت ہے اور یہی مقصود ہے۔ دیکھئے اس سے بڑھ کر کیا فضیلت ہوگی کہ علم موقوف علیہ ہے خشیت کا اور شرط ہے اس کی گو

---

[1] (الدر المنثور ۱: ۱۹۲، کشف الخفاء ۱: ۴۹۸)

علت تامہ خشیت کی نہیں اس جملہ کو طلبہ یاد رکھیں۔ آگے چل کر اس سے کام لیا جائے گا۔
اب یہ دیکھئے کہ خشیت جو موقوف ہے علم پر کیسی چیز ہے تو علم بھی اسی درجے کی چیز ہوگی
کیونکہ موقوف علیہ واجب کا واجب اور مندوب کا مندوب ہوتا ہے تو نصوص میں دیکھنے اور
غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت کے برابر کوئی چیز مہتم بالشان اور اس سے زیادہ
واجب نہیں، کسی کسی مقام پر اس کو بلفظ تقویٰ بھی فرمایا گیا ہے جیسے "ھدی للمتقین"
(ہدایت ہے متقین کے لیے) میں اس جملہ کی اگر چہ دوسری تفسیر بھی ہے لیکن سیدھی تفسیر یہ
ہے کہ تقویٰ کے معنی خوف کے لیے جائیں اور معنی یہ ہوں کہ ڈرنے والوں کے لیے ہدایت
ہے کیونکہ جب خوف پیدا ہوگا تب ہی حق کی تلاش بھی ہوگی۔ خوف وہ چیز ہے کہ اسلام بھی
اسی کی بدولت پھیلا یہ تو نقلی طور پر خشیت کا مہتم بالشان ہونا ثابت ہوا۔ اب عقلی طور پر لیجئے!
ظاہر ہے کہ انتظام عالم کا بقاء خشیت ہی سے ہوتا ہے۔ دیکھئے انسان جو قبائح سے بچتا ہے تو
کیوں یا تو محض تعلیم اخلاقی سے بلا کسی خشیت کے یعنی اس لیے کہ یہ کام برا ہے اور برے
کام سے بچنا چاہیے مگر دنیا میں اس انداز کی طبیعتیں بہت کم ہیں کہ صرف یہ تعلیم ان کے لیے
مانع ہو جائے۔ فرض کیجئے کہ دو شخص ایک ساتھ سفر کریں اور ان میں سے ایک شخص کے پاس
ایک لاکھ روپے کا نوٹ ہے اور دوسرا تہی دست ہے اور اتفاق سے یہ دونوں ایک پہاڑ پر پہنچ
گئے جہاں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں اور تہی دست اس دوسرے کا مخالف بھی ہے مذہبا بھی اور
خاندانی طور سے بھی اور پہاڑ پر پہنچ کر اس تہی دست کے دل میں روپے کا لالچ پیدا ہوا اور
نفس نے رائے دی کہ اس کو قتل کر کے روپیہ اپنے قبضے میں کر لو اور یہ قادر بھی ہوا۔ میں
پوچھتا ہوں کہ اس موقعہ پر کون چیز ہے کہ اس کو اس کے ارادے سے باز رکھ سکے، دنیاوی
خوف تو اس لیے مانع نہیں ہو سکتا کہ یہ فرض کیا جا چکا ہے کہ اس مقام پر کوئی دیکھنے والا نہیں،
غرض دنیا بھر کے سارے اجزاء تلاش کر لیجئے کوئی چیز سوائے خشیت خداوندی کے ایسی نہ
ملے گی کہ اس کو اپنے ارادے سے روک سکے۔

تو دیکھئے اس غریب کی جان بچانے کے لیے اس موقعہ پر اگر کوئی چیز مدد کو پہنچی تو وہ
صرف خشیت اور مذہب ہے اس کے سوا ہزاروں صورتیں ایسی ہیں کہ اگر مذہب کی روک نہ

ہوتو انسان کسی طرح نہیں رُک سکتا۔ اودھ میں ایک سب جج مسلمان کے ہاں دو تعلق داروں کا مقدمہ تھا۔ ایک فریق ایک لاکھ روپیہ اور دوسرا سوا لاکھ روپیہ رشوت لے کر پہنچے۔ اب بتلایئے کہ کس چیز نے ان کو رشوت لینے سے روکا' کیا تہذیب یا تعلیم نے' ہرگز نہیں سینکڑوں تہذیب اور تعلیم یافتہ عام لوگوں کا گلا دبا کر دو دو چار چار روپیہ تک وصول کر لیتے ہیں اور اگر کسی مہذب نے اس سے احتراز ہی کیا تو اسی وقت تک کہ جب تک قلیل مقدار میں ورنہ اتنی بڑی مقدار کے سامنے تہذیب میں ہرگز قوت نہیں رہ سکتی یہ صرف خدا کا خوف تھا جس کی بدولت وہ اتنے بڑے امتحان میں کامیاب ہوئے اور دونوں کی رشوت لینے سے انکار کر دیا اور ہم نے تو آج کل ایسے لوگ بھی دیکھتے ہیں کہ تھوڑی مقدار بھی لینے ان کو عار نہیں۔ ایک عہدیدار کو کسی دیہاتی نے ایک روپیہ رشوت دینا چاہی' اتفاق سے جیب میں ایک روپیہ اور ایک ادھنا پڑا تھا چونکہ ہاتھ بند کر کے دیا اس لیے پتہ نہ چلا اور بجائے روپیہ کے ادھنا دینے لگا اس عہدیدار نے اول لینے سے انکار کیا مگر جب اس نے اصرار کیا تو لے لیا' گھر پر جا کر جو اس دیہاتی نے جیب کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بجائے روپیہ کے ادھنا دے دیا ہے بہت شرمایا اور شرم اتارنے کو ان کے پاس آیا اور معذرت کر کے ان کو روپیہ دیا اور ادھنا واپس مانگا' ان حضرت نے روپیہ بھی لے لیا اور ادھنا واپس نہ دیا اور فرمایا واپس کیوں دیں آخر کچھ آیا ہی ہے گیا تو نہیں تو بعض کی تہذیب تو اس قدر سستی ہوتی ہے کہ دو پیسہ میں بھی بک جاتی ہے اور جن کی کچھ قیمتی ہے وہ محض تھوڑی مقدار ملنے کے وقت مانع ہوتی ہے ورنہ اگر ان کو لاکھ دو لاکھ روپیہ ملے تو ہرگز نہ چھوڑیں۔ غرض قبائح سے روکنے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف مذہب اور خشیت خداوندی ہے تہذیب ہرگز نہیں روک سکتی۔

آج کل کی تہذیب

آج کل کی تہذیب کی حقیقت اور اس کا انجام اگر دیکھنا چاہیں تو کتاب مآل التہذیب مصنف مولوی قمرالدین صاحب مرحوم کو دیکھیں اس کے نو مقالے تیار ہونے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے جا بجا دکھلایا ہے کہ اس تہذیب کا مآل کیا ہونے والا ہے اور ہر مضمون کے آخر میں یہ ظرافت آمیز جملہ بھی موجود ہے کہ "**فویل یومئذ للمھذبین**"

(پس تہذیب یافتہ لوگوں کے لیے اس دن خرابی ہے) اگر اعتقاد سے بھی اس کتاب کو نہ دیکھا جائے تو اس کو ایک ناول ہی فرض کر کے دیکھ لو۔ خلاصہ یہ ہے کہ خشیت ہی سے دین و دنیا کے انتظام کا بقاء ہو سکتا ہے اگر خشیت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں اور ایک نئے انداز سے سمجھئے کہ اگر خشیت قلب میں ہو تو اس سے نرمی پیدا ہو گی اور نرمی سے اخلاق حمیدہ جن کی آج بھی تعلیم ہوتی ہے جیسے ایثار وغیرہ یہ سب با آسانی پیدا ہو سکیں گے اور اس سے نظام عالم احسن صورت پر باقی رہے گا پس اس اخلاق کو بھی روح تمدن کہا جائے وہ بھی خشیت ہی سے درست ہوتے ہیں لیکن خشیت کا موقوف علیہ علم دین ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کا علم نہ ہوگا اس وقت تک اس کا خوف پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کی گائے کھو گئی تھی اس کی تلاش میں نکلا' رات کے اندھیرے میں پتہ تو چل نہیں سکا ایک شیر کو پکڑا دیکھا' سمجھا کہ گائے ہے کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا جب معلوم ہوا تو روح ہی نکل گئی تو واقعی بدون معرفت کے خشیت نہیں ہو سکتی۔

صاحبو! میں نے علم کے فضائل نہیں بیان کیے کیونکہ اول تو وقت نہیں دوسرے آج کل کے عقلاء کو نرے فضائل سے تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ عقل سے اس کی ضرورت ثابت نہ کی جائے حالانکہ عقل اس درجے کی چیز نہیں کہ ہر امر میں اس کو مدار قرار دیا جائے۔ حکم عقل موجب پریشانی اور شرع موجب راحت ہوتا ہے۔ خوب کہا گیا ہے:

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمالیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنالیا)

اور واقعی اگر عقل کو ہر بات میں حکم بنایا جائے تو ہم کو بڑی مشکل پڑے گی۔ مثلاً یہ قاعدہ عقلی ہے کہ منعم علیہ پر منعم کا شکر بقدر نعمت کے واجب ہے۔ پس اگر اس قاعدہ میں ہم عقل کو حکم بنائیں تو ذرا غور کیجئے کہ ہم کو کتنی مشکل درپیش ہوگی کیونکہ ہر سانس کی آمد و رفت میں ہم پر دو نعمتیں ہیں۔ پس اس طرح دن رات میں کتنی نعمتیں ہم پر ہوئیں اور ان کی کثرت کے لحاظ سے کتنا شکر ہم پر واجب ہوا تو بتلائیے کہ اس شکر کو کون ادا کر سکتا ہے اور نہ ادا کرو تو عقل مجرم ٹھہراتی ہے۔ اب شرع کا احسان دیکھئے کہ اس میں سے تھوڑی سی مقدار کو واجب

قرار دیا تو ہر جگہ عقل کی ٹانگ اڑانا سخت مشکل کا اٹھانا ہے مجبوراً یہی کہنا پڑے گا کہ:

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(بہت زیادہ غور کرنے والی عقل کو میں نے آزمالیا اس کے بعد اپنے کو میں نے دیوانہ بنالیا)

ہاں عقل بیکار بھی نہیں وہ اتنا کام دے سکتی ہے کہ اس سے یہ معلوم کرلیا جائے کہ حاکم کون ہے؟ اور جب یہ معلوم ہوگیا تو آگے عقل کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقل سے معلوم ہوسکتا ہے مگر اس کے ہر قانون کی لم ہرگز ہر شخص کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ عقل کی حالت بالکل گھوڑے کی سی ہے تو دیکھئے اگر آپ کا ایک محبوب پہاڑ کی چوٹی پر ہو اور آپ سے وہاں تک چار میل کا فاصلہ ہو جن میں دو میل سڑک اور دو میل پہاڑ کی چڑھائی ہو تو آپ گھوڑے کی سواری کہاں تک کریں گے۔ ظاہر ہے کہ دامن کوہ تک سواری ہوسکے گی' آگے جہاں سے کوہی زینہ شروع ہوا ہے وہاں سے گھوڑا بیکار ہے پس اسی طرح فقرعیات کے زینہ میں عقل کو مرکب بنانا اوندھے منہ گرنے کی کوشش کرنا ہے وہاں سے یہ حالت ہونی چاہیے کہ:

وزاں　　جاباںل　　محبت　　پری

فضیلت علم دین

غرض آپ کو معلوم ہوا کہ علم دین کیا چیز ہے کہ نظام عالم اس پر موقوف ہے۔ صاحبو! میں یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا عالم اصطلاحی بنے مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ علم دین خواہ وہ اردو میں ہو' خواہ فارسی میں' خواہ عربی میں اور خواہ کتاب سے یا صحبت سے ہر شخص کو سیکھنا چاہیے اور اس کے بعد تھوڑا سا چسکا خشیت کا بھی ضرور لینا چاہیے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ علم کے بعد تو خشیت ہو ہی جائے گی تو سمجھو کہ علم موقوف علیہ ہے اور شرط ہے خشیت کی نہ کہ خشیت کی علت تامہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خشیت بدون علم کے نہیں ہوتی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں علم ہوگا خشیت بھی ضرور ہوگی اور یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے پہلے کہا تھا کہ طلبہ اس جملہ کو یاد رکھیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس مقام پر دو شبے ہو رہے ہیں ایک تو علماء کو ایک عوام کو' علماء کو تو یہ شبہ ہوا کہ "انما یخشی اللہ من عبادہ العلموا" (بے شک خدا سے

تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں) فرمایا گیا ہے اور ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے اور جب خشیت بھی ہے تو ہم اس فضیلت میں داخل ہوئے اور مخدوم الخلائق ووارث نبی ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ محض علم سے خشیت ہونا ضروری نہیں اس کے لیے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ وہ دنیا کے بندے ہیں اور ان کو خدا کا خوف کچھ بھی نہیں ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ بھی زائل ہوگیا۔ عوام کے اعتراض کا اکثر لوگ یوں جواب دیا کرتے ہیں کہ جس عالم کو خوف خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے۔

پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے۔ یہ جواب فی نفسہ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا اس لیے کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہوگی اور علم سے مراد علم مع الخشیت ہوگا۔ پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر۔ پس تقدم الشئی علیٰ نفسہ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری اور اس کا موقوف علیہ ہے علم۔ اس کو حاصل کرو لیکن علم حصول خشیت کی علت تامہ نہیں بلکہ اس علت کا ایک جزو ہے۔ دوسرا جزو قرآن شریف کے دوسرے مقام سے معلوم ہو۔ "**یایها الذین امنوا اتقوا الله ولتنظر نفس ماقدمت لغد واتقوا الله**" (اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر نفس غور کرے کہ کل کے لیے کیا بھیجا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تقویٰ بمعنی خشیت کا حکم ہے پھر **ولتنظر** میں اس کا طریقہ ہے کہ اپنے اعمال کو سوچا کرو اس کے بعد بطور نتیجہ کے ارشاد ہے کہ "**اتقوا الله**" یعنی یعنی یہ غور وفکر کرو گے تو تم کو تقویٰ وخوف حاصل ہوجائے گا۔ علاوہ آیت کے تجربہ سے بھی معلوم ہے کہ نرے علم سے خشیت نہیں ہوتی بلکہ علم کے ساتھ غور وخوض کی ضرورت ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ "**اذا فات الشرط فات المشروط**" (جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت ہوگیا) اور دوسری چیز یہ ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر خوب سوچا کرو کہ قیامت کے لیے ہم نے کیا سامان تیار کر رکھا

ہے جب وہاں پوچھ ہوگی تو ہم کیا جواب دیں گے جس کو دوسری جگہ فرماتے ہیں "اقترب للناس حسابهم وهم في غفلة معرضون" (قریب آ گیا لوگوں کے لیے ان کا حساب اور وہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے اعراض کرنے والے ہیں) اس سے ایک خاص اثر پیدا ہوگا اور جس کو اصطلاح میں حال کہتے ہیں۔

اصلاح کیلئے تین امور کی ضرورت

اصلاح میں تین امر ضروری ہوئے ایک علم دوسرا عمل تیسرا حال چونکہ جب تک حال نہ ہونرے علم وعمل سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ زنا حرام ہے اور اس پر عمل بھی کرے کہ زنا سے بچا رہے لیکن اس عمل کو بقاء اس وقت نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس عمل میں صاحب حال نہ ہو جائے بغیر حال کے عمل ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی کہ اس کو ہاتھ سے دھکیل کر کچھ دور تک لے جائیے لیکن جہاں چھوڑ دیجئے رہ جائے گی کیونکہ اس میں آگ نہیں پس یا تو خود انجن بن جاؤ کہ تمہارے اندر آتش محبت الٰہی بھری ہوئی نہیں تو کسی انجن کے ساتھ ہولو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہی حالت ہوگی جس کو پہلی مثال میں عرض کیا۔ حضرت عراقی کہتے ہیں:

صنما رہ قلندر سزا وار بمن نمائی | کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے صنم قلندر کا راستہ لائق ہے اگر تو مجھ کو دکھائے اس واسطے کہ میں پارسائی کے راہ و رسم سے دور دیکھتا ہوں)

پارسائی سے مراد عمل محض ہے کہ دور دراز رستہ ہے بلکہ اس رستے میں اکثر نیت بھی خراب ہو جاتی ہے اور اخلاص کے ساتھ ریا شامل ہو جاتی ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں:

بزمیں چو سجدہ کردم زز میں ندا بر آمد | کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدہ ریائی

(جب میں نے زمین پر سجدہ کیا زمین سے ندا آئی کہ تو نے ریا کے سجدہ سے مجھ کو خراب کیا)

اور فرماتے ہیں کہ:

بہ طواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم ندا وند | کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

(میں کعبہ مکرمہ کے طواف کے لیے گیا مجھ کو حرم کا راستہ نہ دیا اس واسطے کہ دروازہ کے باہر تو نے کیا کیا یہ کہ جس کے سبب حرم میں داخل ہو)

غرض حال نہ ہو تو عمل اکثر بیکار تصور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھئے کہ نرا حال بھی کافی نہیں۔ جیسا کہ آج کل جہلاء نے برنگ تصوف اس کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ اول تو قرآن شریف سے عمل کی ضرورت ثابت ہے دوسرے عقلاً بھی حال کے لیے عمل لازم ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص محض صاحب حال ہو اور اس کا حال کبھی ظہور پذیر نہ ہو اور یہی عمل ہے دیکھو اگر مدت کے بعد محبوب سے ملاقات ہو تو کیا حالت ہوتی ہے کہ اول تو اس کو دیکھتے ہی اس کی تعظیم کے لیے زمین پر گر پڑے گا پھر جا کر اس کو لپٹ جائے گا' کیا یہ ممکن ہے کہ محبوب کو دیکھے اور اس کو حرکت بھی نہ ہو۔ یوں ہی دیوار کی طرح کھڑا رہے تو اگر ان درویش کو محبت خداوندی ہے تو اس کا ظہور کیوں نہ ہوتا' اطاعت کیوں نہ ہوتی۔

خشیت حال

غرض علم بھی ضروری عمل بھی ضروری حال بھی ضروری پس "انما یخشی اللّٰہ" میں خشیت حال ہے اس سے بقاء اور سہولت ہوتی ہے۔ گویا خشیت ہی سے عمل کی بقاء ہوتی ہے اسی سے عمل میں سہولت ہوتی ہے اسی سے عمل کی توفیق ہوتی ہے کیونکہ جب تک چسکا نہ ہو کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی بلکہ حال ہی سے دنیا کے کام بھی چلتے ہیں۔ دیکھئے اگر رات کے دو بجے کسی جگہ ریل میں جانا ہو تو عین وقت پر بلا کسی کے بیدار کیے خود بخود آنکھ کھل جانا یہ حال ہی کی بدولت ہے اور صاحبو! یہی حال اور جاذب وہ چیز ہے کہ آپ کو تو کیا سونے دیتا اس نے تو محبوب حقیقی تک کو تمہاری طرف متوجہ کر دیا ہے۔ خوب کہا ہے:

عشق رانا زم کہ یوسف رابا زار آورد

(عشق پر ناز کرتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بازار میں لایا)

تو زلیخا کو تو کیا چین ہوتی یوسف علیہ السلام کو بھی چین سے کنعان میں نہ بیٹھنے دیا:

ہمچو صنعا زاہدے رازیر زنار آورد

(زاہد صفا کی طرح زنار کے نیچے لایا)

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ مراد زنار سے بدنامی اور ملامت ہے اور واقعی جو شخص عشق کے رنگ میں آتا ہے بدنام ہوتا ہے ہمارے ایک دوست ہیں ڈپٹی کلکٹر جس روز سے ان پر یہ حالت غالب ہوئی ہے دنیا سے دل سرد ہو گیا ہے اب صرف ان کو یہی ایک سبق یاد ہے۔ بس گویا یہ حال ہے کہ:

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　　الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(جو کچھ پڑھا ہم نے بھلا دیا مگر یار کی باتیں نہیں بھلائیں کہ ان کا بار بار تکرار کرتے ہیں)

ان کے خاندان کے لوگ ان سے خفا اور میرے شاکی ہیں کہتے ہیں کہ قیامت میں ان سے باز پرس ہوگی۔ یہ قوم کے افراد کو تباہ کر رہے ہیں مگر میں اس کے جواب میں وہی کہوں گا جو کہ ہمارے بزرگ حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے ہی موقعہ پر کہا تھا کہ میاں ہم کو بھی تو کسی نے بگاڑا ہے ہم کو بھی یہی بگاڑنا آتا ہے لوگ کیوں ہمارے پاس بگڑنے آتے ہیں ہم کسی کو بلانے تو نہیں جاتے۔ صاحبو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے قوم کے افراد کو کیا بگاڑ دیا' نوکری سے میں منع نہیں کرتا' قطع تعلقات کو میں نہیں کہتا' ہاں یہ کہتا ہوں کہ فرعون نہ بنو تم کسی کے بندے ہو بندگی کو اپنا شعار رکھو۔ غرض عاشق کے لیے بدنامی لازم ہے یہ معنی ہیں (ہم چو صنعا زاہدے را) کے لیکن صاحب محبت کو بدنامی کی ذرا پروا نہیں ہوتی بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ:

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

بلکہ بدنامی سے قلب میں اور جوش پیدا ہوتا ہے اور ہمت بڑھتی ہے اور یوں کہتا ہے کہ:

ساقیا برخیزد در دہ جام را　　　خاک برسر کن غم ایام را

(اے ساقی اُٹھ تو اور جام دے تو اور زمانہ کے غم پر خاک ڈال)

اور

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کو نہیں چاہتے)

الحاصل اس کو کچھ بھی پروانہیں ہوتی اس کا یہ مذہب ہوتا ہے:

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا　　اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

(غرض جب یہ محبت اور جمال محبوب تک کو متوجہ کر دیتا ہے تو آپ کو تو کیا چین سے رہنے دے گا)

بس یہ حالت ہوتی ہے کہ:

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم　　جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

(مجھ کو جاناں کی منزل میں کیا امن وعیش جبکہ ہر سانس گھنٹہ فریاد رکھتا ہے کہ محمل باندھو)

کہ ہر وقت گھنٹی بج رہی ہے کہ چلو اور بیدار ہو۔ دوسری جگہ کہتے ہیں:

ایں قدر ہست کہ بانگے جر سے می آید

اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ واقعی گھنٹی بجتی ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھنٹی کا کام جگا دینے کا ہے ان کے دل میں ہر وقت ایک محرک تقاضا کرتا ہے اور وہی حال ہے اسی نے بزرگوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ رات بھر روتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

اے خدا ایں بندہ را رسوا مکن　　گو بدم من سر من پیدا مکن

(اے خدا اس بندہ کو ذلیل مت کر گرچہ میں برا ہوں میرے بھید کو ظاہر مت کر)

ایک اور بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ رات بھر پریشان رہتے' جب بیوی زیادہ تقاضا کرتی تو آرام کرتے لیکن تھوڑی دیر میں پھر چونک کر اٹھ بیٹھتے اور فرماتے کہ کیا کروں' یہ آیت نہیں ہونے دیتی۔ "یایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا" (اے ایمان والو! اپنے آپ اور اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ) حاصل یہ کہ تقویٰ کے لیے فکر غد ضروری ہے کہ یوں سوچ کہ اس کے لیے ایک خاص زاد کی ضرورت ہے اور وہ ہمارے پاس نہیں ہم بالکل مفلس پراگندہ ہیں' یہ ایسا افلاس ہے کہ دنیا کا افلاس اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں' دنیا کا افلاس آخر ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس افلاس کا کہیں خاتمہ نہیں۔ وہاں یہ حالت ہوگی:

کہ بازار چند آنکہ آگندہ تر　　تہید ست را دل پراگندہ تر

(بازار کتنا ہی سامان سے زیادہ بھرا ہوا ہے خالی ہاتھ والے کا دل زیادہ پریشان ہوتا ہے)

کہ وہاں کا بازار گرم ہوگا' اقسام اقسام کی عمدہ چیزیں بکی ہوں گی مگر تمہاری جیب خالی ہوگی۔ ذرا غور کرو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی؟

روزانہ اپنے محاسبہ کی ضرورت

صاحبو! ہنوز وقت باقی ہے اپنا علاج کرلو اور زاد راہ جمع کرلو "والتنظر نفس" ایک کلیہ ہے اللہ کے بندوں نے اس کے جزئی طریقے نکال کر بتلا دیئے ہیں ان میں ایک طریقہ یہ ہے کہ دن رات میں ایک وقت تجویز کرلو اور اس وقت بیٹھ کر سوچا کرو' سب سے اول یہ سوچو کہ خدا تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں ہم پر ہیں اس کے بعد یہ سوچو کہ ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ہم اس کی نعمتوں کا کس قدر شکر ادا کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں تو صبح سے شام تک کے گناہ ہی گن ڈالے اس کے بعد غور کرے کہ اگر ہمارا یہ برتاؤ کسی دوسرے سے خصوصاً حاکم یا آقا سے ہوتا تو وہ کیا کرتا اور جو کچھ ذہن میں آئے اس کی بابت سوچے کہ خدا تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ یہ کرسکتا ہے اس کے بعد سوچے کہ میدان قیامت برپا ہے آفتاب قریب آگیا ہے احکم الحاکمین کا اجلاس ہورہا ہے نہ کوئی بیرسٹر ہے نہ کوئی وکیل ہے اور اس اثناء میں مجھے پکارا گیا ہے' فرشتے آئے اور مجھ کو پکڑ کر لے گئے اور وہاں لیجا کر چھوڑ دیا' اب مجھ سے میرے اعمال کی باز پرس ہورہی ہے اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں نہ کوئی ٹھکانا ہے کہ وہاں بھاگ کر پناہ لوں' ہاں سامنے جہنم ہے ملائکہ گرفتار کرکے مجھ کو

پابد ستے دگرے دست بدست دگرے

جہنم کی طرف لے جارہے ہیں۔ بس یہ سوچ کر فوراً سربسجود ہوجاؤ اور نہایت گڑگڑا کر خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور رونا نہ آئے رونے کی صورت بناؤ اور یہ دعا کرو کہ اے خدا میرے گناہوں کو معاف کر اور مجھے ہمت دے کہ مجھ سے گناہ نہ ہوں۔ یہ تو رات کو کرے اور دن میں علماء کے رسائل لے کر ان کو پڑھے اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی پڑھاوے۔ اگرچہ بچے انگریزی ہی پڑھتے ہوں' افسوس تم لوگ اولاد کو کندہ جہنم بنانے کے لیے پرورش کرتے ہو۔ صاحبو! جب ان کا مآل یہ ہوا تو ان کے پیدا ہونے سے اور پرورش ہونے سے کیا نفع ہوا اس سے تو پیدا نہ ہوتے اور بچپن میں مرجاتے تو اچھا تھا۔

مرا اے کاشکے مادر نمیزاد وگر میزاد کس شیرم نمی داد

(مجھ کو کاش کہ میری ماں نہ جنتی اور اگر پیدا کرتی کوئی مجھ کو دودھ نہ دیتا اور ان رسائل میں جہاں شبہ ہو اس کو علماء سے حل کرلو)

خشیت پیدا کرنے کا طریقہ

جب یہ دو کام شروع کردو گے ان شاء اللہ خود بخود اعمال کی توفیق ہوگی اور یہ حالت ہوجائے گی جس کو فرماتے ہیں "**یایھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ وقولوا قولاً سدیداً یصلح لکم اعمالکم**" (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کہو سیدھی بات درست کردے گا وہ تمہارے لیے اعمال کو) کہ تقویٰ سے مراد شخصیت اور **قولوا قولاً سدیداً** سے مراد اعمال جب یہ دو کام جمع کرلو گے تو اس سے خشیت پیدا ہوگی پھر اعمال خود بخود درست ہوجائیں گے اور یہ زندگی عمدہ زندگی ہوجائے گی پھر یوں کہہ سکو گے کہ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

(ہرگز نہیں مرتا وہ شخص کہ اس کا دل عشق سے زندہ ہوگیا' دنیا کے تمام اخبارات پر ہمارا دوام ثابت ہوگیا)

تم اپنی اس زندگی موجود پر کیا ناز کرتے ہو حیات یہ ہے جس کو حیات ابدی کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ موت تو آئے گی پھر جدیدہ عالم پر دوام کہاں ہوا۔

تو سمجھو کہ وہ موت ظاہری موت ہے وہ ایسی موت ہے کہ جس کی تم خود تمنا کرو گے کہ وہ آئے تو یہ ہیولانی حجابات کی دیوار اُٹھے اور موت کے وقت یوں کہو گے:

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آگیا کہ میں برہنہ ہوجاؤں جسم کو چھوڑ دوں اور بالکل روح ہوجاؤں)

گویا جسم کے چھوٹنے پر خوش ہوگے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(میں خوش ہوں گا اس دن کہ اس ویران منزل (دنیا) سے چلا جاؤں گا۔ روح کا آرام طلب کرتا ہوں اور جاناں کے دربار میں چلا جاؤں۔ میں نے نذر کی کہ اگر یہ دن غم کے ساتھ بسر ہو جائیں تاکہ شراب خانہ کی طرف خوش خوش غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

حکایت حضرت صاحب جیؒ

اللہ اکبر! کیا خوشی ہے صاحبو! وہ اس موت کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ اس کی تمنا کرتے ہیں اور اس زندگی کا ان کو ایسا یقین ہے کہ اس یقین کے بعضے آثار تک ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے حضرت مرشدؒ نے مرض الموت میں ایک بزرگ سے یہ وصیت فرمائی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر ہو۔ دیکھئے ان کو پورا یقین تھا کہ میں اس حیات کی وجہ سے استماع ذکر سے متلذذ ہوں گا مگر اتفاق سے ان بزرگ نے کہا کہ مناسب نہیں حضرت اسی پر راضی ہوئے اور کسی کو اس وصیت کی اطلاع نہیں ہوئی' اتفاق سے جس وقت جنازہ چلا اسی کے ساتھ ایک عرب تھے انہوں نے للکار کر کہا "ایھا الناس اذکروا اللّٰہ" (اے لوگو! خدا تعالیٰ کو یاد کرو) چنانچہ ذکر ہونے لگا' یہ کرامت ہے کہ ان حضرات کی تمنا پوری ہو کر رہتی ہے خوب کہا ہے۔ ع..... تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں۔ اور ایک دوسرے بزرگ نے یہ وصیت کی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے چلیں:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو ۔۔۔ شیئاً للہ از جمال روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما ۔۔۔ آفریں بردست و بر بازوئے تو

(مفلس ہیں ہم اور تیرے کوچہ میں آئے ہیں تیرے رُخ انور کے جمال سے اللہ کے لیے کچھ مجھ کو بھی' ہاتھ کھول ہماری بھیک کی جھولی کی طرف شاباش تیرے ہاتھ اور بازو پر)

حضرات! اگر روح میں حیات نہ تھی تو یہ وصیتیں کیوں کیں اور فقط یہ نہیں کہ یہ محض ان کا خیال ہی ہو بلکہ بعض اوقات آثار کا بھی ظہور ہوا ہے۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہ کی حکایت ہے کہ جب ان کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے تو جنازے پر ان کے ایک خادم نے یہ اشعار پڑھنا شروع کیے:

سرو سیمینا بصحرا میروی ۔۔۔ سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو ۔۔۔ تو کجا بہر تماشا میروی

(ہمارا سروسیمین ہمارا وہ محبوب جس کا قد سرو جیسا اور جسم چاندی جیسا ہے جنگل کی طرف جاتا ہے بڑی بے وفائی ہے کہ ہمارے بغیر جاتا ہے اے پیارے تیرا چہرہ تماشا گاہ عالم ہے تو تماشا کے لیے کہاں جاتا ہے)

لکھا ہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ آخر یہ کس چیز نے ہاتھ بلند کرادیا تھا۔ پھر کیا یہ کہنا غلط ہے کہ ؎..... ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما۔ مگر مجھے خوف ہے کہ جہلا ان کو زندہ سمجھ کر ان سے مرادیں نہ مانگنے لگیں لیکن مرادیں مانگنا زندوں سے کب جائز ہے کہ بر تقدیر ان کی زندگی کے ان سے جائز ہو دوسرے ان سے مانگو تو وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو، مال و دولت یا اولاد ان کے پاس کہاں ہیں کہ وہ تم کو دیدیں گے ان کے پاس صرف ایک چیز ہے جس کو ساری عمر انہوں نے ڈھونڈھا اور اسی میں عمریں تمام کردیں یعنی خدا تعالیٰ سو اس کو اس کی مرضی کے موافق ان سے مانگو تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ زندگی کیسی زندگی ہے اور اس کے حاصل ہونے کا طریق کیا ہے علم دین سیکھو اس پر عمل کرو اور اس عمل کو حال بنالو اس سے دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی، دنیا اس معنی کو کہ تم کو راحت کلی نصیب ہوگی یہ نہیں کہ بہت سامال مل جائے گا۔

تفسیر آیت متلوہ

آگے ارشاد فرماتے ہیں: "ان اللّٰہ عزیز غفور" (بے شک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست بہت بخشنے والا ہے) سبحان اللہ! کیا بلاغت ہے کہ اول عزیز فرمایا اس کے بعد غفور پر خاتمہ آیت کیا کیونکہ اگر اس کا عکس کرتے کہ اول غفور فرماتے ہیں اور پھر عزیز فرماتے تو چونکہ خاتمہ مضمون جلال پر ہوتا اس لیے غلبہ خوف سے مایوسی ہوجاتی کہ ہم تو اس قدر گنہگار اور خدا تعالیٰ ایسے قہار تو ہماری مغفرت کس طرح ہوگی۔ برخلاف اس ترتیب کے کہ اس میں خاتمہ مضمون رحمت پر فرمایا ہے جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اول کچھ باز پرس ہوئی بھی تو انتہا رحمت ہی پر ہوگی۔ لہٰذا تم مایوس نہ ہو جاؤ۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق دے۔ آمین

ملت ابراہیم علیہ السلام

سورتی جامع مسجد رنگون میں ۹ ربیع الثانی ۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو دو گھنٹہ ۴۰ منٹ تک بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۲ ہزار سے زائد تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

ومن يرغب عن ملة ابراهيم الا من سفه نفسه ولقد اصطفيناه في الدنيا وانه في الاخرة لمن الصالحين ○ اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمين ○ (البقرہ آیت نمبر ۱۳۰، ۱۳۱)

ترجمہ: ''اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی۔''

دین کے اصل الاصول

جس آیت کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس میں ایک خاص مضمون مذکور ہے جس کو باقتضائے وقت بیان کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور وہ مقتضائے وقت یہ ہے کہ یہ تو سب حضرات کو معلوم ہے کہ رنگون میں میرے حاضر ہونے کا یہ سب سے پہلا موقع ہے اس سے قبل نہ میرا یہاں کوئی بیان ہوا نہ یہاں میرے حاضر ہونے کا کبھی اتفاق ہوا اور جب حاضری ہی کا اتفاق نہیں ہوا تو موقع بیان کا تو کیا ملتا۔ تو گویا یہ اول بیان ہے میرا اس مقام پر اس لیے جی یوں چاہتا ہے کہ ایسے مضمون کے متعلق بیان کیا جائے جو سب میں اولیت کا استحقاق رکھتا ہو اور یہ تو

ظاہر بات ہے کہ ہم لوگوں کی حالت کے مناسب بیان ہے تو دین ہی کا ہے تو دین کے اجزاء میں جو سب سے اول مقدم جزو ہو اس کو اس وقت بیان کرنا زیادہ زیبا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دین میں اجزاء مختلف ہیں۔ یعنی کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اصول ہمیشہ قابل تقدیم ہوا کرتے ہیں اور مقدم ہوا کرتے ہیں فروع پر۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے اس کے علاوہ ایک تیسری بات اور بھی ہے جو سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ خود اصول میں بھی دو درجے ہوا کرتے ہیں ایک تو اصول اور ایک اصل الاصول تو ضرور ہوا کہ دین کے اندر بھی سب قسم کے اجزاء ہوں بعض تو فروع کہنے کے قابل اور بعض اصول کہنے کے قابل پھر حسب قاعدہ مذکورہ جو اجزاء اصول کہنے کے قابل ہوں ان میں بھی ایک نہ ایک ایسی چیز ہونی چاہیے جو ان اصول کی بھی اصل ہو اور جس کو اصل الاصول کہہ سکیں۔ اب رہی اس کی تعیین سو ہر شخص کو معلوم ہے کہ دین کے اندر اصل الاصول کیا چیز ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایسی چیز ہوگی جس کے مقابلہ میں نہ کوئی اصل معتد بہ درجہ رکھتی ہو نہ کوئی فرع۔ یہ سب مقدمات بالکل ظاہر ہیں اس کے بعد میں اپنے مسلمان بھائیوں کے فقط ایک اجماعی عقیدہ کو نقل کیے دیتا ہوں اس سے خود تعیین اس اصل الاصول کی ہو جائے گی۔ یہ عقیدہ اجماعی ہے اور منصوص ہے اور منصوص بھی بنص قطعی کہ بدون اسلام کے کوئی طاعت مقبول نہیں۔ جب طاعت پر مقبولیت ہی مرتب نہ ہوئی تو کوئی چیز معتد بہ نہ ہوئی اس کو سب مسلمان مانتے ہیں کسی سے خلاف وارد نہیں اور اگر کوئی خلاف کرے بھی تو وہ مسلمان نہیں کیونکہ نص قطعی کا انکار ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اس کی تصریح فرمادی ہے "ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه" (اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ دین اس سے (نزد خدا) مقبول نہ ہوگا) اس آیت میں تو صاف نفی کردی ہے دوسرے ادیان کے مقبول ہونے کی۔

بغیر اسلام کے کوئی عمل مقبول نہیں

دوسری آیت میں گو عنوان مختلف ہے لیکن معنون یہی ہے۔ ارشاد ہے: "ان الدین عند اللہ الاسلام" حصر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک دین فقط اسلام ہے اس

میں بھی نفی ہے دیگر ادیان کی صحت کی اس کے علاوہ جا بجا جہاں اعمال کے نافع ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ قیدیں بھی مذکور ہیں۔ "وهو مومن وهو محسن" یہ قیدیں تصریحاً ظاہر کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بدون اسلام کے کوئی عمل مقبول نہیں' کوئی کتنا بڑا عمل کرے لیکن مسلمان نہ ہو تو وہ عمل کچھ بھی نہیں' کوئی لاکھ مجاہدے' ریاضت کرے مگر مسلمان نہ ہو تو کوئی معتد بہ نتیجہ نہیں کیونکہ اس کی عبادت کے اندر کوئی مقبولیت نہیں۔ چنانچہ خود حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ ایسوں کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں:

اولئک الذین لیس لهم فی الآخرة الاالنار وحبط ماصنعوا فیها وباطل ماکانوا یعملون

"یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب ناکارہ ہوگا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے اثر ہے) غرض یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اہل عقل خوب سمجھتے ہیں کہ کسی شخص میں اگر سلطنت وقتیہ کی اطاعت نہ ہو تو اس کے سارے کمالات گرد اور ہیچ ہیں۔ بس اسی کے درجہ میں یہ امر ہے جو میں عرض کر رہا ہوں ہر چند اس مثال کی کوئی ضرورت اور حاجت نہ تھی کیونکہ مثال توضیح کے لیے ہوا کرتی ہے سو اس مسئلہ میں کونسا خفا تھا جو اس کی توضیح کے لیے اس مثال کی ضرورت واقع ہوئی مگر ضرورت اس مثال کی یہ ہوئی کہ آج کل کچھ ایسا مذاق بگڑا ہے کہ ایسی موٹی بات میں بھی شبہ پیدا ہونے لگا ہے۔

عقیدہ کی اہمیت

جو عقیدے کے درجہ میں گو نہ ہو لیکن رائے کے درجہ میں ضرور ہے وہ شبہ مجھے اس وقت یاد آ گیا اور وہ شبہ ہی محرک ہوا اس کا کہ اس مثال سے اس کو رفع کیا جائے۔ بعض خطوط میرے پاس آئے ان میں یہ شبہ پیش کیا گیا تھا کہ صاحب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان نہ ہو اس میں سارے کمالات موجود ہوں لیکن اس کو نجات نہ ہوگی تو بعض مدعیان عقل نے یہ شبہ پیش کیا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص میں تمام کمالات موجود ہیں' سخاوت بھی مروت بھی' ایثار بھی قومی ہمدردی بھی آج کل بس یہ اخلاق شمار کیے جاتے ہیں اور آج کل بڑی تہذیب ان اخلاق ہی کو

سمجھا جاتا ہے اور عقائد کو عقیدۂ تو نہیں لیکن حالاً دائرہ مفہوم تہذیب سے گویا خارج ہی کر دیا ہے بلکہ عقائد کے اندر تو اپنے آپ کو بالکل مختار ہی سمجھ لیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ عقیدہ تو محض خیال کا نام ہے اور خیال کو بھلا کیا دخل نجات میں، عقائد کو تو یوں غیر ضروری قرار دے دیا ہے، اعمال کو کسی درجہ میں ضرور موثر سمجھتے ہیں مگر ان میں بھی سب اعمال نہیں محض چند اعمال جن کا نام اخلاق رکھ لیا ہے اور انہی کو مدار ٹھہرا دیا ہے ترقی اور کمال کا اور انہیں اخلاق کا نام تہذیب رکھا ہے اور ان کے یہ کام ہیں ترحم ایثار ہمدردی نفع رسانی حب قومی۔ بس ان چند اخلاق میں تہذیب کو منحصر سمجھ کر شبہ پیش کر دیا کہ ایک شخص سب بزرگوں کی تعظیم و تکریم بھی کرتا ہے کسی نبی کی اہانت بھی نہیں کرتا، کسی کا دل بھی نہیں دکھاتا۔ داد و دہش بھی کرتا ہے مگر فقط رسالت کا منکر ہے گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی بھی نہیں کرتا اور خدا کو بھی مانتا ہے یا خدا کو بھی نہیں مانتا تو یہ کہا جائے گا کہ صرف دو مفروض کمالات نہیں ہیں پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ان دو مفروض کمالات کے نہ ہونے سے اس کے سارے کمالات پر کیسے خاک ڈال دی جائے گی اور اس کو جہنم میں ٹھونس دیا جائے گا یہ تو بڑی بے رحمی کی بات ہے اور شبہ کو اس سے قوی کرتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ایسا شخص ہے جو نہ حلال حرام کی پرواہ کرتا ہے نہ فرائض کو ادا کرتا ہے، نہ نماز کا نہ روزہ کا بلکہ پرلے درجہ کا فاسق و فاجر اور بدکار غرض تمام اعمال اور اخلاق اس کے خراب مگر ہے مسلمان، تو کہتے ہیں کہ صاحب چونکہ مسلمان ہے اس لیے کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور جائے گا خواہ کٹ پٹ کر ہی جائے مگر جائے گا ضرور۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا یوں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں لیکن بظاہر یہ معاملہ خدا کی شان کے خلاف ہے یہ تو بالکل تعصب معلوم ہوتا ہے تو یہ شبہ پیش کرتے ہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کیسے افسوس کی بات ہے۔ یہ شبہ ان لوگوں کی زبان اور قلم سے نکلتا ہے جو اپنے کو سچا اور پکا مسلمان بلکہ قوم کا لیڈر اور مصلح خیال کرتے ہیں وہ شبہات پیش کرتے ہیں۔

خود ساختہ محقق

سو حضرت میں ان شبہات کا راز بتلا دوں جو جاہل ہو کر اپنے کو محقق سمجھے گا وہ ایسی ہی خرابی میں پڑے گا حضرت تحقیق کوئی معمولی پیر نہیں ہے بہت بڑی چیز ہے۔ میں سچ عرض

کرتا ہوں کہ یہ ساری خرابی ان کے دعوئے تحقیق کا نتیجہ ہے یعنی انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم محقق ہیں حالانکہ لوازم میں سے محققیت کے یہ سمجھنا بھی ہے کہ ہم محقق نہیں ہیں۔ جب علم و کمال کے ساتھ یہ اعتقاد نہ رہے کہ ہم محقق ہیں تب کہیں جا کر انسان محقق ہوتا ہے۔ اگر یہ لازم منفی ہے تو محقق شدن بھی منفی ہے چاہے عالم فاضل ہی کیوں نہ ہو اور چہ جائیکہ عالم فاضل بھی نہ ہو چنانچہ آج کل جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں ان کا مبلغ علم بھی تو کچھ نہیں۔ بس کچھ تاریخیں پڑھ لیں کچھ فلسفہ پڑھ لیا اور سمجھنے لگے کہ ہم بہت بڑے محقق ہیں۔ جب اپنے نزدیک محقق ہو گئے تو پھر یہ خیال غالب ہو گیا کہ جو ہماری رائے کے خلاف ہے وہ واقع اور تحقیق کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ جو چاہا شبہ پیش کر دیا۔

باغی سلطنت

چنانچہ یہ بھی ایک شبہ پیش کر دیا جو میں نے عرض کیا۔ میں نے اس لیے اس مثال کی ضرورت سمجھی کہ یہ شبہ رفع ہو جائے ورنہ فی نفسہ یہ مسئلہ بالکل صاف تھا اور محتاج مثال نہ تھا۔ تقریر یہ ہے اس مثال کے انطباق کی کہ میں صاحب اعتراض اور صاحب شبہ سے گورنمنٹ کا قانون پوچھتا ہوں کہ ایک شخص ہو نہایت لائق جس کو تمام کمالات اعلیٰ درجہ کے حاصل ہوں مگر باغی ہو یعنی سلطنت کی اطاعت نہ کرتا ہو اس کی سزا کیا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ اس کی سزا پھانسی ہے یا عبور دریا شور یا حبس دوام اب ایک شخص ایسے مجرم کے مقدمہ کی پیشی کے وقت عدالت میں حاضر ہے، جج صاحب نے سزائے حبس دوام کا حکم سنایا آپ نے سنا۔ سن کر آپ نے پوچھا! کیوں صاحب اس پر کیا الزام لگایا گیا ہے اور کون سی دفعہ قائم کی گئی ہے جو اس قدر سخت سزا تجویز کی گئی۔

جج صاحب نے کہہ دیا اس نے بغاوت کا جرم کیا ہے اس لیے اسے حبس دوام کی سزا دی گئی ہے۔ یہ سن کر آپ کیا فرماتے ہیں کہ حضور کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص ایم اے ہے ایل ایل بی ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیے ہوئے ہے۔ انگریزی ایسی جانتا ہے کہ انگریز بھی نہیں جانتے۔ جج صاحب نے کہا ہاں معلوم ہے، پھر کہا حضور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص سائنس کا بھی بڑا ماہر ہے اس نے وہ وہ صنعتیں ایجاد کی ہیں کہ اہل یورپ بھی دنگ ہیں،

کہاہاں سب معلوم ہے' پھر کہا بڑے ہی غضب کی بات ہے اور بڑی بے انصافی ہے کہ اس کی ساری لیاقتیں پس پشت ڈال دی گئیں اور ساری قابلیتیں خاک میں ملادی گئیں۔ فقط اتنی سی بات پر کہ باغی ہے حبس دوام کی سزا دیدی گئی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جج کے اس حکم پر کبھی وسوسہ بھی ذہن میں نہ آئے گا کہ ایسی سخت سزا انصاف کے خلاف ہے یا ترحم کے خلاف ہے کیونکہ سمجھ لوگے کہ بغاوت جرم ہی ایسا ہے جس کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ اگر اس صاحب شبہ کو جج کے فیصلہ پر بھی وسوسہ آتا تو خیر یہ کہا جاسکتا تھا کہ بیچارہ کیا کرے اس کی سمجھ ہی موٹی ہے اس لیے جو وسوسہ خدا پر پہنچا وہی جج پر بھی پہنچا مگر غضب تو یہ ہے کہ جج کے فیصلے پر تو کبھی وسوسہ نہ آیا اور خدا نے جو اسی کے مثل فیصلہ فرمایا اس پر شبہ پیش کردیا۔ پھر اے صاحبو! یہ کیسا ایمان ہے اور یہ کیسا اسلام ہے کہ اس شخص کے نزدیک جج کا فیصلہ تو عقل کے قریب اور خدا کا فیصلہ عقل سے بعید''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' (اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں) ایک شخص سلطنت سے بغاوت کرے تو اس کے سارے اعمال اور اس کی ساری خوبیاں ضبط ہونا تو معقول جو خدا سے بغاوت کرے اس پر شبہ اور اس شبہ کے جواب کے بعد ایک شبہ اور کیا جاتا ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اگر خدا سے بغاوت کرے تو واقعی اس کے سارے اعمال حبط ہی ہوجانے چاہئیں۔

انکار رسالت کفر ہے

لیکن اگر کوئی خدا کو بھی مانتا ہو مگر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتا ہو تب تو اعمال کے حبط ہوجانے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی اور اس شبہ میں بہت سے لوگ مبتلا پائے گئے کہ وہ انکارِ رسالت کو کفر نہیں سمجھتے میں کہتا ہوں کہ اول تو نصوص قطعیہ اس کی تکذیب کرتی ہیں اور جن نصوص سے یہ شبہ واقع ہوا ہے ان کی صحیح تفسیر ان لوگوں نے نہیں سمجھی یہ تو کلام ہے نقل و تحقیق کی حیثیت باقی عقل و الزام کی حیثیت سے یہ جواب ہے کہ جو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا وہ واقع میں خدا کو بھی نہیں مانتا اور مان بھی نہیں سکتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ خدا کے ماننے کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کو ماننا اسے کہتے ہیں کہ جیسا خدا ہو ویسا ہی اسے اعتقاد کرے' اگر کسی نے اور طرح کا مان لیا تو اس نے

خدا کو نہیں مانا بلکہ اپنے خیال کو مانا مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں بادشاہ کو مانتا ہوں اور کوئی پوچھے کہ خبر بھی ہے بادشاہ کیسا ہے اور وہ کہے کہ اس کے ایک آنکھ ہے ایک ٹانگ ہے ہاتھ دونوں کٹے ہوئے ہیں حالانکہ دراصل بادشاہ بہت حسین وجمیل ہے اور اس میں کوئی نقص یا عیب نہیں ہے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس نے بادشاہ کو مانا' بادشاہ کو کہاں مانا' بادشاہ تو نہایت حسین وجمیل ہے اور سب نقائص سے پاک ہے اس نے تو اپنے خیال سے ایک نیا بادشاہ تصنیف کرلیا ہے اس کو مانا ہے تو خدا کے ماننے کے یہ معنے ہیں کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی اسے مانے یعنی تمام کمالات کے وجود کا اس میں اعتقاد رکھے اور چونکہ من جملہ کمالات کے ایک کمال سچا ہونا بھی ہے اس لیے اگر خدا کو سچا نہ مانے تو یہ بھی خدا کا نہ ماننا ہی ہوا بلکہ انکار ہی ہوا۔ جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ دیکھئے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتے ہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لہٰذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا تو خدا کو جھوٹا سمجھا اور اس کے ایک کمال کا انکار کیا یعنی سچے ہونے کا ان سب مقدمات سے یہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ جب کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانا تو وہ خدا سے باغی ہوا اور اس کو تسلیم ہی کرلیا گیا ہے کہ جس نے خدا سے بغاوت کی وہ مستحق ہے عذاب ابدی کا۔ تو صاحبو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باغی ہونا مستلزم ہے خدا سے باغی ہونے کو اور اس کا جرم عظیم ہونا اوپر مذکور ہو چکا ہے اسی طرح غیر باقی مجرموں کی سزا میں یہ اعتراض اور وسوسہ بھی کسی کو نہیں ہوتا کہ صاحب فلانا مجرم تھا اس نے جوا کھیلا تھا یا ڈکیتی کی تھی یا چوری کی تھی اس کو بھی سزا تو دی مگر اس کے برابر نہیں جس نے بغاوت کی تھی' دو برس کی قید بھگت کر پھر رہا ہوگیا اور پھر آ کر اپنے بیوی بچوں کی صورت دیکھ لی۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کھلی ہوئی بدتہذیبی کے افعال کے مجرموں کے ساتھ تو ایسی نرمی برتی گئی جن کے اعمال اور اخلاق سب نہایت ناگفتہ بہ اور ایک شخص اتنا صاحب کمال اور ذی لیاقت و وجاہت اور اس کو سزائے حبس دوام دیدی گئی ہے اور دوسرے مجرموں کو بھی قید کی سزا تو دی گئی لیکن ان کی سزا میں ایک ایسی میعاد بھی ہے جس کے بعد رہائی ہو جائے گی لیکن یہ بے چارہ باغی کبھی رہا ہی نہ ہوگا' ساری عمر جیل خانہ ہی میں گزرے گی' ہمیشہ کے لیے اپنے دوست احباب' بیوی بچوں سے جدا کر دیا گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے سو یہ شبہ کسی کو نہیں

ہوتا' اگر کسی کو یہ شبہ ہو بھی اور جج سے کوئی یہ سوال بھی کرے تو وہ کیا کہے گا؟ یہی کہے گا کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ ایک گو قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے مگر صاحب قانون کی حکومت کو تو تسلیم کیے ہوئے ہے یعنی گورنمنٹ سے تو بغاوت نہیں کرتا اور دوسرا تو سرے سے گورنمنٹ ہی کو اڑانا چاہتا ہے۔ گورنمنٹ کو گورنمنٹ ہی تسلیم نہیں کرتا تو اس دوسرے شخص کا جرم کسی طرح قابل معافی ہے ہی نہیں کیونکہ یہ تو گورنمنٹ کے وجود ہی کو مٹانے کی فکر میں ہے اور پہلا شخص گو قانون کے خلاف کرتا ہے مگر صاحب قانون کو تو مٹانا نہیں چاہتا' بس وہ یہی جواب دے گا' اب میں پوچھتا ہوں کہ اس کا یہ جواب معقول ہے یا نہیں؟

حیرت اور تعجب کی بات

یعنی ہمارے معترضین کے نزدیک بھی معقول ہے یا نہیں؟ ضرور معقول ہوگا کیونکہ سراسر ان کی عقل کے موافق ہے تو حیرت کی بات ہے کہ ایک جواب جج صاحب کے منہ سے نکلے تو وہ معقول اور وہی جواب مولویوں کے منہ سے نکلے تو وہ تشدد ہے تعصب ہے غلو ہے۔ بس نہ معلوم مولوی ہونا جرم ہے کہ جو ان کے منہ سے نکلے اسے ضرور جھٹلانا خواہ وہ کیسے ہی ٹھکانے کی بات کہیں اور اگر وہی بات کسی تعلیم یافتہ جدید کے منہ سے نکلے تو فوراً "آمنا و صدقنا" (ہم نے مان لیا اور یقین کرلیا) میرے ایک مخدوم فارسی کے استاد اپنا واقعہ بیان فرماتے تھے کہ کسی حاکم نے ایک فیصلہ کیا جو اتفاق سے عالمگیریہ کے ایک جزئیہ کے موافق تھا۔ گو عالمگیریہ کے جزئیہ کی بناء پر نہیں تھا۔ مولانا موصوف نے کسی واقعہ کے متعلق ایک مسئلہ کسی مجمع میں بیان فرمایا کہ عالمگیریہ میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے بڑے بڑے مدعیان عقل وہاں موجود تھے کسی نے التفات بھی نہ کیا' مولانا بڑے ظریف حاضرین سے فرمانے لگے کہ حال ہی میں ایسے ہی واقعہ کے متعلق ایک مقدمہ ہوا ہے' صاحب کلکٹر کے یہاں انہوں نے بھی اسی کے موافق فیصلہ کیا ہے یہ سنتے ہی سب چوکنے ہوگئے اور اصرار شروع ہوا کہ ہاں صاحب ذرا فرمایئے تو کلکٹر صاحب نے کیا فیصلہ کیا۔ مولانا نے وہ فیصلہ بیان کیا جو کہ عالمگیریہ کے اس جزئیہ کے موافق تھا جس کو مولانا اس سے قبل بیان فرمارہے تھے اور کوئی التفات بھی نہ کرتا تھا' سب نے سن کر تسلیم کیا۔ انہوں نے کہا کہ

جناب یہ وہی تو بات ہے جو عالمگیریہ میں لکھی ہوئی ہے مگر عالمگیریہ پہلے معتبر نہ تھی اور اب انگریزی فیصلہ کی موافقت سے معتبر ہوگئی۔

حیرت اور تعجب کی بات ہے صاحبو! یہ تو حال ہے اور پھر کہتے ہیں کہ ہم لوگ مومن ہیں ہم مسلمان ہیں۔ یہ کیا ایمان ہے اور کیا اسلام ہے تو اس مذاق کے بھی لوگ اس زمانہ میں کثرت سے موجود ہیں اس لیے میں نے یہ مثال عرض کی تھی کہ اسلام کا مدار نجات ہونا ایسا ہی ہے جیسے سلطنت. کا فرمانبردار ہونا مقبولیت کا مستحق بننا اور اگر ایسا شخص مجرم بھی ہے تو اپنے جرموں کی سزا بھگت بھگتا کر انجام کار برأت حاصل کرسکتا ہے یا بے سزا پائے ہی محض بطور مراحم خسروانہ کے بری کیا جاسکتا ہے۔ برخلاف باغی کے جس کی سزا کے منقطع ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں بجز تصدیق حکومت و اطاعت اور اعلان وفاداری کے' اب اس عقیدہ کو دیگر عقائد سے ملایا جائے تو یہ ثابت ہوگی کہ اگر کسی عقیدہ کا اصل الاصول نام ہونا زیبا ہے تو وہ فقط اسلام ہے تو اسلام کو اس طرح اولیت اور تقدم کا حق حاصل ہے اور چونکہ اس مقام پر یہ میرا اول بیان ہے اس لیے پہلے اول الاعمال ہی کا بیان کرنا زیادہ مناسب ہوا۔ یہ جو کچھ میں نے اب تک اسلام کی بابت بیان کیا ہے یہ تو علم و عقیدہ کے متعلق ہے جس میں بفضلہ اکثر مسلمان غلطی سے محفوظ ہیں اور جو غلطی اس کے متعلق نو تعلیم یافتہ حضرات کرتے ہیں اس کو الحمدللہ بوجہ احسن رفع بھی کر دیا گیا ہے لیکن اسلام کی بابت ہم لوگوں نے ایک عملی غلطی بھی کی ہے اس وقت زیادہ تر اس کا رفع کرنا مقصود ہے۔ وہ عملی غلطی یہ ہے کہ ہم سب کے سب اس کے معتقد ہیں کہ ہم مسلمان ہیں صاحب اسلام ہیں اور بحمداللہ یہ اعتقاد ایک حد تک سچا بھی ہے مگر ایسا ہی سچا ہے جیسا کہ میں ایک مثال کے ضمن میں عرض کرتا ہوں۔

اے صاحبو! کیا کہا جائے ہزاروں غلطیوں میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مالدار کا ایک لفظ ہے اس کو ذہن میں محفوظ رکھ کر میرے سوالات کا جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کسی کے پاس دس ہزار روپیہ ہے کسی کے پاس پانچ ہزار ہے کسی کے پانچ لاکھ ہے کسی کے پاس ایک لاکھ ہے کسی کے پاس پچاس ہزار ہے وعلیٰ ہذا اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ ان

میں سے کس کو مالدار کہیں گے اور کس کو نہیں؟ آپ ضرور ہر ایک کی بابت یہی کہیں گے کہ علی قدر مراتب یہ سب مالدار ہیں اور اگر آپ سے پوچھا جائے کہ سو روپیہ کے مالک کو بھی آپ مالدار سمجھیں گے یا نہیں؟ تو آپ کہیں گے کہ ہاں یہ بھی ایک درجہ مالدار ہونے کا ہے اور اگر کسی کے پاس صرف پچاس ہی روپیہ ہوں تو اس کے متعلق بھی آپ کہہ دیں گے کہ ہاں یہ بھی کچھ درجہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک پیسہ والے کے بارے میں آپ سے یہی سوال کیا جائے کہ وہ بھی مالدار کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو آپ پوچھنے والے پر ہنسیں گے کہ آپ بھی عجب عقلمند ہیں کہیں ایک پیسہ کے مالک کو بھی مالدار کہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی مال میں مال ہے۔ مگر حضرت میں پوچھتا ہوں کہ مال کہتے ہیں کس کو؟

مالدار کی مثال

مال کی تعریف آخر یہی تو ہے "عین ینتفع بہ" یعنی جس عین سے یا یوں کہیے جس ذات سے کوئی نفع حاصل کیا جا سکے پھر میں کہتا ہوں ایک پیسہ سے بھی تو نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک پیسہ کا تیل لے کر ڈبہ میں ڈال دو پھر دیکھو رات بھر گھر میں کیسا اجالا رہتا ہے۔ تو کیوں صاحب جب اس پیسہ پر مال کی تعریف صادق آتی ہے تو اس کے مالک کو مالدار کیوں نہ کہا جائے گا۔ آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ بھائی مالدار تو اسی کو کہیں گے جس کو قابل اعتبار درجہ مال کا حاصل ہوا۔ اگر ایک پیسہ والا بھی اپنے کو مالدار کہے یا سمجھے تو شرم کی بات ہے اس کا اپنے آپ کو مالدار کہنا لغۃً صحیح ہے مگر معتد بہ مالدار تو اسی کو کہیں گے جس کے پاس معتد بہ مقدار مال کی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ معتد بہ مقدار کے مالک کو مالدار کہتے ہیں۔ غرض یہاں تو آپ نے یہ منطق سیکھ لی کہ مطلق کو اس کے اطلاق پر نہ رکھا بلکہ اس کو مقید کیا ایک مقدار خاص کے ساتھ اس مقدار تک پہنچنے سے قبل اس کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اس کو مالدار کہیں۔ سو یہاں تو آپ نے یہ منطق یاد کر رکھی ہے اور اسی کی نظیر میں آپ ہم سے الجھتے ہیں۔ بس ایک کلمہ پڑھ کر دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کہتے ہیں کہ آخر مسلمان کہتے کس کو ہیں؟ اس کو جس کے پاس اسلام ہو۔ سو ہم کلمہ گو ہیں ہی اس لیے ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ہاں مسلمان وہی ہے جس کے پاس اسلام ہو لیکن کیسا اور کس درجہ کا

اسلام ہو؟ آیا کوئی خاص درجہ اسلام کا مراد ہے یا کسی درجہ کا ہو۔ آپ کے نزدیک کافی ہے کچھ خبر بھی ہے اس کے درجات کتنے ہیں حضرت اس کے بہت سے درجات ہیں جن میں سے اس وقت صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو سب مانتے ہیں۔ ایک ادنیٰ درجہ ایک اعلیٰ درجہ ادنیٰ درجہ اسلام کا کسے کہتے ہیں۔

اسے کہتے ہیں کہ جس کے بدون مسلمان ہی نہ کہا جا سکے اور وہ کون سا ہے۔ وہ اس کا قائل ہونا "اشهدان لا اله الا الله وحده لاشريک له واشهدان محمداً عبده و رسوله" (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کوئی اس کا بھی قائل نہ ہو تو وہ کافر ہے۔ یہ تو گویا ادنیٰ درجہ ہوا اسلام کا اب آگے اس کی تکمیل ہوتی ہے نماز سے روزہ سے کثرت ذکر سے خشیت سے معرفت سے صبر سے توکل سے اخلاص سے وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ سب مکمل ہیں۔ اسلام کے یہ اسلام کا اعلیٰ درجہ ہوا تو یہ دونوں درجے اسلام کے وہ ہیں جن کو سب مانتے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہمارا آپ کا اسلام کون سے درجہ کا ہے اس پر کوئی شیخی باز کہنے لگے کہ جو کامل الاسلام کہے جاتے ہیں وہی کون سے تیر چلا رہے ہیں ان میں ہم سے زیادہ کیا چیز ہے یہی نماز روزہ وہ بھی کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں پھر ہم سے کس درجہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے مگر حضرت آپ ہیں کس ہوا میں ہم میں ان میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے پاس تو محض صورت ہے نماز روزہ کی معنی ہیں نہیں اور اس میں میں اپنے آپ کو بھی داخل کرتا ہوں قطع نظر تواضع سے کیونکہ یہ موقع تواضع کا نہیں ہے اس وقت تو بیان واقع کا کیا جا رہا ہے۔ غرض ہم لوگ ادنیٰ درجہ کے مسلمان ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس ادنیٰ درجہ کے اسلام پر آخر آپ کیوں کفایت کرتے ہیں آگے کا درجہ کیوں نہیں حاصل کرتے۔ جیسا کہ مال کے ادنیٰ درجہ پر کوئی قناعت نہیں کرتا۔

ایک نئی منطق اور اس کا جواب

یہاں پر آ کر اپنی وہ منطق سب بھول گئے بلکہ ایک نئی منطق ایجاد کی ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحبو! حدیث شریف میں آیا ہے "من قال لا اله الا الله فدخل الجنة"[1] جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں داخل ہو گیا سو اس درجہ کا اسلام ہمارے پاس ہے ہی باقی ہم سے نماز

---

[1] (الترغيب والترهيب ۲: ۴۲۲، مجمع الزوائد ۱: ۱۸)

روزہ کا جھگڑا نہیں ہوتا' اجی جنت میں داخل ہونا ضروری چیز ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما ہی چکے ہیں کہ "من قال لا الہ الا اللّٰہ فدخل الجنۃ" میں کہتا ہوں کہ صرف دخل ہی فرمایا ہے یا یہ بھی فرمادیا ہے کہ دخل دخولا اولیا۔ یعنی فوراً جنت میں داخل ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جنت میں جائے گا لیکن کب جائے گا اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ سزا کے قبل جائے سو آپ کو کیا حق ہے اس کی تعیین کا۔ کیا کوئی دلیل آپ کے پاس ہے اس کی دلیل تو کیا ہوتی بلکہ الٹی اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے۔ حدیث میں شراب خوری پر' سود لینے پر' جھوٹ بولنے پر' حقوق ضائع کرنے پر' غیبت پر' چغل خوری پر' بدنظری وغیرہ پر سخت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ پھر آخر یہ حدیثیں کیا بیکار ہیں یا (نعوذ باللہ) سچی نہیں ہیں یہ بھی سچی ہیں اور یہ حدیث بھی سچی ہے "من قال لا الہ الا اللّٰہ فدخل الجنۃ" دونوں سچی ہیں کیونکہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ ہیں۔ لہٰذا میں دونوں کو جمع کرتا ہوں کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تعارض اور تناقض ہو نہیں سکتا تو لامحالہ وہ مضمون جنت میں داخل ہونے کا بھی ٹھیک ہے اور وہ دوزخ کی وعیدیں بھی سچی ہیں۔ یہ دونوں قسم کی حدیثیں دو طرح سچی ہو سکتی ہیں یعنی عقلاً دو احتمال ہیں ایک صورت یہ کہ اول اپنے معاصی کی سزا پانے کے لیے دوزخ میں داخل کیے جائیں پھر ایمان کی وجہ سے وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کردیئے جائیں اور ایک صورت یہ کہ پہلے جنت میں داخل کیے جائیں پھر دوزخ میں لیکن اس کا تو کوئی قائل ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ تو نصوص قطعیہ سے منفی ہے کہ جنت میں پہنچا کر پھر وہاں سے نکالا جائے۔ ضرور دوسری شق کو متعین کیا جائے گا اور وہی نصوص کے مطابق بھی ہے۔ یعنی پہلے دوزخ میں سزا پا کر پھر جنت میں داخل کیے جائیں گے خواہ ایک دن کے بعد یا ہزار برس کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اور وہاں کا تو ایک دن بھی یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے تو ہزار برس تو کیا کچھ ہوگا۔

چنانچہ ارشاد ہے "وان یوما عند ربک کالف سنۃ مما تعدون" (اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن برابر ایک ہزار سال کے ہے تم لوگوں کے شمار کے موافق) یعنی ہمارے یہاں کا ایک دن تمہارے یہاں کے ایک ہزار برس کے برابر ہے اگر وہاں ایک دن کی

بھی حوالات ہوگئی تو یہاں کے ہزار برس کی قید کے برابر سمجھئے لیکن ہر حال میں کبھی نہ کبھی ختم تو ضرور ہوگا مگر قبل جنت کے جو جہنم میں سزا ہوئی ہے کیا وہ ایسی ہی سزا ہے جیسی دنیا کی جس کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ اگر ایسی ہی ہوتی تو خیر یہ کہہ سکتے تھے کہ چلو دوزخ ہی میں چند روز رہ آئیں گے مگر اے صاحبو! وہاں کی سزا کا کیا ٹھکانہ ہے اللہ تعالیٰ بچاوے جن اعمال کو لذت کے لیے اختیار کیا تھا ان سے اس قدر لذت نہیں پہنچی جس قدر ان کی سزا کے اندر کلفت ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ عمر پچاس ساٹھ برس کی ہوئی پھر اس میں بھی جو انتفاع کے قابل زمانہ ہوتا ہے وہ تو چند ہی ایام ہوتے ہیں اور گناہ سے لذت اٹھانے کی تو کچھ ساعتیں ہی ہوتی ہیں اس کے بعد کچھ بھی نہیں تو اس کے لیے ہزار برس کی قید جو کہ ادنیٰ درجہ کی ہے گوارا کرنا کون سی عقل کی بات ہے۔ بہرحال اس حدیث "من قال لا الہ الا اللّٰہ فدخل الجنۃ" سے تمسک کرنا بے فکری کے لیے کافی نہیں۔ یہ تو ایک عقیدہ کی تعلیم ہے کہ مومن خلود فی النار سے محفوظ رہے گا کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور داخل ہوگا مگر یہ کہاں کہا گیا ہے کہ اس کو اس طرح گناہوں کے کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس طرح سے جان کر اس کو گناہوں کے کرنے میں استعمال کرنا یہ تو بڑی ہی ناشکری اور دلیری بلکہ گستاخی ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہاں وہ منطق کہ ادنیٰ درجہ پر قناعت نہیں کی جاتی بھول گئے اور ادنیٰ درجہ کے اسلام کو مسلمان بننے کے لیے کافی سمجھ لیا تو ایسے کو مسلمان کہنا ایسا ہی ہے جیسے ہم ایک پیسہ کے مالک کو مالدار کہنے لگیں۔ گو جیسے وہاں باعتبار اطلاق کے ایسے شخص پر مالدار ہونا صادق آتا ہے اسی طرح یہاں بھی ایسے شخص پر مسلمان ہونا صادق آتا ہے مگر جیسا کہ وہاں اس پر نظر ہے کہ جب معتدبہ مقدار مال کی نہ ہوئی تو وہ کیا مال ہوا ایسے ہی یہاں نظر چاہیے کہ جب معتدبہ درجہ اسلام کا نہ ہوا تو وہ کیا اسلام ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدار معتدبہ کو نفی ذات کی صورت میں تعبیر فرمایا۔

تارک نماز کا حکم

چنانچہ ارشاد ہے "من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر"[1] لیجئے اب بہت صاف معنی ہوگئے اس حدیث کے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نماز جان کر چھوڑ

---

[1] (کنز العمال: ۵۰۰۸، اتحاف السادۃ المتقین)

دے وہ مسلمان نہ رہا اس کی اور توجیہوں میں محض تکلف ہے لیکن سیدھی تاویل جو جمہور علمائے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے موافق ہے وہ یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال اسلام کی نفی کی ہے مطلق نفی اسلام مراد نہیں۔ جمہور کی یہی توجیہ ہے۔ میں نے اس کو محاورات میں تعبیر کر دیا ہے اب اس کے معنی بالکل صاف ہو گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایسا ہی کافر فرمایا ہے جیسے ہم پیسہ کے مالک کو غیر مالدار کہہ دیتے ہیں۔ گو فی نفسہ نہ وہ علی الاطلاق کافر ہے نہ یہ علی الاطلاق غیر مالدار تو جیسے یہ حکم صحیح ہے اور اس میں کسی کو شبہ نہیں ہوتا نہ کسی مولوی کو نہ طالب علم کو نہ کسی فلسفی کو نہ عامی کو اسی طرح یہاں بھی نہ ہونا چاہیے تو معلوم ہوا کہ کمال اسلام وہ چیز ہے جس کی نفی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی الاسلام سے تعبیر فرمایا تو صاحبو! وہ درجہ اسلام کا ہم کو کیا خوش کر سکتا ہے جس کو نفی اسلام سے تعبیر کیا جا سکے اور واقعی کیا مسلمان ہیں کہ نہ نماز نہ روزہ نہ حج نہ زکوٰۃ اور کہنے کو مسلمان۔ مگر اس مسلمان نے یہ فتویٰ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سنا کہ جب نماز کو عمداً ترک کر دے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے اسلام سے کیونکر تسلی ہو جاتی ہے مگر مال کے اس درجہ سے تسلی نہیں ہوتی۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس اتنی مقدار مال کی تھی کہ وہ مالدار مشہور تھا ایک دن اس کی عدم موجودگی میں کہیں گھر کے اندر چور گھس آئے اور جو کچھ اندوختہ تھا سب لے گئے صرف دو چار پیسہ جو اتفاق سے اس کی اچکن کی جیب میں تھے وہ تو پڑے رہے باقی سارا مال و متاع جاتا رہا اب اس پر وہ کبھی یہ نہ کہے گا کہ اجی کامل مالدار اگر نہ رہا نہ سہی کیا غم ہے۔ کسی درجہ میں تو مالدار اب بھی ہوں ہی چنانچہ جیب میں چار پیسے موجود ہیں وہاں کبھی جی کو تسلی نہیں ہوتی کہ چار پیسے تو موجود ہیں بلکہ اگر کوئی سمجھائے بھی کہ کیوں غم کرتے ہو بلا سے زیادہ مال نہ رہا چار پیسے تو موجود ہی ہیں یہ بھی تو آخر ایک مقدار مال ہی کی ہے اور اس کے اعتبار سے اب بھی تم مالدار ہی ہو تو کیا اس تقریر سے اس کی تسلی ہو جائے گی یا طیش میں آ کر یہ کہے گا کہ آپ بھی عجب چیز ہیں آپ کے نزدیک یہ مال ہو گا۔ بھلا چار پیسے بھی کوئی مال ہے میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے بجز ان چار پیسوں کے اور ان سے کیا خاک کام چل سکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مال تسلی بخش نہیں ہے تو وہ اسلام کیونکر تسلی بخش ہو گیا۔ آخر وجہ فرق کیا ہے؟

امام غزالیؒ کے ناصحانہ اشعار

اسی کو مولانا غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ارى الملوك بادنى الدين قدقنعوا وما اراهم رضوا فى العيش بالدون

یعنی میں دیکھتا ہوں امراء اور بادشاہوں کو کہ وہ ادنیٰ درجہ کا دین لے کر قناعت کر لیتے ہیں نماز پڑھنے لگے تو اپنے نزدیک بہت بڑے عابد زاہد ہوگئے اور اگر کہیں کسی نے کچھ کتابیں بھی پڑھ لیں تب تو پھر کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوگئے۔ ایک احمق قوم کا شخص تھا اس کا بیٹا ایک عالم کے پاس کچھ عربی فارسی پڑھنے لگا' اس کے یہاں سات پشت سے بھی کوئی پڑھا لکھا شخص نہ گزرا تھا۔ جب اس نے ہدایت النحو شروع کی تو آپ گئے مولوی صاحب کے پاس اور کہنے لگے کہ امی بہت نہ پڑھادیجئو' کہیں یہ لوٹ پوٹ پیغمبر نہ ہوجائے۔ (نعوذ باللہ) صاحبزادہ صاحب نے ہدایت النحو کیا شروع کی اس کے نزدیک گویا پیغمبری ملنے لگی (نعوذ باللہ) تو اوچھے لوگ کیا سمجھیں کہ علم کیسا ہوتا ہے۔ اس کے خاندان میں کوئی یہ بھی نہ جانتا تھا کہ علم کہتے کسے ہیں اسی طرح اے صاحب ہم نے پانچ وقت کی نماز کیا پڑھ لی جنت کے خریدار ہی بن بیٹھے۔ بس مطمئن ہیں کہ نیلام ہمارے ہی نام ختم ہوگا جبکہ اتنی بڑی قیمت بھی ہم نے لگادی ہے۔ ایک طالب علم کسی معقول خانہ کے پڑھے ہوئے تکمیل کی غرض سے دیوبند آئے۔ دیوبند میں ماشاءاللہ نمازوں کا بڑا اہتمام ہے کوئی تاکید نہیں' کوئی جرمانہ نہیں مگر علم دین کی یہ برکت ہے کہ خود بخود سب طلباء پابند ہیں۔ انہوں نے معقول خانہ میں بھلا یہ رنگ کہاں دیکھا تھا۔ کہنے لگے میاں نمازوں کا کچھ ٹھکانہ بھی ہے ہر وقت نماز ہر وقت نماز اے اللہ کہاں کی نمازیں یہاں پھٹ پڑی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب معراج میں پچاس نمازوں کے بجائے تخفیف ہوکر جو صرف پانچ رہ گئی تھیں تو وہ تخفیف دوسری ہی جگہوں میں ہوئی ہے۔ مدرسہ دیوبند میں وہ پچاس کی پچاس ہی قائم رکھی گئیں جہاں دو منٹ گزرے بس چلو نماز کو جہاں پانچ منٹ گزرے بس چلو نماز کو' جان آفت میں آگئی پڑھتے پڑھتے۔ کوئی کہاں تک پڑھے جاوے۔ ان حضرات کو یہ پانچ نمازیں بھی پچاس نظر آتی تھیں تو ایسا شخص اگر پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگے تو یہ نہ معلوم اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگے پھر ایسوں میں سے

خاص کر جو دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ان کی حالت تو کچھ پوچھئے ہی نہیں یعنی ایک جماعت کی جماعت ہے ہم مسلمانوں میں جس نے دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے۔ ان کا مذاق یہ ہے کہ دین تو ادنیٰ درجہ کا بھی کافی ہے مگر دنیا اعلیٰ درجہ کی ہونی چاہیے حالانکہ مذاق یہ چاہیے تھا کہ دنیا لو ضرورت کے موافق اور دین لو کمال کے درجہ کا۔ اسی کو حضرت غزالیؒ نے فرمایا ہے:

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا　　وما اراھم رضوا فی العیش بالدون

فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما　　استغنی الملوک بدنیا ھم عن الدین

یعنی جیسا ان امراء نے یہ کیا ہے کہ تھوڑے سے دین پر قانع ہو گئے ہیں حالانکہ دنیا کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہیں اسی طرح تم یوں کرو کہ دنیا کے ادنیٰ درجہ پر قناعت کر لو لیکن دین کے ادنیٰ درجہ پر ہرگز قناعت نہ کرو بلکہ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے حصول کی فکر میں لگے رہو کیونکہ دین کے درجات کی کوئی انتہا ہی نہیں اس کا اعلیٰ درجہ بھی گویا ادنیٰ ہی درجہ ہے اس کی شان ہے وراء الوراء ثم وراء الوراء مولانا فرماتے ہیں:

اے برادر بے نہایت در گہیست　　ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی اس کی درگاہ بہت ہی بڑی ہے جس منزل پر تیری رسائی ہو جائے اسی پر قناعت کر)

جیسے دنیا میں ترقی کرنے والے برابر کوشش کرتے رہتے ہیں تم دین میں ترقی کی برابر کوشش کرتے رہو۔ کسی وقت چین نہیں چاہیے اور واقعی چین کیسے آ سکتا ہے عاشق کو تو چین مرتے دم تک بھی نہیں۔ اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا نہ سعدی کے کلام کی۔ جیسے جلندر کا مریض پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے)

اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے:

دل آرام بردل آرام جو　　لب از تشنگی خشک و برطرف جو

(محبوب گود میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں)

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند　　　　کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(میں نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے بھی پیاسے ہیں)

اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے:

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدن ہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(راہ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا۔ جیسے انگور کو جتنا کاٹو گے اور بڑھے گا)

دیکھئے تو اگر کوئی ادنیٰ سے مردار عورت پر فریفتہ ہو جائے اور وہ عورت اس کو اپنے وصال سے محفوظ بھی کر دے تو کیا اس کا جی بھر جائے گا' ہرگز نہیں بلکہ وہ یہی کہے گا کہ ہائے عشق کی کوئی انتہا ہی نہیں' ساری عمر بھی میرے پاس رہے تب بھی جی نہ بھرے' جب ایک ادنیٰ سی مردار عورت کے عشق میں یہ حالت ہے کہ ساری عمر بھی وہ پاس رہے تب بھی جی نہیں بھرتا تو مولانا فرماتے ہیں:

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن　　　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن

(اے بندہ خدا تو اپنے اہل وعیال سے صبر نہیں کر سکتا تو اللہ سے کس طرح صبر کر سکتا ہے)

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　　　صبر چوں داری زنعم الماہدون

(اے بندہ خدا تجھے کمینی دنیا سے صبر کرنے کی طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کیونکر صبر کر سکتا ہے)

جب دنیائے دوں سے جی نہیں بھرتا تو خدا سے کیسے جی بھر گیا۔ ایک کلمہ پڑھ کر قناعت کر لی کہ بس بہت ہے دخل الجنۃ کا وعدہ مرتب ہو ہی جائے گا۔ اے صاحبو! دخل الجنۃ بالکل سچ ہے مگر اس کے قبل دوزخ کیسی ہے کچھ دیکھتے بھی ہو تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مالدار اس کو کہتے ہیں جس کے پاس معتدبہ مال ہو اسی طرح مسلمان اس کو کہتے ہیں جس کے پاس معتدبہ اسلام ہو اس غلطی میں عام طور پر لوگ مبتلا تھے اس لیے اس کا بھی رفع کرنا مقصود تھا۔ غرض یہ بھی وجہ ترجیح تھی اس آیت کے اختیار کرنے کی۔

اسلام کی حقیقت

تو غرض اس آیت کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس میں جو مضمون مذکور ہے اس میں حق جل وعلاشانہ نے اسلام کی حقیقت بتائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے تو فرماتے ہیں "ومن

یرغب عن ملة ابراهیم الا من سفه نفسه" فرماتے ہیں کون شخص ایسا ہے جو اعراض کرے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے ابراہیم علیہ السلام کا طریق تو ایک ایسی ملت تھا اور ایک ایسا مشرب تھا کہ کون سا مقبول بندہ ہے جو اس سے روگردانی کرے' اعراض کرے اباء کرے استغناء کرے' اس کو ترک کرے یا اس سے ہٹ جاوے۔ سوا اس کے کوئی ایسا نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو نفس کی قدر جانے گا وہ اس کو نفع پہنچائے گا اور ضرر سے بچائے گا کیونکہ نفس کی یہی قدر ہے اس کو نفع پہنچانا اور اس کو مضرت سے بچانا تو جو اپنے نفس کی قدر جانے گا وہ ملت ابراہیمی کو ضرور اختیار کرے گا اور کیوں اختیار کرے گا جب وہ چیز ہی اس درجہ کی ہے کیونکہ اس کی ہی برکت سے ابراہیم علیہ السلام اس درجہ کو پہنچے جس کو فرماتے ہیں "ولقد اصطفیناه فی الدنیا" یعنی ہم نے انہیں مقبول بنایا تھا دنیا میں اور حرف تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں "وانه فی الاخرة لمن الصالحین" اور آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہیں یعنی اس ملت کی برکت سے وہ دنیا میں بھی مقبول تھے اور آخرت میں بھی مقبول ہیں تو وہ ملت ابراہیم ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ابراہیم علیہ السلام ایسے درجہ کو پہنچے تو ظاہر ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہوگی۔

تفسیر آیت متلوہ

پھر بھلا ایسی چیز سے کون اعراض کرے گا سوا جاہل کے اور سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی' آگے اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے ارشاد ہے: "اذ قال له ربه اسلم" یعنی جب ان کے رب نے کہا کہ اسلام اختیار کرو اگر کوئی کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اسلام پہلے سے بھی لائے ہوئے تھے تو پھر اس کے کیا معنی؟ تو یہ سمجھو کہ یہ کہنا ایسا ہے جیسے میاں جی نے سبق پڑھا دیا' لڑکے نے اسے یاد کر کے سنا بھی دیا۔ اب دوسرے دن میاں جی نے جب کہا کہ آؤ سبق پڑھو تو وہ کہے کہ ابجی کل تو سبق پڑھ چکا ہوں اور یاد کر کے سنا بھی چکا ہوں۔ یہ آج پھر پڑھانا کیسا تو وہ میاں جی کہتا ہے کہ ارے بھائی کل جو تم نے پڑھا ہے تو کیا ساری کتاب ختم کر لی ہے' کیا اب کچھ پڑھنے کو باقی نہیں رہا' کیا ایک ہی سبق میں علم کی پوری تکمیل کر چکے' ارے ابھی اور بھی تو بہت کچھ پڑھنا پڑھانا ہے تو جس

طرح میاں جی کہتا ہے کہ اور پڑھو اسی طرح یہ ارشاد ہے کہ اسلم مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں لڑکے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کل تو پڑھ چکا تھا اور یہاں کوئی نبی ایسا نہیں جو اسلم کے جواب میں یہ کہے کہ اسلام لا چکا بلکہ جواب میں وہ کہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا یعنی یہ کہا "اسلمت لرب العالمین" کہ میں نے اسلام اختیار کیا۔

یہ ترجمہ کا حاصل ہوا اس میں تعیین ہوگئی اس ملت کی کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ جو آیت میں نے بیان کے لیے اختیار کی ہے اس میں اسلام ہی کی فضیلت مذکور ہوئی ہے اور معلوم ہوا کہ یہی وہ ملت ابراہیمی ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے۔ اب اس کے ساتھ اگر سیاق وسباق کو بھی ملا لیجئے تو اسلام کی فضیلت اور عظمت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی اس کے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ جمع ہو کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اس کا واقعہ مذکور ہے اور اس دوران میں جو دعائیں دونوں نے مل کر مانگی تھیں وہ نقل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم. (اور جبکہ اٹھا رہے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل علیہ السلام بھی کہ اے ہمارے پروردگار یہ خدمت ہم سے قبول فرمائیے۔ بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں)

پھر ان کی دوسری دعا نقل فرمائی ہے: "ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک" تو یہاں اپنے واسطے بھی دعا مانگی ہے کہ اے اللہ ہم کو سچا مسلمان بنا دے۔ دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے اسلام کہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود اتنے بڑے درجہ پر ہونے کے یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں کامل اسلام عطا فرما۔ پھر کتنی بڑی سخاوت اور خیر خواہی ہے کہ اپنے ساتھ ہم نالائقوں کو بھی یاد فرمایا۔ "ومن ذریتنا" اور اے اللہ ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان جماعت بنائیے خواہ وہ اولاد جسمانی ہو یا روحانی اس واسطے کہ ایک جگہ حق سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد "ملت ابیکم ابراھیم" اس کے مخاطب میں

اُمت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری امت کے حسی باپ نہیں ہو سکتے۔ تو لامحالہ یہاں روحانی باپ ہونا مراد ہے اور کہا جائے کہ خاص عرب مخاطب ہیں جن کے آپ جسمانی باپ بھی ہیں تو اس آیت کا سباق وسیاق اس کا مساعد نہیں چنانچہ اوپر "یایھا الذین امنوا" میں عام اہل ایمان کو خطاب ہے کہ خاص عرب کو پھر آگے "سماکم المسلمین" (تمہارا نام مسلمان رکھا) اور تکونوا شھداء واقع ہے جو کہ صفت مشترکہ ہے تمام امت کی تو معلوم ہوا ابیکم عام ہے جسمانی باپ ہونے کو بھی اور روحانی باپ ہونے کو بھی۔ غرض وہ یعنی اہل عرب روحانی اولاد میں ان سب کو بھی اپنے ساتھ دعا میں یاد فرما لیا۔ البتہ اس اولاد میں سے ان کو مستثنیٰ کر دیا جو اسلام کے ساتھ موصوف نہ ہوں۔ چنانچہ یوں نہیں فرمایا "ذریتنا" بلکہ من بڑھا دیا کیونکہ اس کے قبل جو "انی جاعلک للناس" (میں تم کو لوگوں کا مقتداء بناؤں گا) کی بشارت سن کر دعا کی تھی "ومن ذریتی" (اور میری اولاد میں سے) اور اس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا:

"لاینال عھدی الظالمین" (اور یہ عہدہ نبوت خلاف ورزی کرنے والوں کو نہ ملے گا) اس سے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہوں گے جو طریق حق پر نہ ہوں گے اس لیے اس دعا میں ان کو مستثنیٰ کر دیا اس دعا میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ نے لقب اس امت کا مسلمہ رکھا جس کا ذکر ایک تفسیر کی بناء پر دوسری آیت میں بھی ہے "ھو سماکم المسلمین" (اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا) کیونکہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف ضمیر راجع ہو۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے بھی اسلام کو ثابت کیا اور اُمت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے بھی اسلام کی درخواست کی اس سے اسلام کا جو کچھ شرف ثابت ہے ظاہر ہے۔ یہ تو سباق میں نظر تھی آگے سیاق یعنی مابعد میں دیکھیے تو ایک صفحہ کے اندر ہی اندر جا بجا اسلام کا ذکر فرمایا گیا ہے سب سباق وسیاق میں جو میں نے غور کیا تو سات جگہ اسلام کا ذکر ہے۔ ایک "واجعلنا من المسلمین" (اور ہم کو سچا مسلمان بنا) میں دوسرا "امۃ مسلمۃ لک" (ہم کو اپنا زیادہ سے زیادہ مطیع بنا) میں تیسرے "قال لہ ربہ اسلم" (جب ان کے پروردگار نے فرمایا

اطاعت اختیار کرو) میں چوتھے "اسلمت لرب العالمین" (انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی) میں پانچویں "فلاتموتن الا و انتم مسلمون" میں چھٹے "ونحن له مسلمون" میں ساتویں لانفرق بین احدمنهم ونحن له مسلمون "(پس تمہاری موت نہ آئے مگر مسلمان ہونے کی حالت میں، ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی (ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے اور ہم مسلمان ہیں) میں اور محاورات عرب میں سات کا عدد یہ کثرت کا مرتبہ ہے اور جب اور مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو ستر کا عدد استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سات اور ستر کا استعمال کثرت کے لیے احادیث کثیرہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا کیا درجہ ہے کہ ایک ہی مقام پر بار بار اس کا کس طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ نیز اس مقام کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب اسلام ہی رہا ہے تو اسلام اتنی قدر کی چیز ہے۔ صاحبو! اس لیے میں نے یہ مضمون بیان کے لیے اختیار کیا ہے یہ تو اسلام کی اہمیت وعظمت کا ذکر ہوا اب اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے جس کو میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

اسلام کے لغوی اور شرعی معنی

اسلام اصل میں ایک لغت عربی ہے پھر اور قرآن حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں جو اس لفظ کا استعمال کیا گیا تو اس کے ساتھ لغوی معنی پر ایک قید بڑھ گئی ہے اس لحاظ سے دو قسم کا اسلام ہوا ایک تو اسلام لغوی اور ایک اسلام شرعی اسلام لغوی کے معنے میں سپردن سونپ دینا۔ اسی کو تعبیر کر دیتے ہیں گردن نہادن بہ طاعت سے۔ غرض جو تسلیم کے معنی ہیں وہی اسلام کے معنی ہیں۔ مادہ دونوں کا سین لام میم ہے اور ان حروف میں تسلیم کے معنی مودع ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:"بلی من اسلم ای من فوض ذاته الی الله" جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لیے۔ غرض اسلام کے معنی ہیں سپرد کر دینا۔ شریعت نے اس میں ایک اور قید بڑھائی یعنی ایک قید تو اسلم کے معمول میں بڑھائی اور ایک قید اس کے متعلق میں۔ لغوی اسلام میں کوئی قید نہیں اس کے معنی ہیں مطلق سپرد کرنا اور جس کے چاہے سپرد کرنا اب اسلام شرعی کی قیدیں سنئے۔ ایک قید تو یہ ہے کہ اسلم کا معمول کون ہے

خود اپنی ذات اور اس کا متعلق کون ہے اللہ حاصل کیا ہوا اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا۔ یہ ہے حقیقت اسلام شرعی کی۔ اب گویا طالب علمانہ عنوانات سے تو فراغت کر چکا میں نے چاہا تھا کہ ایسے علمی عنوانات بیان میں نہ آنے پائیں کیونکہ یہاں کے اکثر حضرات بوجہ اختلاف زبان ایسے مضامین کو کم سمجھتے ہیں مگر کیا کیا جائے بغیر ایسے طالب علمانہ عنوانات کے مضمون منضبط نہیں ہوتا اور مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اب میں انشاءاللہ بالکل عام فہم تقریر کروں گا۔ مگر غالب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں پھر بھی ایسے الفاظ آ ہی جاویں گے۔ خیر ایک آدھ جگہ اب بھی سہی اب بعد تفسیر اسلام کے یہ دعوے قرآن مجید سے ثابت ہو گیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب اسلام یعنی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرتا رہا ہے اور آپ کو بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے بلکہ آپ کو تو اور امم پر ایک خاص شرف منجانب اللہ عطا ہوا ہے وہ یہ کہ گو تمام اطاعت کرنے والوں کی صف یہی تھی یعنی اسلام مگر لقب خاص آپ کو ہی دیا گیا یعنی اطاعت کرنے والے اور اسلام لانے والے اور امتوں میں بھی تھے مگر لقب امت مسلمہ کسی کا بھی نہیں تھا۔ جتنے مقبولان حق کا لقب عیسائیت تھا ایک زمانہ میں یہودیت تھا وعلیٰ ہذا القیاس اور گو ہر امت کا ایک خاص طریق رہا ہے یعنی باعتبار فروع کے مگر یہ صفت سب میں مشترک تھی کہ سب خدا تعالیٰ کے مطیع بندے تھے۔ حاصل یہ کہ مشترک صفت سب کی اسلام تھی لیکن لقب امت مسلمہ کا خاص آپ کو ہی عطا کیا گیا۔

شرف در شرف

یہ کتنا بڑا شرف ہے پھر شرف پر شرف یہ کہ لقب بھی ملا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطے سے یہاں گورنمنٹ اگر کسی معزز حاکم کے ذریعہ سے آپ کو کوئی لقب دے تو اس میں دو شرف سمجھے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ گورنمنٹ کا دیا ہوا لقب ہے پھر ایک معزز حاکم کے ذریعے سے اس لقب کو ہم تک پہنچایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو لقب عطا فرمایا ہے اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے معزز پیغمبر کی زبان سے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان وہ ہے کہ اگر وہ اپنی رائے سے بھی ہمارے لیے یہ رائے فرما دیتے تب بھی بہت بڑا شرف تھا نہ کہ جب رائے سے بھی نہ ہو بلکہ آپ کی یہ شان ہو:

گفتہ او گفتہ اللہ بود   اگرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ کا فرمان گویا خدا کا فرمان ہے' اگرچہ ایک اللہ کے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی خصوص ہمارے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ حضرات اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا اپنے منہ سے نہیں کہا بلکہ خود حق تعالیٰ نے ان کی زبان کے واسطے سے کلام کیا۔

ایک مقبول الدعوات بزرگ کی حکایت

ایک قصہ میں نے اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے سنا ہے کہ ایک بزرگ تھے ان کے پاس ایک مرد اور ایک عورت اپنے بچہ کو لائے جو مادر زاد اندھا تھا یعنی وہ ماں کے پیٹ ہی سے اندھا پیدا ہوا تھا اور دونوں رونے لگے کہ حضرت اول تو ہمارے اولاد ہی نہ ہوتی تھی' بہت دعائیں کیں' منتیں مانیں تب تو کہیں یہ بچہ عنایت ہوا۔ مگر افسوس ہم لوگ پھر بھی محظوظ و مسرور نہ ہو سکے کیونکہ یہ اندھا پیدا ہوا۔ اب اس کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت جی کڑھتا ہے ہم نے سنا ہے کہ آپ بہت بڑے مقبول الدعوات بزرگ ہیں للہ ہمارے حال زار پر رحم فرمایئے اور دعا کر دیجئے کہ اس کی آنکھیں اچھی ہو جائیں' اس زمانہ کے لوگ آج کل کی طرح بدعقیدہ نہ تھے یہ نہیں کہا کہ آپ اچھا کر دیں بلکہ یہ کہا کہ آپ دعا کر دیں مگر یہ درخواست سن کر بھی کمال انکسار کے غلبہ سے آپ کو جوش آ گیا اور فرمانے لگے بگڑ کر کہ کیا میں عیسیٰ علیہ السلام ہوں جن کی دعا سے اندھے مادر زاد اچھے ہو جاتے تھے' وہ بیچارے مایوس اور شکستہ دل ہو کر چلے گئے۔ بس اس کا جانا تھا کہ ان بزرگ کی زبان پر بے اختیار یہ جاری ہو گیا "ما کنیم ما کنیم" ہم اچھا کریں گے' ہم اچھا کریں گے' لاؤ اس کو بلا کر' خدام کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا تو عیسیٰ بھی نہ بنتے تھے یا اب خدا ہی بننے لگے مگر اس وقت کچھ کہنا بے ادبی تھا' دوڑ کر اس کو بلا لائے' آپ نے اپنا ہاتھ اس بچہ کی آنکھوں پر پھیر دیا' بس ہاتھ پھیرتے ہی آنکھیں اچھی خاصی ہو گئیں اور وہ لوگ دعائیں دیتے ہوئے خوش بخوش اپنے بچہ کو گھر لے گئے' اس کے چلے جانے کے بعد موقع پا کر بعض خاص خادموں نے عرض کیا کہ حضرت یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یا تو دعا کرنا بھی گوارا نہ تھا یا ایک ساتھ ایسے دعوے کے الفاظ فرمانے لگے "ما کنیم

ما کنیم" آپ نے فرمایا بھائی یہ میں نہیں کہتا تھا' بات یہ ہے کہ جس وقت وہ لوگ چلے گئے تو مجھ پر عتاب ہوا کہ تم نے جو عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا تو کیا وہ اچھا کرتے تھے' کیا وہ تھے قادر مطلق اور فاعل حقیقی یا ہم تھے۔ ہم تو اب بھی قادر مطلق ہیں' پھر کیوں نہیں ہم سے عرض کیا' اگر اچھا کرتے تو ہم کرتے تم کون تھے' اس کو مایوس کرنے والے اور اگر اب بھی اچھا کریں گے تو ہم کریں گے' غرض ادھر تو وہ مایوس ہو کر چلے اُدھر مجھ پر یہ عتاب ہوا اور بے اختیار میرے منہ سے وہی الفاظ خدا تعالیٰ کے نکلنے لگے "ما کنیم ما کنیم"۔ میں تو بہ تو بہ یہ الفاظ کیسے کہہ سکتا تھا' میری بھلا کیا مجال ہے وہ تو حق تعالیٰ فرما رہے تھے میں تھوڑا ہی کہہ رہا تھا تو اولیاء اللہ کی بعض بعض کی یہ حالت ہوئی ہے:

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

(پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بٹھا دیا ہے مجھے تو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

انبیاء علیہم السلام کی شان

اولیاء کی جب یہ شان ہے تو انبیاء علیہم السلام کی شان کا تو کہنا کیا۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زبان مبارک سے مسلم کا لفظ نکلنا بہت بڑا شرف تھا نہ کہ خود حق تعالیٰ نے ان کے منہ سے یہ لفظ کہلوایا اور ہم نالائقوں کو یہ لقب دلوایا تو اس سے بڑھ کر اور کیا شرف ہو سکتا ہے تو دیکھا آپ نے یہ کتنا شریف لقب ہے مگر اب بس کسر اتنی ہے کہ ہم محض لفظوں پر قانع ہو گئے بقول مولانا کے

میم واؤ و میم نون تشریف نیست　　　لفظ مؤمن جز پے تعریف نیست

(لفظ مومن میں کوئی بزرگی نہیں ہے یہ میم واؤ نون صرف پہچان کیلئے ہیں)

یہ جو حرف ہیں مومن کے میم واؤ میم نون جن سے لفظ مومن بنا ہے یہ تو محض ایک پتہ کا لفظ ہے باقی میم واؤ میم نون میں کیا رکھا ہے۔ ان سے کہیں کوئی مومن ہوتا ہے ایمان تو قلب سے متعلق ہے مومن تو وہی ہے جس کے دل کے اندر ایمان رچا ہوا ہو' سو واقعی بالکل ٹھیک ہے۔ اے صاحبو! محض لڈو کے لفظ کہنے سے کہیں منہ میٹھا ہو سکتا ہے' محض روپیہ کے لفظ سے کہیں تم جہاز کے مالک بن سکتے ہو۔

ہماری مثال

ہماری تو وہ مثال ہو رہی ہے لفظ پرستی کی جیسے کوئی مہاجن تھا اس کے کوئی منیم جی تھے یا نیب جی تھے ہمیں تحقیق نہیں کہ یہ کیا لفظ ہے وہ بیچارے تھے مفلس ایک دن بیٹھے کارخانہ کا حساب وکتاب کر رہے تھے۔ ایک سائل آیا مگر وہ مہذب تھا' چپکے کھڑا رہا کہ اس وقت مشغول ہیں لالہ جی' فارغ ہوں تو مانگوں۔ دیر تک کھڑا سنتا رہا کہ دو اور دو چار' چار اور چھ دس' دس کا صفر حاصل ایک' دس اور دو بارہ' بارہ کے دو حاصل ایک غرض کہیں حاصل ہوا ایک کہیں ہاتھ لگے دو کہیں حاصل ہوئے چار کہیں ہاتھ لگے چھ' وہ برابر کھڑا گنتا رہا' دس ہوئے' پچاس ہوئے' سو ہوئے' اے اللہ! کتنے حاصل ہوں گے مگر وہ سائل دل میں بڑا خوش کہ یہ تو اقراری مجرم ہے اس سے خوب وصول کروں گا' اس کے پاس انکار کا کیا عذر ہو سکتا ہے۔ جب لالہ جی حساب سے فارغ ہوئے تو سائل نے کہا اجی مجھے بھی کچھ مل جائے' لالہ جی بولے کہ بھائی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں اس نے کہا اجی کیوں جھوٹ بولتے ہو' میرے سامنے ہی تو سینکڑوں ہزاروں حاصل کر چکے ہو کبھی حاصل ہوئے چار کبھی ہاتھ لگے چھ' گھنٹہ بھر سے تو میں یہی قصہ دیکھ رہا ہوں اور میں سب جوڑتا گیا ہوں کئی ہزار تک تو نوبت پہنچ چکی ہے اور پھر کہتے ہو کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ اس نے کہا بھائی مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے لفظوں ہی میں حاصل ہوا ہے واقع میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تو حضرت نرے حساب سے تو کچھ کام چلتا نہیں۔

ایک اور بنئے صاحب تھے وہ محاسب بڑے تھے اور اپنی حساب دانی پر بڑا ناز تھا جیسے ہمیں الفاظ پر ناز ہے وہ اپنے کنبہ کو بیل گاڑی میں سوار کرا کے کہیں لے چلے' راستہ میں ندی آ گئی' آپ نے بہلبان سے کہا کہ ٹھہر جا۔ میں پہلے حساب لگا لوں کبھی گاڑی ڈوب نہ جائے' پنسل کاغذ اور ایک بانس لے کر آپ ندی میں گھسے اور جگہ جگہ بانس سے ناپنا شروع کیا' کنارے کے قریب ناپا تو ٹخنوں تک پانی تھا' آگے چلے تو گھٹنوں تک تھا اور آگے چلے تو کمر تک تھا اور آگے چلو تو ڈبان تھا۔ آپ نے سب کو جوڑ کر اوسط نکالا تو کمر تک نکلا۔ گاڑی بان سے کہنے لگے بس حساب ٹھیک ہے' چل ڈال دے گاڑی کو پانی میں ڈوبے گی نہیں۔ یہ تو وہی ہوئی چڑھ جا بیٹے سولی پر اللہ بھلی کرے گا۔ نوکر نے کہا بھی کہ ایک جگہ پانی ڈوبان بھی تو ہے' اس نے

ڈانٹ دیا کہ تو کیا جانے اوسط کا اعتبار ہوتا ہے کیا ہمارا حساب غلط ہوسکتا ہے' کچھ ڈر نہیں ڈال دے گاڑی کو' وہ بیچارہ آخر نوکر تھا تابعدار تھا اس نے گاڑی کو پانی میں ڈال دیا مگر وہ پانی تو تابع نہیں ہوسکتا تھا ان صاحب کے اوسط کا' غرض تھوڑی دور چل کر حضرت لگے ڈوبنے تو اس وقت بھی بجائے اس کے کہ کوئی تدبیر کرتا نکلنے کی احمق نے پھر بھی کھاتہ لے کر اپنا حساب جانچنا شروع کیا اور جب اوسط کو صحیح پایا تو آپ فرماتے ہیں کہ ارے لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں' حساب تو بالکل صحیح تھا پھر کنبہ کیوں ڈوبا۔

غرض ایسے امور میں ہم اوروں پر ہنستے ہیں یہاں تک کہ انہیں خبطی اور بیوقوف قرار دیتے ہیں لیکن حضرت ہماری مثال بھی اس بنئے ہی کی سی ہے کہ بس الفاظ پر ناز ہے جیسے اسے اپنے حساب پر ناز تھا۔ اپنے نزدیک شیخ چلی کا سا گھر بنالیا اور خوش ہوئے۔ یہ شیخ چلی ایک خبطی سا شخص تھا یا کوئی مسخرا تھا' کسی شخص کو ایک گھڑا تیل کا اپنے گھر لے جانا تھا۔ شیخ چلی کہیں نظر پڑ گئے' کہا چل ہمارا تیل کا گھڑا تو ذرا گھر تک پہنچا دے' دو پیسے دیں گے۔ شیخ جی نے منظور کرلیا اور سر پر گھڑا رکھ کر چلے' اب آپ نے اپنے دل میں منصوبہ گانٹھا کہ آج ہمیں دو پیسے ملیں گے ان سے کوئی تجارت کرنی چاہیے۔ سوچا کہ کون سی صورت اختیار کروں۔ آخر یہ طے کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خرید لوں گا پھر کسی مرغی والے کی خوشامد کر کے مرغی کے نیچے بٹھلا دوں گا' ان میں سے دو بچے نکلیں گے' ایک مرغا ایک مرغی انڈوں میں تھی نا ان کے باوا کی علمداری کہ ان کی مرضی کے موافق ہی بچے نکلیں گے' ایک نر اور ایک مادہ لیکن فرض کرنا کیا مشکل ہے غرض گھر ہی کی مرغی ہوگی اور گھر ہی کا مرغا بہت سے انڈے ہوں گے اور ان کے خوب بچے ہوں گے۔ جب بہت سے بچے ہو جائیں گے تو انہیں بیچ کر بکریاں خرید لیں گے پھر اسی طرح جب بکریاں بہت سی ہو جائیں گی انہیں بیچ کر گائے خرید لیں گے پھر بھینس پھر بھینسوں کو بیچ کر گھوڑوں کی تجارت کریں گے۔ جب ہزاروں روپیہ جمع ہوجائے گا تو ایک بڑا محل تیار کرائیں گے جب کاروبار بڑھے گا اور تجارت کے کام میں خوب ترقی ہوگی تو وزیرزادی سے نکاح کریں گے یہاں تک پہنچے ہیں' حضرت پھر بچہ بھی ہوجائے گا' جب وہ بڑا ہوگا تو اندر سے ہمیں بلانے آئے گا کہ ابا جان چلو اماں جان نے بلایا

ہے' ہم اسے ڈانٹ دیں گے کہ ہشت ہم نہیں چلتے' ہمیں فرصت نہیں ہے۔ اس ہشت کہنے میں آپ نے سر جو ہلایا یا بیہوشی میں گھڑا نیچے گر پڑا اور تمام تیل زمین پر پھیل گیا۔ مالک خفا ہونے لگا کہ ارے کمبخت یہ تو نے کیا حرکت کی تو آپ فرماتے ہیں۔ میاں جاؤ بیٹھو' تم اپنے ذراسے تیل کو لیے پھرتے ہو میرے نقصان کو نہیں دیکھتے میرا تو سارا بنا بنایا گھر ہی بگڑ گیا' سارا کنبہ اور تجارت ہی غارت ہوگئی' بیوی بچے سب ختم ہوگئے تو حضرت یہاں بنا لیجئے آپ شیخ چلی کا سا محل۔ قیامت میں معلوم ہوگا کہ نہ کوئی ہاتھی ہے نہ گھوڑا نہ کوئی ساز ہے نہ سامان۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ یہاں تو یہ دعویٰ نہیں کہ نحن کذا نحن کذا۔ ہم ایسے ہم ویسے۔ وہاں حقیقت معلوم ہوگی کہ ہم کیا ہیں کچھ بھی نہیں۔

مسلمان بننا بڑا مشکل ہے

بس کیا ہے تھوڑا سا علم پڑھ لیا' مولانا صاحب ہوگئے۔ دو چار ضربیں الا اللہ الا اللہ کی لگا لیں اور کچھ سرسری بدن میں ہونے لگی تو بس شاہ صاحب بن بیٹھے۔ گویا سارے کمالات اپنے نزدیک یہیں پورے کر لیے مگر واقعی حالت ہماری یہ ہے:

زاہد شدی و شیخ شدی دانشمند   ایں جملہ شدی و لے مسلماں نشدی

(زاہد اور شیخ بننا تو آسان ہے لیکن مسلمان بننا مشکل ہے)

حضرت بالکل سچ ہے۔ مولوی صاحب شاہ صاحب بن لینا آسان' سوداگر ملک التجار سیٹھ صاحب بن لینا آسان لیکن اگر مشکل ہے تو مسلمان بننا یعنی ہم لوگوں کی سستی اور کاہلی کی بدولت مشکل ہے ورنہ واقع میں تو الدین یسر۔ دین میں سر تا سر سہولت کی سہولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "ماجعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابیکم ابراھیم ھو سماکم المسلمین" (دین میں تمہارے لیے کوئی تنگی نہیں تم اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو انہوں نے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا)۔ دیکھئے یہاں بھی ذکر ملت ابراہیم یعنی اسلام ہی کا ہے' جس کی تمہید یہ ہے کہ "ماجعل علیکم فی الدین من حرج" (تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو دین ہے کیونکہ دین سے مراد بقرینہ مابعد وہی ہے۔ اس میں تمہارے واسطے ادنیٰ درجہ کا بھی حرج یعنی تنگی نہیں ہے حرج

نکرہ ہے اور تحت میں ہے نفی کے اور نکرہ جو تحت میں نفی کے ہوتا ہے عموم کے لیے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ذرا بھی تنگی نہیں۔ حضرت اتنا بڑا دعویٰ نہیں ہو سکتا تھا اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تنگی کا کیونکہ ہر زمانہ میں اسلام کے دشمن کثرت کے ساتھ رہے ہیں پھر کفار عرب کا تو مقابلہ تھا خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ لوگ رات دن اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد بھی ہے "یبغونها عوجا" دین میں ہمیشہ کجی کا کمی کا اعتراض ڈھونڈا کرتے تھے مگر ملتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ علی الاعلان دعویٰ کیا گیا "**ذالک الکتاب لاریب فیه**" یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں اگر کوئی شبہ ہو تو پیش کرو۔

دور حاضر کے نئے عقلا

حضرت ایسے زمانہ میں جبکہ عرب بلکہ تمام عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے بھرا پڑا تھا اگر اس دعوے میں ذرا بھی شائبہ شبہ کا ہوتا تو حضرت وہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مارے اعتراضوں کے تلخ کر دیتے' گنواتے کہ فلانے حکم میں یہ تنگی ہے' فلانے حکم میں یہ ثقل ہے' فلانے حکم میں یہ گرانی ہے تو جبکہ لاکھوں مخالف تھے بلکہ سارا عالم مخالف تھا ایسے وقت یہ دعویٰ کیا گیا کہ "**ماجعل علیکم فی الدین من حرج**" وہاں اس کے رد میں کوئی انگشت نمائی بھی نہ کر سکا اور آج یہ نئے عقلاء اعتراض کرنے بیٹھے ہیں کہ دین میں یہ تختی ہے دین میں یہ تکلیف ہے دین میں یہ دشواری ہے۔ اگر واقعی تکلیف یا تنگی ہے کسی قسم کی تو فرمایئے اس زمانہ کے لوگوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں پیش کیا اور اگر کہوں کہ پیش کیا ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں تو منقول ہونا چاہیے کیونکہ اس زمانہ سے اب تک مخالفت کی میراث برابر چلی آ رہی ہے تو اگر کوئی مخالف ایسی بات کہتا جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب نہ بن پڑا ہوتا تو ان کے ورثاء اور نائب اس کو ضرور نقل کرتے چلے آتے اور آج تاریخ میں وہ بات ضرور منضبط ہوتی بات یہ ہے کہ کسی کا منہ نہ تھا کہ سچی بات کو رد کرے' گو ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ ہم رد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی کھسیان پن اتارنے کو یہ بھی کہہ ڈالتے کہ "**لو نشاء لقلنا مثل هذا**" اگر ہم چاہیں تو اس کا معارضہ کر سکتے ہیں مگر ہم چاہتے ہی نہیں' ارے بھائی کیوں نہیں چاہتے اور کب چاہو گے اس سے

زیادہ اور کون وقت آوے گا اس وقت سے زیادہ کیا ذلیل ہو گے کہ جزیہ تم پر مقرر کیا گیا' قتل تم کیے گئے' قید تم ہوئے اور لونشاء ہی کی نوبت اور ساعت نہیں آتی۔ بس معلوم ہوا کہ واقع میں عاجز تھے کچھ نہیں ہوسکتا تھا اور صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام دعوے کے ساتھ کہتے ہیں۔

دین میں بالکل تنگی نہیں

چنانچہ اس وقت میں ہی صلائے عام اور ندائے عام دیتا ہوں' ساری دنیا کو کہ ایک مقام پر بھی دین میں تنگی تو ثابت کر دیں ایک شخص بھی ثابت نہیں کر سکتا اور صاحب یہ نہ سمجھئے کہ یہ یوں ہی اڑا رہا ہے دین میں تنگی تو ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں تو ہاں ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں کہ صاحب یہ غضب کا دعویٰ ہے کہ دین میں کوئی تنگی ہے نہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً تجارت ہی میں لاکھوں تنگیاں ہیں جن سے لین دین ہے ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم سود نہیں دیتے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ ہم مال نہیں دیتے اب مرو بھوکے تم تو کہتے ہو کہ دین میں تنگی نہیں ہے اور اپنی آنکھوں سے تنگی دیکھ رہے ہیں تو ممکن ہے یہ وسوسے دل میں دوڑے ہوں مگر واقعہ یہی ہے کہ دین میں ذرا تنگی نہیں چنانچہ اس مضمون پر میرا ایک مستقل بیان ہو چکا ہے نفی الحرج اس کا نام ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ لکھوا لکھوا کر بغل میں رکھ لیتے ہیں صاف کر کے شائع نہیں کرتے ورنہ وہ بیان اس وقت پیش کرنے کے قابل تھا اس میں میں نے یہی ثابت کیا کہ دین میں مطلق تنگی نہیں جس وقت میں نے اس بیان کے شروع میں یہ دعویٰ کیا تھا بڑے بڑے عقلاء موجود تھے اور سب حیران تھے کہ اتنا بڑا دعویٰ کیونکر نبھے گا اس کا تو خلاف واقع ہونا بالکل ظاہر ہے مگر جب بیان ختم ہو چکا تو سب نے تسلیم کر لیا کہ صاحب واقعی ثابت کر دیا' خیر وہ سارا وعظ تو کہاں نقل کر سکتا ہوں۔ اس وقت ایک چھوٹی سی بات عرض کرتا ہوں انشاءاللہ وہی کافی ہو جائے گی سارے وسوسوں کے لیے یہ جو آیت ہے "**ماجعل علیکم فی الدین من حرج**" اس میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔ سو یہ دیکھئے کہ حق جل شانہ نے تنگی کی نفی کس سے کی ہے ظاہر ہے کہ دین سے کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تنگی جو پیش آتی ہے اس کا محل آیا دین کا کوئی جزو ہے یا کچھ اور ہے۔

قرآن مجید میں کوئی شبہ نہیں

اسی کی نظیر ایک اور آیت یاد آئی "ذالک الکتاب لاریب فیه" قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ یہاں بھی بڑا شبہ واقع ہوتا ہے کہ صاحب کہتے ہیں اس میں کوئی شک ہی نہیں حالانکہ اس میں ہزاروں کو شک ہے۔ اس کا ایک بہت اچھا جواب ہے وہ یہ کہ لاریب کا تعلق اگر ہے تو قرآن کے ساتھ ہے نہ کہ لوگوں کے ساتھ یعنی دراصل خود قرآن میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے اور اگر کوئی خواہ مخواہ شک کرے تو یہ شک اس میں شک کرنے والے کے اندر ہوا کہ قرآن کے اندر کہ وہ بالکل پاک ہے ہر قسم کے شک وشبہ سے اگر کوئی کہے کہ یہ تو محض شاعری ہے یوں ہر صاحب باطل اہل حق کو کہہ سکتا ہے کہ تم کو جو میرے طریق میں شک ہے اس کا محل وہ طریق نہیں ہے بلکہ تمہارا قلب ہے جواب یہ ہے کہ اہل باطل ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب دلیل سے اس کا طریق باطل ہے تو محل شک وہ طریق ہی ہے بخلاف اہل حق کے کہ واقع میں جب وہ امر حق ہے تو منشا شک کا وہ امر حق نہ ہوگا' معترض کا صرف ذہن ہوگا اور میں اس کی ایک نظیر رکھتا ہوں۔ ایک شخص نہایت سفید کپڑے استری کیے ہوئے اور کلف دار پہنے ہوئے ہے اور ایک شخص ہے کہ زرد شیشوں کی عینک لگائے ہوئے ہے یا یرقان صفراوی کا بیمار ہے جسے دنیا کی ہر چیز میں زردی نظر آتی ہے یا بقول مولانا

چوں بر گردی و بر گردد سرت

کوئی کہنے لگے کہ زمین کو حرکت ہو رہی ہے' میرا سارا گھر گھوم رہا ہے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ گھر تو کیا تیرا سر گھوم رہا ہوگا حالانکہ اس کا مشاہدہ ہے وہ کہے گا کہ کیا غضب کی بات ہے تم میرے مشاہدہ کی تکذیب کرتے ہو مگر ہم کہیں گے کہ ہم تیرے مشاہدہ کو غلط نہیں کہتے تجھے تو واقعی گھر گھومتا ہوا معلوم ہو رہا ہوگا مگر فی الواقع اس گھومنے کا گھر کے ساتھ تعلق غلط ہے۔ تیرے سر کے ساتھ تھا تو نے گھر کے ساتھ سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح کوئی مبصر سفید کپڑے کو کہے "ذالک الثواب لاصفرة فیه" اس کپڑے میں بالکل زردی نہیں ہے اور اس کو سن کر وہ شخص جو یرقان کا مریض ہے یا زرد عینک لگائے ہوئے ہے یہ کہنے لگے کہ میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' واللہ اس میں زردی ہے تو محقق مبصر کی جانب سے

کیا جواب ملے گا۔ وہ جواب یہ دے گا کہ بھائی تو دیکھ تو رہا ہے صحیح مگر سمجھ رہا ہے غلط۔ یہ صفرت جو تجھے نظر آ رہی ہے تیری آنکھ ہی ہے تیری عینک میں ہے کپڑے میں نہیں ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ دین میں تنگی نہیں ہے یہ نہیں کہا کہ آپ کے جو گاہک صاحب یا منیجر صاحب یا مال بھیجنے والے صاحب ولایت میں ہیں ان کے معاملہ میں بھی تنگی نہیں ہے ہاں دین میں تنگی نہیں ہے یہ فرمایا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کا جی چاہے امتحان کر لو ساری دنیا اگر یہ دین اختیار کر لے پھر جو کہیں بھی گاڑی اٹکے اور قانون میں تنگی ہونے کا یہی امتحان ہے کہ اگر ساری دنیا وہ قانون سہل اختیار کر لے تو کہیں گاڑی نہ اٹکے اور اگر پھر بھی کہیں گاڑی اٹکنے لگے تو یہ البتہ علامت ہے قانون کی تنگی کی اور اگر اس کو سب نے اختیار نہیں کیا اور اس وجہ سے تنگی پیش آنے لگی تو یہ علامت اس کی نہیں کہ قانون میں تنگی ہے بلکہ عمل نہ کرنے والوں میں تنگی کہی جائے گی۔ اسی طرح اگر دین کو سب اختیار کر لیں تو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ کہیں بھی تنگی واقع نہ ہوگی مگر چونکہ بعض نے تو اختیار کیا ہے اور بعض نے نہیں کیا اور معاملہ ان کا ان ہی سے پڑتا ہے اس لیے اختیار کرنے والوں کو لامحالہ تنگی پیش آئے گی لیکن محل تنگی کا وہ اختیار نہ کرنے والے ہیں نہ کہ دین۔

دین میں تنگی نہ ہونے کی عجیب مثال

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی طبیب حاذق کسی دیہاتی کو نسخہ لکھ کر دے لیکن اس دیہاتی کا گاؤں ایک ایسا کوردہ مقام ہے کہ جہاں نہ مرغی ملتی ہے نہ انڈا ملتا ہے نہ بکری کا گوشت نہ کدو کی ترکاری نہ ماش کی دال نہ چنے کی دال اور ملتا کیا ہے وہاں کریلا' بینگن اور حضرت مسور کی دال بھینس کا گوشت غرض جتنی مضر چیزیں ہیں وہ تو وہاں ملتی ہیں ان کے سوا اور کچھ وہاں ملتا ہی نہیں۔ ایسے دیہاتی نے حکیم صاحب سے نسخہ لکھوایا پھر پوچھا کہ کھانا کیاں کھاؤں' حکیم صاحب نے کہا بکری کا گوشت کھاؤ' بولا اجی وہ تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتا' کہا اچھا مونگ کی دال توری ڈال کر کھاؤ' بولا یہ چیزیں بھی نہیں ہوتیں' بھائی لوکی کھاؤ' اجی وہ بھی نہیں ہوتی' چنے کی دال ہی سہی' صاحب یہ بھی نہیں ملتی۔ غرض جو جو چیز حکیم صاحب بتاتے جائیں وہ یہی کہتا جائے کہ صاحب یہ بھی نہیں ہوتی یہ بھی نہیں ملتی۔ آخر حکیم

ب نے جھلا کر پوچھا کہ آخر تیرے گاؤں میں کچھ ہوتا بھی ہے اس نے کہا کہ ہمارے یہاں تو بینگن ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا خبردار بینگن ہرگز مت کھانا سخت نقصان کرے گا' کہا کریلا ہوتا ہے' کہا یہ بھی مت کھانا' مسور کی دال ملتی ہے' دیکھو یہ بھی مت کھانا' اب وہ دیہاتی صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر گئے اور کہنے لگے بس جی دیکھ لیا حکیم صاحب کو اس قدر تشدد ہے اس قدر تنگی ہے کہ جس چیز کو پوچھو یہ بھی مت کھانا جس چیز کو پوچھا یہ بھی مت کھاؤ اور ایسی چیزیں بتلا دیں جو ہمارے گاؤں میں ہوتی ہی نہیں' ان کا علاج بڑا سخت ہے' ان کے علاج میں بڑی تنگی ہے۔ سب یہی کہیں گے کہ احمق کو کہ حکیم صاحب کے علاج میں تو تنگی نہیں انہوں نے تو دس چیزیں بتائیں لیکن اب وہ اس کو کیا کریں کہ تیرے گاؤں ہی میں مضر چیزوں کے سوائے کوئی مفید چیز نہیں ملتی تو تیرے گاؤں میں تنگی ہے احمق نہ کہ حکیم صاحب کے علاج میں۔ اب جتنی ترقی کی صورتیں ہیں ان میں سے شریعت نے سینکڑوں چیزوں کو جائز قرار دیا ہے اور بہت کم صورتوں کو ناجائز بتلایا ہے لیکن اب دوسرا وہ معاملہ تو کرے جو ناجائز ہے اور وہ معاملہ نہ کرے جو جائز ہے تو سبب تنگی کا وہ ہے یا دین اور یہ یقینی بات ہے جو تنگی پیش آتی ہے یا تو اہل معاملہ کی وجہ سے پیش آتی ہے تو اس کے ذمہ دار آپ لوگ ہوئے یا دین تو غرض دین فی نفسہ اتنا آسان ہے کہ اس میں شائبہ بھی تنگی کا نہیں لیکن ہم نے خود اس آسان کو اپنے سوءِ استعمال سے دشوار بنا رکھا ہے۔ اب اس کا کیا علاج مثلاً نماز پڑھنا ہے یہ بھی کہیں مشکل ہے کہ اُٹھ کر چند سہل اعمال کر لیے ویسے بھی تو تاجر صاحب ۸ بجے سو کر اُٹھتے ہیں کبھی بہت سا وقت تجارت سے خالی رہتا ہے سو اگر اس درمیان میں ذرا سویرے اُٹھ کر فجر کی نماز ہی پڑھ لیتے تو اس میں کونسا خلل تھا تجارت کا۔

دین کے جملہ احکام آسان ہیں

اسی طرح دین کی ساری باتیں آسان ہیں نماز بھی' روزہ بھی مگر ہم نے خود ان کو مشکل بنا رکھا ہے بلکہ زیادہ تر تو سبب تنگی کا کم ہمتی ہے جیسے مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں ایک احدیوں کی جماعت تھی ان کی ایک یوں ہی افواہی حکایت سنی ہے کہ دو شخص تھے ایک تو بیٹھا ہوا تھا اور ایک لیٹا ہوا۔ ایک سوار کا وہاں سے گزر ہوا لیٹے ہوئے نے پکار کر کہا کہ میاں سوار

ذرا یہاں تو آنا' وہ آیا کہ نہ معلوم بیچارے کو کیا حاجت ہوگی' پوچھا کہ کیا کام ہے' کہا میاں یہ جو میرے سینہ پر ایک بیر پڑا ہوا ہے گھوڑے سے اتر کر ذرا میرے منہ میں ڈال دو' سوار نے کہا لاحول ولاقوۃ میں تو سمجھا تھا کہ نامعلوم کیا ضروری اور مشکل کام ہوگا بھلا یہ بھی کوئی کام ہے' خواہ مخواہ میرا راستہ کھوٹا کیا' ارے بھلے مانس تو خود اٹھا کر منہ میں کیوں نہیں ڈال لیتا' کیا تیرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس نے کہا اجی صاحب بھلا کہاں ہاتھ سینہ تک لیجاؤں اتنا بکھیڑا کس سے ہوا گر ذرا تمہیں ڈال دو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔ صاحب انسان کو ایسا بھی بے مروت نہ ہونا چاہیے' سوار سخت متحیر ہوا اس کے پاس والے سے کہا کہ ارے تو کس مصرف کا ہے تو بھی تو یہاں ہی بیکار بیٹھا ہوا ہے تو ہی بیر اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دے' اس نے بگڑ کر کہا کہ بس جی مجھ سے کچھ نہ بولو' نہیں تو لڑائی ہو جاوے گی' تمہیں میرے دُکھ کی میرے درد کی کچھ خبر بھی ہے' آئے اور بس رائے دیدی اس سے اور مجھ سے یہ معاہدہ ٹھہرا تھا کہ ایک دن ہم بیٹھیں گے اور تم لیٹے رہو اور ایک دن تم بیٹھو اور ہم لیٹے رہیں اور جو بیٹھا ہو وہ لیٹے ہوئے کا کام کر دیا کرے' کل اس کے بیٹھنے اور میرے لیٹنے کا دن تھا مجھے لیٹے لیٹے جمائی آئی ایک کتا آ کر میرے منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا دیکھتا رہا اور کتے کو ہٹایا تک نہیں' اب میں اسے ضرور بیر کھلاؤں گا سوار کی حیرت کی حد نہ رہی کہ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عالی ہمتی کا کہ منہ کے اندر کتے کے موتنے میں بھی اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور ہٹا دے اور بیر اٹھانے میں اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور اُٹھا کر منہ میں ڈال دے خود کون اٹھائے احدیت میں فرق آ جائے گا۔ خیر یہ تو واہیات گھڑی ہوئی حکایت ہے۔

دین میں ہماری کم ہمتی کی مثال

ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم تھے یہ جماعت بھی بہت سست ہے مگر خیر دنیا کے کاموں میں سست ہو تو دین میں سست نہ ہو۔ ان کے حجرہ میں ایک چوہیا نے سوراخ کر لیا تھا اور بہت سی مٹی باہر نکال کر جمع کر دی تھی۔ وہاں ایک حاجی ہیں انہیں طالب علموں سے محبت ہے یگانگت کا برتاؤ رکھتے ہیں وہ ایک دن اس حجرہ کے پاس ہو کر گزرے تو مٹی کا ڈھیر نظر آیا' خیر انہیں کچھ خیال ہوا سوراخ میں وہ مٹی بھر دی اور خوب ٹھوک پیٹ کر اسے بند کر دیا۔

اگلے دن چوہیا نے پھر مٹی باہر نکال کر سوراخ کر لیا' کسی نے کہا مٹی بھر کر ٹھیک کر دیا ہوتا تو آپ کیا فرماتے ہیں حاجی جی آ کر کریں گے اب گویا ان کے نوکر ہو گئے' ساری عمر کے لیے تو حضرت دنیا میں ایسی ہمت کے ابھی لوگ موجود ہیں اسی طرح زیادہ سبب دین میں تنگی محسوس ہونے کا یہ کم ہمتی ہی ہے۔ ہم ان حکایتوں پر تو ہنستے ہیں لیکن دین کے اندر ہماری کم ہمتی کی بھی یہی حالت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں جن سے نماز روزہ نہیں ہوتا۔ حضرت اگر حکام میں سے کوئی انہیں بلاوے جس کا قرب موجب عزت ہو تو جو عذرات نماز روزہ کے لیے ہو رہے ہیں ان میں سے جو ایک بھی باقی رہ جاوے جس وقت مؤذن کہے ''حی علی الصلوٰۃ'' یعنی نماز کے لیے آؤ اس وقت کہتے ہیں کہ بھائی ہم سے تو مسجد تک نہیں جایا جاتا' کون اتنی دور جائے اور اگر کوئی اردلی آ کر پیغام دے کہ صاحب کلکٹر نے آپ کو یاد کیا ہے تو فخر سمجھ کر فوراً چلنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے' چار میل پر بھی ڈیرہ ہوگا تو وہیں جا کر مشغول ملاقات ہوں گے اور آ کر فخر کریں گے کہ ہمیں صاحب کلکٹر نے بلایا تھا۔

تو یہ کیا بات ہے کہ وہی شخص جو محلہ کی مسجد میں بھی نہ جا سکتا تھا اسے چار میل کے فاصلہ پر کس نے جا پہنچایا وہ کیا کہ مسجد تک جانے کا ارادہ نہیں کیا تھا اور وہاں جانے کا ارادہ کر لیا اسی ارادہ کا نام ہمت ہے تو ساری کمی ارادہ اور ہمت کی ہوئی۔ واقعی حضرت قصد ہی نہیں ورنہ بڑے بڑے دشوار کام آسان ہو جاتے ہیں یہ قصد کا اثر نہیں تو اور کیا ہے کہ تجارت کے لیے کہیں افریقہ کہیں کہیں جا پہنچتے ہیں جو شخص مسجد میں نہ جا سکے وہ ایک دم سے ٹاٹال اور افریقہ پہنچے۔ آخر کیا فرق ہے ارادہ ہی کا تو فرق ہے اے حضرت اگر ارادہ دین کا کر لو اور پھر کوئی دشواری پیش آئے اس وقت تو ہم جواب کے ذمہ دار ہیں اور مشورہ کے باقی جتنی دشواریاں اب پیش کی جا رہی ہیں ابھی ان کے جواب کا وقت نہیں نہ سوت نہ کپاس جولا ہے سے ٹھینگم ٹھینگا۔

یہ سب سوال و جواب اور قیل و قال ایسی ہے جیسی افیونیوں کی جس سے کچھ حاصل نہیں۔ افیونیوں کو مٹھائی کا بڑا شوق ہوتا ہے دو افیونی تھے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے ایک بولا یار گنوں کی کاشت کریں گے' بڑا مزہ رہیگا گنا تڑاق سے توڑا اور چوسنے لگے' دوسرا بولا ہاں یار بڑا لطف رہے گا تڑاق پڑاق توڑا اور چوس لیا۔ اس پر پہلے نے بگڑ کر کہا کہ میں

نے تو ایک ہی گنا توڑا تھا تو نے دو کیوں توڑ لیے دوسرا بولا ہمارا کھیت ہے چاہے سو کھاویں تو کون ہے روکنے والا تو بھی کھالے۔ بس جناب اسی بات پر لڑائی ہو گئی کوئی ان سے پوچھے ارے احمقو وہ گنے ابھی ہیں کہاں جن پر لڑائی بھی ہونے لگی۔ غرض لڑائی اتنی بڑھی کہ مقدمہ قاضی کے یہاں پہنچا۔ قاضی نے انہیں اس حماقت کی اس طرح سزا دی کہ دونوں سے کہا کہ پہلے اس کاشت کا محصول سرکاری تو داخل کر دو پھر مقدمہ کی سماعت کی جاوے گی۔

چنانچہ جناب اس نے پہلے تو دونوں سے محصول داخل کرالیا۔ پھر دونوں سے کہا کہ دیکھو! خبردار برابر برابر گنے توڑا کرو' یہ فیصلہ کر دیا۔ خواجہ صاحب نے (یہ احقر کاتب وعظ کی طرف مزاحاً اشارہ تھا بحوالہ احقر کے سابق عہدہ ڈپٹی کلکٹری کے ۱۲ کاتب) بس اسی طرح دین کے متعلق سوال واشکالات تو بہت اور کام کے نام دم نکلتا ہے۔ حالانکہ حالت ہونا یہ چاہیے:

کارکن کار بگذر از گفتار　　اندریں راہ کار باید کار

(باتیں چھوڑ کر عمل میں لگ' اس طریق الفت میں صرف عمل ہے)

فرماتے ہیں شیخ شیرازیؒ

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(یعنی راہ طریقت میں قدم رکھنا چاہیے اور عمل کرنا چاہیے کیونکہ بغیر قدم رکھے عمل کے دعوے کی کوئی حقیقت نہیں)

(چونکہ یہ شعر دوبارہ پڑھا گیا تھا اس لیے دوبارہ ہی لکھا گیا ۱۲ کاتب) خدا جانتا ہے خدا کے یہاں نہ مولویت کا دعویٰ کچھ کام دے گا اور نہ مشیخت کام دے گی۔ اگر کام دے گا تو یہی کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دو جس کا نام ہے اسلام کامل۔ بس یہ کام دے گا اور کچھ بھی نہیں تو خدا کے واسطے ہمتیں درست کر کے کامل اسلام اختیار کرلو اور دشواری کے وہم سے ہمت مت ہارو۔ ذرا اختیار کر کے تو دیکھو میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں۔ دیکھئے آدمی قسم جب ہی کھاتا ہے جب پورا بھروسہ ہوا اسی سے سمجھ لیجئے کہ مجھے کوئی تو بھروسہ ہے خود اپنا معائنہ مشاہدہ یا بزرگوں کی تقریر یا تقلید کسی چیز پر تو اطمینان ہے جس پر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جتنی دشواریاں تمہیں دین میں اب نظر آ رہی ہیں اگر ارادہ کی تکمیل کرلو اور عمل شروع کر دو تو خدا

کی قسم سب دشواریاں ہمیں نظر آ رہی تھیں وہ محض ہمارا وہم تھا اور کچھ بھی نہیں۔ میں ایک مثال سناتا ہوں۔ جنگل میں دیکھا ہوگا یا کسی پختہ سڑک پر دیکھا ہوگا کہ راستہ کے دونوں طرف درخت ہوتے ہیں اور دور تک نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر دونوں لائنیں درختوں کی مل گئی ہیں اور راستہ بند ہو گیا ہے یا سمندر کی سیر کو کبھی گئے ہوں گے تو سمندر آسمان کے کنارہ سے ملا ہوا نظر آیا ہوگا اور یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ بس آگے سمندر نہیں۔ اب فرض کرو ایک شخص ہے بالکل ناتجربہ کار جس کو کہیں کا تجربہ نہیں نہ بر کا نہ بحر کا۔ اس کو دریا میں لے چلے۔ ایک مقام تھا جہاں دریا کا بھی راستہ قطع کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ آسمان کے کنارہ کو پانی سے ملا ہوا دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ آگے چل کر راستہ بند ہے اور یہ سوچ کر کہ یہ سر پوش سا کیا ڈھکا ہوا ہے جہاز اس سے ٹکرا نہ جائے گا' جہاز والے سے پوچھتا ہے کہ بھائی پہلے مجھے یہ تو بتادو کہ کدھر کو جائے گا جہاز تم چلا تو رہے ہو مگر آگے راستہ ندارد۔ اب جہاز والا ہر چند کہتا ہے کہ بھائی تم چپکے چلے تو چلو راستہ صاف پڑا ہوا ہے میرا تو بارہا کا دیکھا ہوا ہے۔ میں تو رات دن کا آنے جانے والا ٹھہرا اور تم نے کبھی دریا کا سفر کیا نہیں اس لیے یوں سمجھ رہے ہو کہ راستہ بند ہے لیکن دراصل یہ بات نہیں۔ تمہیں تجربہ نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ نہیں جناب پہلے ہمیں سمجھا دو تب چلیں گے کیونکہ ہمیں تو کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے کہ آگے چل کر راستہ بند ہے۔ خیر ابھی تو دس میل ہی آئے ہیں پھر دور پہنچ کر لوٹنا پڑا تو طوالت ہوگی یہیں سے واپس چلے چلو۔ اب کیا اس احمق کے کہنے سے جہاز والا اپنا جہاز پیچھے کو ہٹائے گا یا کوئی اسی طرح ایسا احمق ہو جس کی میں نے پہلے مثال دی تھی کہ سڑک پر دونوں لائنیں درختوں کی دور سے ملی ہوئی دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ آگے راستہ بند ہے اور اپنے رہبر سے کہتا ہے کہ آگے چل کر تو درخت مل گئے ہیں اور راستہ بند ہو رہا ہے تم کدھر لئے چل رہے ہو۔ وہ ہر چند کہتا ہے کہ درخت یہیں سے ملے ہوئے نظر آ رہے ہیں وہاں ملے ہوئے نہیں ہیں تم چلنا تو شروع کرو' راستہ ملے گا اب وہ سنتا ہی نہیں۔ اب بھلا ایسے احمقوں کا کیا علاج۔ اسی طرح اے صاحبو! جب تم نے چلنا شروع نہیں کیا ہے جبھی تک دین کے راستہ میں تمہیں پتھر اور پہاڑ نظر آ رہے ہیں۔ ارے بھائی تم چلو تو پھر جتنے پتھر اور پہاڑ ہیں سب خود بخود ہٹتے چلے جائیں گے اول تو اس راستہ میں پہاڑ ہیں نہیں۔

اے خلیل اینجا شرارو دود نیست　　جز کہ سحر و خدعہ نمرود نیست

(اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور جو کسی کو رکاوٹ معلوم ہوتی ہے وہ نمرود جیسے سحر اور جادو کی مثل ہے)

اور جو پہاڑ تمہیں اس وقت نظر آرہے ہیں وہ حقیقی نہیں ہیں خیالی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دین میں تنگی اور دشواری اول تو ہے ہی نہیں اور ہو بھی تو ایسی برکت ہے طلب کی اور اخلاص اور فنا کی اور سچے اسلام کی کہ بڑے بڑے پہاڑ "ھباء منثورا" (بکھرے ہوئے غبار) ہو جاتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　خیرہ یوسف داری باید دوید

(اگر چہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف (علیہ السلام) کی طرح بھاگ نکلنے کی کوشش تو کرنی چاہیے)

ہائے کیا مضمون ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا بہانہ سے اپنے محل کے اندر لے گئی تو سات دروازے تھے اس محل کے۔ ہر ایک دروازہ کو بند کر کے اس میں ایک ایک قفل بھاری لگاتی چلی گئی۔ جب ساتوں دروازے مقفل ہو چکے تب اطمینان کے ساتھ اس نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ اب اگر بھاگنا بھی چاہیں گے تو بھاگ کر جائیں گے کہاں اس وقت اگر وہ ایسے ہی شکی ہوتے جیسے کہ ہم لوگ ہیں اور حق تعالیٰ پر پورا توکل نہ ہوتا تو بھاگنے کی کوشش ہی نہ کرتے مگر خدا پر توکل کر کے بھاگے کہ میں اپنا کام تو کروں وہ اپنا کام کریں گے جو کام میرے اختیار میں ہے وہ تو مجھے پورا کرنا چاہیے۔ بس جناب دوڑنا تھا اور قفلوں کا خود بخود ٹوٹ کر نیچے گرنا اور پٹوں کا کھلنا غرض ایک ٹوٹا دوسرا ٹوٹا تیسرا اسی طرح ٹوٹا پھر چوتھا پھر پانچواں غرض سارے قفل ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام ساتوں دروازوں کو پار کر کے باہر ہو گئے تو مولانا اس کو یاد دلا کر فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　خیرہ یوسف داری باید دوید

(گو عالم میں کوئی رخنہ معلوم نہیں ہوتا مگر حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا شروع کرو)

یعنی گو نفس و شیطان سے بچ کر نکلنے کا راستہ تو دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا لیکن تم خدا پر بھروسہ کر کے دوڑو، دیکھو اللہ تعالیٰ غیب سے راستہ پیدا کرتے ہیں یا نہیں۔ ارے بھائی تم تو اپنی سی کوشش کرو اور اصلاح کا ارادہ تو کرو پھر کوئی اشکال پیش آوے تو پیش کرو کام کرنے سے پہلے تو یہ باتیں بالکل فضول ہیں۔ مجھے ایک جواب اپنے استاد مولانا محمد یعقوب قدس سرہ العزیز کا بہت پسند آیا جو انہوں نے ایک طالب علم کو دیا تھا۔

وسوسہ نماز سے متعلق اہل تحقیق کے جواب

دیکھئے اہل مناظرہ کے جواب اور قسم کے ہوتے ہیں اہل حقیقت کے اور قسم کے۔ اہل مناظرہ کے جواب تو بس زبان ہی تک رہتے ہیں اور اہل تحقیق کے جواب قلب تک اترتے ہیں۔ دوران درس میں ایک طالب علم نے ایک حدیث پر شبہ کیا تھا اس کا جواب مولانا نے دیا تھا۔ حدیث یہ ہے کہ جو اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ایسے پڑھے کہ "**لا یحدث فیھما نفسہ**" یعنی اس میں اپنے جی سے باتیں نہ کرے یعنی حدیث النفس کے طور پر جو ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں سوچا کرتے ہیں اس سے وہ نماز بالکل خالی ہو۔ بے سوچے اگر اِدھر اُدھر کے خیالات آ جاویں تو کچھ ڈر نہیں مگر خود نہ سوچے اور بے سوچے آنے میں کچھ حرج نہیں بشرطیکہ انہیں دل میں رکھے بھی نہیں یعنی احداث اور ابقاء دونوں اس کی جانب سے نہ ہوں یعنی نہ خود پیدا کرے نہ خود باقی رکھے۔ بس متوجہ الی اللہ رہے اور اگر کوئی خیال خود بخود آ جائے تو کچھ حرج نہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ نماز میں حضور بہت آسان ہے جس کو لوگوں نے خواہ مخواہ مشکل سمجھ رکھا ہے تو مولانا کی خدمت میں یہ حدیث ہو رہی تھی کہ جو ایسی دو رکعت پڑھ لے گا "**غفر لہ ماتقدم من ذنبہ**" یعنی اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ ایک طالب علم بولا! کیوں حضرت کیا ایسی نماز ممکن ہے جس میں خیالات نہ آویں، اول تو اس نے سوال ہی غلط کیا۔ حدیث شریف میں تو یہ ہے "**لا یحدث فیھما نفسہ نہ کہ لاتتحدث فیھما نفسہ**" مگر مولانا نے اس مواخذہ سے تعرض نہ فرما کر کیا خوب جواب دیا کہ میاں کبھی ارادہ بھی ایسی نماز پڑھنے کا کیا تھا جس میں کامیابی نہ ہوئی، کبھی پڑھ کر بھی

دیکھی تھی، اگر پڑھ کر دیکھتے اور ناکامی ہوتی تب تو پوچھتے ہوئے بھی اچھے معلوم ہوتے، شرم نہیں آتی کہ کبھی ارادہ تو کیا نہیں اور پہلے ہی اعتراض کرنے بیٹھ گئے۔ حدیث پر بھائی کبھی اس حدیث پر عمل تو کر کے دیکھا ہوتا۔ جب قدرت نہ ہوتی جبھی اعتراض کیا ہوتا۔ سو واقعی اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے پلاؤ کی تعریف کی کہ بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ یہ سن کر ایک کہتا ہے جو ہمیشہ ستو ہی گھول گھول کر پیتا رہا ہے کہ پلاؤ گلے سے اترے گا کیونکر لمبے لمبے چاول کانٹے سے کانٹے سے پھر لقمہ میں بہت سے اور جو پھنس جائیں تو مثلاً ایک لقمہ میں ۴۰۰ چاول ایک دم سے آ گئے وہ کانٹے کی طرح لمبے نوک دار اور حلق کا ذرا سا سوراخ بھلا لقمہ اترے گا کیسے۔ آپ نے یہ بات حکیم جی سے پوچھی کہ صاحب ذرا مجھے سمجھا دیجئے کہ پلاؤ کا لقمہ گلے سے اترے گا کیونکر، کوئی پتلی چیز ہوتی تو اتر بھی جاتی۔ اب حکیم صاحب سمجھانے بیٹھے کہ دیکھو یہ صورت اترنے کی ہوگی کہ یہاں تو یہ چاول لمبے لمبے نظر آ رہے ہیں وہاں پہنچ کر گول ہو جائیں گے وہاں حلق کے اندر تحلل خل ہو جائے گا مگر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا اشکالات پر اشکالات۔ بس سیدھا جواب یہ ہے کہ ارے احمق کھا کر تو دیکھ جس وقت اٹکے گا اسی وقت پوچھئے اصلی جواب تو یہی ہے۔ حضرت ان بزرگوں کے جواب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ پھر کسی کو گنجائش ہی کلام کی باقی نہیں رہتی۔ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک بھلا کیا منہ رہا۔ اس طالب علم کا کہ پھر کوئی اشکال پیش کر سکے۔ مولانا کے جواب کے بعد واللہ اگر مولانا حقیقت سمجھانے بیٹھ جاتے اس طالب علم کو تو ہزاروں شبہات پیش آتے۔ اس کا شبہ تو کام کرنے ہی سے رفع ہو سکتا تھا۔ اس کا شبہ علمی تقریر سے دور نہ ہوتا کیونکہ جو عملی کام ہیں ان میں جو شبہات پیدا ہوں وہ عمل ہی کرنے سے زائل ہوتے ہیں ورنہ نری علمی تحقیقات سے کچھ کام نہیں چلتا۔ تو بزرگوں کے جواب تو جناب ایسے ہی ہوتے ہیں اور حقیقت میں صحیح جواب یہی ہیں اسی طرح پر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ تکمیل اسلام یعنی اسلام کامل حاصل کرنے کا ارادہ کر لو پھر اگر نا کافی ہو تب تو کچھ اچھے بھی معلوم ہوتے کوئی اشکال پیش کرتے ہوئے اور ارادہ کرنا کیا مشکل ہے کر کے تو دیکھو۔

حاصل یہ کہ واقع میں ارادہ کے بعد جب دین میں کچھ دشواری نہیں اور دین ہے اسلام اور اسلام کی حقیقت ہے سپرد کرنا اور وہ ہے آسان تو بس اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد

کردو۔ اب یہ سمجھنا باقی ہے کہ سپرد کرنا کسے کہتے ہیں سو اس کے لیے ایک موٹی مثال عرض کرتا ہوں۔ دیکھئے وکیل کے سپرد جو مقدمہ کر دیا جاتا ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں یہی معنی ہوتے ہیں کہ بس اب تم اس میں کوئی دخل مت دو۔ اب مقدمہ جانے اور وکیل جانے اور وکیل بھی خاص کر جبکہ معتمد بھی ہو کارساز بھی ہو خیر خواہ بھی ہو دانا بھی ہو قادر بھی ہو بعض وکیلوں میں تو یہ بھی شبہ ہوسکتا ہے کہ کبھی شاید قانون نہ جانتا ہو شفقت میں کمی ہو اور جہاں ایسا ہو جیسے بیٹے کا تو مقدمہ اور باپ وکیل یا جیسے کوئی مریض اپنے آپ کو ایسے حکیم کے سپرد کر دے کہ وہ طبیب بھی ہے اور باپ بھی ہے اور طبیب بھی ایسا کہ حکیم محمود خاں سے سند حاصل کیے ہوئے اس کے سپرد کرنے کے کیا معنی ہوں گے یہ معنی ہوں گے کہ تم مت دخل دو اور دخل نہ دینے کے کیا معنی یہ کہ اگر مریض کچھ کھاوے تو حکیم جی سے پوچھے نسخہ پیوے تو حکیم جی سے پوچھے۔ میں جب بیمار پڑتا ہوں تو ایسا کرتا ہوں کہ کوئی ایک طبیب اپنے علاج کے لیے تجویز کر لیتا ہوں اور سپرد کرنے کے اس معنی پر اس طرح عمل کرتا ہوں کہ اگر کوئی بھی کچھ بتلاتا ہے کیونکہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب محبت ہوتی ہے تو نفع کی چیز بتانے کو ہر شخص کا جی چاہتا ہے تو میں کسی کی دل شکنی نہیں کرتا' کہہ دیتا ہوں کہ بھائی فلانے حکیم میرے معالج ہیں تم ان سے کہہ دو انہیں سمجھا دو اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو مجھے بھی کوئی عذر اس کے استعمال میں نہ ہوگا اگر ایسا نہ کروں تو میں کس کس کا علاج کروں کیونکہ محبت میں ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور بتانے لگتا ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں ضرورت اس کی ہے کہ ایک خدا کو اختیار کرلو' ہم نے پچاس اللہ اختیار کر رکھے ہیں کہیں نفس کہیں برادری کہیں قوم کہیں روپیہ کہیں کچھ کہیں کچھ' سب کو راضی نہیں کر سکتے بس ایک کو لے لو۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذا رند و خم طرۂ یارے گیرند

(مصلحت یہ ہے کہ سارے جہاں کی مصلحت چھوڑ کر دوست محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

اور یہ مشرب ہونا چاہیے مسلمان کا

ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ماہے　　چہ کنم کہ چشم بدبیں نہ کند بہ کس نگاہے

(سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند ہی کے خیال میں مست ہوں' کیا کروں میں کاش کہ بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑتی)

اور یہ مذہب ہونا چاہیے:

دلا رامے کہ داری دل درو بند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لیے تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اور حضرت خدا کے ساتھ تو یہ علاقہ کیوں نہ ہونا چاہیے' لوگوں نے تو مخلوق کے ساتھ یہ علاقہ پیدا کرلیا ہے۔

حکایت مجنوں

اب آخر مجنوں کا قصہ معلوم ہی ہے سب کو لیلیٰ مورخین نے بھی لکھا ہے کہ سانولی تھی' بہت اچھی نہ تھی لیکن دل ہے جہاں آ گیا۔ ایک حکایت مولانا نے لکھی ہے:

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی　　　کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

(بادشاہ وقت نے جب لیلیٰ کی تعریف سنی تو حکم دیدیا کہ بلالو۔ چنانچہ وہ حاضر کی گئی دیکھا تو ایک سانولی سی عورت' کہا ماشاء اللہ آپ ہی ہیں جنہوں نے مجنوں کو پریشان کر رکھا ہے)

از دگر خوباں تو افزوں نیستی　　　گفت خاموش چوں تو مجنوں نیستی

(یعنی اوروں سے زیادہ تو کوئی بات تجھ میں نہیں معلوم ہوتی۔ لیلیٰ نے کہا چپ رہ تو مجنوں تھوڑا ہی ہے)

دیدہ مجنوں اگر بودے ترا　　　ہر دو عالم بے خطر بودے ترا

اگر تیرے پاس مجنوں کی آنکھ ہوتی تو اس وقت تیری نظروں میں دونوں عالم بے قدر ہوجاتے تو حضرت جس کا حسن ادنیٰ درجہ کا ہے اس کی محبت میں تو طالب کی یہ حالت ہوجائے کہ دونوں عالم اس کی نظروں میں بے قدر ہوجائیں اور آپ خدا کی محبت میں اتنی حالت بھی نہ کر دکھلاویں افسوس

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(کیونکہ عشق کا مدار حسن ہے اور حسن کہاں خدا کا کہاں لیلیٰ کا) حسن مجازی تو ایک پرتو ہے حسن حقیقی کا سو دنیا کا حسن و جمال وہیں کا ظل ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ایک عارف:

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ   پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(مجنوں کی شکل میں تونے اپنے کو ظاہر کیا ہے اور چشمہ عاشقاں کو تونے اپنے لیے تماشا بنایا ہے)

تو ایسی حالت میں غضب کی بات ہے کہ خدا کے ساتھ وہ علاقہ نہ ہو جو مجنوں نے لیلیٰ کے ساتھ کر کے دکھایا۔ یعنی اپنے کو ہمہ تن فنا کر دیا محبت لیلیٰ میں۔ حقیقت میں سپرد کرنا وہی ہے جس کو فنا ہو جانا کہتے ہیں۔ تو ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسلمان فنا ہو جائے فنا ہو جانے کے یہ معنی نہیں کہ سنکھیا کھالے گلا گھونٹ لے مر جاوے۔ اجی حضرت وہ تو چیز ہی اور ہے وہ کیا چیز ہے وہ تو ایک ہی کا ہو رہنا ہے ایک ہی کی سپردگی میں اپنے آپ کو دیدینا ہے ایک ہی کی اطاعت اختیار کر لینا ہے۔ پھر بھلا اس فنا میں مرنا کہاں بلکہ اس کا تو یہ اثر ہے:

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگرست

(خنجر تسلیم کے زخمیوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

اور اس فنا کی تو یہ حالت ہے:

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد   انچہ درد ہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا)

تو فنا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مر جاؤ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اپنی رائے کو چھوڑ دو۔ اپنے ارادہ اور خواہش کو چھوڑ دو وہ حالت کر لو جیسی کہ حضرت عارف شیرازی نے بیان فرمائی ہے:

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں۔ اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اب بھلا رائے کا چھوڑ دینا بھی کوئی مشکل کام ہے بلکہ اس میں تو بڑی راحت ہے۔ لیجئے صاحب یہ ہے دین اور یہ ہے اسلام جو مطلوب ہے۔ جس کو لوگ مشکل کہہ رہے ہیں کس قدر آسان نکلا۔ بس اس کی تعلیم کرنے میں لوگ ہم ملانوں کو بدنام کرتے ہیں کہ تشدد کرتے ہیں مشکل کام بتلاتے ہیں اسی کی تعلیم کرتے ہیں لوگ ہم میں طرح طرح کے

عیب اور نقصان نکالتے ہیں واقعی ہم میں ایک عیب ضرور ہے کہ ہم نے خدا کے دین کو بہت آسان اور مختصر کر کے مخلوق کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ ادنیٰ توجہ سے ہر شخص کو دسترس ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل ہے یا آسان ہے اور کرنے سے پہلے یہ سارے خوف اور وہم ہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی مریض کو طبیب نے علاج کی رائے دی۔ اب اس کو حقیقت تو معلوم نہیں علاج کو دشوار سمجھ کر کہتا ہے کہ صاحب کہاں سے دوائیں لاؤں' کہاں اہتمام کروں' کہاں بکھیڑا کروں وہ ہنس کر کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی علاج کیا نہیں' اچھا تم اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر دو اور تندرستی لے لو۔ اس نے کہا اچھا صاحب کر دیا سپرد کر کے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوئی چیز ایسی نہیں تجویز کی جو مشکل ہو' نسخہ بھی وہ لکھا جو شہر میں ملتا ہے غذا بھی وہ بتائی جو شہر میں ملتی ہے' نسخہ کے دام بھی وہ جو وسعت سے زیادہ نہیں کیونکہ کامل طبیب مفردات سے علاج کرتا ہے یا دو تین اجزاء سے اور معمول کے مطابق جو غذا مریض کھاتا ہے اسی کو برقرار رکھتا ہے البتہ اس میں کچھ اصلاح کر دیتا ہے۔ ایسا طبیب حاذق اتفاق سے اس مریض کو مل گیا' آٹھ دس دن ہی علاج کیا تھا کہ نہ بخار رہا نہ کھانسی رہی بالکل تندرست ہو گیا۔ طبیب نے پوچھا کہو بھائی تم تو کہتے تھے کہ علاج بڑا مشکل ہے کہا میری حماقت تھی میں نے باقاعدہ علاج کبھی کیا نہ تھا' سن سن کر اوہام میں مبتلا ہو گیا تھا یہ تو بڑا آسان نکلا۔

اپنے آپ کو سپرد خداوندی کرنے کی ضرورت

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسی طرح اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر کے دیکھو کتنا آسان ہے سارا قصہ البتہ یہ ضرور ہے کہ خواہ علاج کتنا ہی آسان ہو مگر عادات و معمولات میں کچھ نہ کچھ ترمیم ضرور کی جاتی ہے مگر وہ بھی دشوار نہیں ہوتی جیسے مشفق طبیب ہوں تو نہیں کہتا کہ تم بیوی کو طلاق دیدو' بچوں کو چھوڑ دو' مال اسباب کو خیرات کر ڈالو' سب حالت بدستور رہنے دیتا ہے' ہاں معمولات میں تھوڑی سی دست اندازی کرتا ہے جب مشفق طبیب ایسا کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی برابر تو نہ ماں رحیم ہے نہ باپ ان کی تجویز تو سب ہی سے زیادہ سہل ہوگی۔ چنانچہ دیکھ لیجئے حق تعالیٰ نے جو احکام ہمارے لیے تجویز فرمائے ہیں خود انہیں سے ظاہر ہوتا

ہے کہ ہماری کس قدر سہولت اور رعایت مدنظر رکھی ہے۔ مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اگر پانی نہ ہونے کی وجہ سے غسل یا وضو نہ ہو سکے اور سونے سے وضو یا سوتے ہوئے احتلام ہو جانے سے غسل واجب ہو گیا تو تیمم کی اجازت ہوتی ہے لیکن اس میں ایک بات کمال کی ہے۔ یعنی عجیب قصہ ہے کہ اگر سفر میں پانی وضو کے لائق تو ہو لیکن غسل کے لائق نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن پانی سے غسل کرنا مضر ہو تو ظاہراً عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے وقت میں صحبت کی اجازت نہ ہونی چاہیے کیونکہ خواہ مخواہ بیوی سے مشغول ہو کر قصداً تو ناپاک بنے اور اب پانی ڈھونڈھتے ہیں تو ملتا نہیں یا ملتا ہے مگر عذر ضرر کا کرتے ہیں پھر پوچھتے ہیں کہ صاحب تیمم جائز ہے یا نہیں؟ ایسے موقع پر شریعت کو حق تھا کہ کہہ دیتے کہ تمہیں قصداً ناپاک بننے کو کس نے کہا تھا جاؤ ہم تیمم کی اجازت نہیں دیتے' سر کھاؤ اپنا مرد جس وقت پاک تھے اس وقت معلوم تھا کہ پانی غسل کے لائق نہیں ہے یا غسل مضر ہوگا پھر ضرورت کیا تھی خواہ مخواہ مجبور بننے کی ہم اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ دنیا میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے رخصت مانگی اپنے آقا سے اس نے ذرا انکار کیا تو جھٹ ایک دوا ایسی پی لی جس سے بخار چڑھ آیا' آقا کو پتہ لگ گیا کہ اس نے قصداً بغرض حصول رخصت بخار چڑھا لیا ہے اس نے صاف انکار کر دیا کہ ہم کبھی تم کو رخصت نہ دیں گے۔ دیکھئے دنیا میں تو یوں واقع ہو رہا ہے اور عقل کے بھی خلاف یہ بات نہیں لوگ بہت عقل عقل کرتے پھرتے ہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہاری رائے اور عقل جس کے تم بڑے معتقد بن کر رہے ہو تمہاری دشمن ہے۔

چنانچہ مثال مذکور میں عقل صحبت کی اجازت نہیں دیتی مگر شریعت نے عقل کے تشدد کو پسند نہ کر کے سہولت کا مشورہ دیا۔ اس آیت میں یہی مضمون ہے "**واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم**" یعنی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے کہنے کے موافق کرتے تو تم مشقت میں پڑ جاتے۔ وجہ یہ ہے کہ یہی ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لیے مصلحت اور رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے ایسی کہ خود ہماری عقل بھی اتنی رعایت تجویز نہیں کرتی تو حضرت عقل کو چھوڑ دیئے اس کی بڑی پرستش کرتے تھے مگر دیکھئے عقل کا فتویٰ اس موقع پر یہ ہے کہ تیمم کی اجازت نہ ہو کیونکہ پانی موجود نہ تھا یا مضر تھا تو قصداً

اپنے اوپر غسل واجب کیوں کیا؟ اب شریعت کا فتویٰ سنئے۔ مثلاً ایک ایسا شخص پوچھتا ہے کہ ایسی صورت میں غسل کا تیمّم کرکے نماز پڑھنا مجھے جائز ہے۔ شریعت کا نائب کہتا ہے کہ ہاں ہاں جائز' وہ پوچھتا ہے کہ ایک شخص کو یہ معلوم تھا کہ پانی نہیں ہے باوجود اس کے اس نے اپنی بیوی سے مشغول ہوکر اپنے اوپر غسل واجب کرلیا۔ کیوں جی اس کو کچھ گناہ ہوا کچھ کراہت ہوئی' وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کیوں صاحب تیمّم میں کچھ نقصان رہے گا وہ کہتا ہے بالکل نہیں۔ یہ میں نے ایک چھوٹا سا نمونہ بتایا ہے۔ اسی سے اندازہ کرلیجئے شفقت کا پھر بھی اگر اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد نہیں کرتے تو کون آوے گا جس کے سپرد اپنے آپ کو کرو گے۔ غرض جس طرح طبیب کے سپرد اپنے آپ کو کردیتے ہو اسی طرح اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردو۔ یعنی اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آیا کرلیا اس میں تھوڑا سا تصرف کرنا ہوگا۔ میں بہت چھوٹی سی بات بتلاؤں گا' تفصیل آپ سے آپ وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔ میں ایسا گر بتلاؤں گا جس سے ہر وقت ذہن میں تفصیل کے جمع رکھنے کی ضرورت نہ رہے مگر تفصیل خود بخود وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہے گی۔

فنا کی تعلیم

وہ گر یہ ہے کہ اب تو یہ ہے کہ جو جی میں آتا ہے کر کرا لیتے ہو جو جی میں آتا ہے کہہ سن لیتے ہو جو جی میں آتا ہے کھا پہن لیتے ہو جو جی میں آتا ہے خرید بیچ لیتے ہو۔ اب تو یہ حالت ہے اور فنا کے یہ معنی ہیں کہ جو جی میں آیا اسے فوراً کرنے نہ بیٹھ جاوے بلکہ ذرا رُکے۔ یعنی جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ دل میں پیدا ہو اسے فوراً نہ کرو بلکہ اس کا حکم پوچھو حاملان شریعت سے کہ وہ کیا کہتے ہیں سو پوچھنے پر معلوم ہوگا کہ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ گوشت' گھی مت کھاؤ' نکاح مت کرو' بچوں کو پیار مت کرو' کیا کہا ہے فقط یہ کہا ہے کہ وہ کام نہ کرو جس میں تمہارا ضرر ہے۔ مگر اس کا فیصلہ تمہاری رائے پر نہیں رکھا۔ اگر بچہ کی رائے پر ماں باپ اسے چھوڑ دیں تو اس کا نتیجہ بچہ کی ہلاکت ہے۔ مثلاً بچہ نے سانپ کو دیکھا کہ چمکتا ہوا اور منقش ہے وہ اس کی ظاہری خوبصورتی اور نقش ونگار کو دیکھ کر اس کے پکڑنے کے لیے لپکا۔ باپ ہر چند اسے روکتا ہے لیکن نہیں مانتا' ہٹاتا ہے لیکن اصرار کرتا ہے جب کسی طرح نہ مانا تو زور سے ایک چپت لگاتا

اور زبردستی پکڑ کر گھسیٹ لے گیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ اس نے جو یہ دھول مارے' آیا یہ رحمت اور شفقت ہے یا تشدد اور بے رحمی ہے اور اگر فرض کرو اتفاق سے اس بچہ کو اپنی رائے پر عمل کرنے کی وہ باپ اجازت دے دے تو ظاہر ہے کہ سانپ اسے کاٹ لے گا اور وہ مر جاوے گا۔ تو پہلی صورت میں گدھے سے گدھا بھی کہے گا کہ سبحان اللہ کیا مہربان باپ ہے۔ بڑی نگرانی اور بڑی محبت سے اپنے بچہ کو پالا ہے اور اگر بچہ کے کہنے پر کہ سانپ کو پکڑ لوں' باپ نے اجازت دے دی اور کہہ دیا کہ ہاں پکڑ لے بیٹا اور بچہ کا دل نہ دکھایا تو کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اس کو مہربانی نہ بتلاوے گا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ محبت یہی تھی کہ چپت لگاتا اور سانپ نہ پکڑنے دیتا۔ وہ ظالم تھا' ڈاکو تھا' خونخوار تھا' باپ نہ تھا۔ پھر خدا کو جو باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے آپ چاہتے ہیں کہ جو ڈاکو باپ نے کیا وہی وہ کرتا یعنی ہمیں اجازت دے دیتا کہ جو جی میں آوے کرو۔ اب انصاف کے ساتھ فیصلہ اپنے نفس سے کرو کہ کون سی صورت مہربانی کی ہے۔ آیا یا کہ کبھی کبھی چپت لگا دیا کریں وہ بھی جب کہنا نہ مانو اور اگر کہنا مانو تو پیار پر پیار محبت پر محبت اور وہ مار بھی شفقت ہے مگر حسا نہیں۔ تو یہ ہے وہ گر۔

گویا سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہے۔ یہاں غالباً آپ ایک شبہ یہ پیش کریں کہ جب ہماری مرضی کے موافق نہ ہوں گے تو ہمیں تکلیف ہوگی اور ہمارا حرج ہوگا مگر حضرت ذرا ٹھہر کر اور سوچ کر کہیے جو کچھ کہنا ہو اور اول تو ہر جگہ یہ کہنے کا منہ نہیں کہ تکلیف اور حرج ہوگا مثلاً جی چاہا داڑھی ذرا صفا چٹ کر دیں گورے معلوم ہوں گے۔ حسین معلوم ہوں گے تو میاں بتلایئے اگر شریعت کی ممانعت پر عمل کیا تو کونسی تکلیف ہوئی' کونسا حرج ہوا' البتہ ایک تاجر تو خیر کہہ سکتا ہے کہ سود کو چھوڑ دوں تو مالی حرج ہوگا۔ یہ تو خیر کچھ معقول بھی ہے گو انشاء اللہ اس کا جواب بھی ایسا بتلا دوں گا جس سے یہ اعتراض ماکول ہو جاوے گا مگر خیر ظاہراً تو کچھ ہے لیکن شریعت اگر داڑھی منڈانے کو منع کرے' شریعت اگر غیبت کو منع کرے' شریعت اگر انگریزی لباس پہننے سے منع کرے تو اس میں کونسا ضرر ہوگا۔ اگر اس میں دعویٰ تکلیف اور حرج کا ہو تو میں کہتا ہوں اس کا نام بتا دیجئے کہ وہ تکلیف اور حرج کیا ہے۔ اگر تکلیف اس کو کہتے ہو کہ خیال کے خلاف ہے تو حضرت یہ جو گورنمنٹ کی نوکری ہے یہ تو اس میں بھی ہے کہ آفس میں

جانا ہے لیکن بارش ہو رہی ہے تو نوکری بھی مت کرو۔ دنیا کا کون سا ایسا کام ہے جو نفس کے بالکل خلاف نہ ہو۔ خلاف تو ہزاروں باتیں ہیں مثلاً تار آیا کہ بیٹا بیمار لیکن کچہری جانا ضرور۔ یہ بھی تو نفس کے خلاف ہے مگر اور جگہ اعتراض نہیں کرتے۔ قانون سرکاری تو یہ کہتا ہے کہ کیسا بیٹا کام پر حاضر ہونا پڑے گا اس کو کوئی نہیں کہتا کہ کیسا سخت قانون ہے کہ ہم تو بیٹے کے غم میں پڑے ہوئے ہیں وہاں دفتر سے یہ حکم چلا آ رہا ہے کہ آ وَجی گھر سے نکل کر تو جناب ایسا قانون تو کوئی دنیا میں بھی نہیں جس میں نفس کے خلاف کوئی بات بھی نہ ہو۔ پھر نہیں معلوم اللہ تعالیٰ کے قانون ہی کو کیوں ہر بات میں سخت بتایا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت نے داڑھی منڈانے سے منع کر دیا تو اس میں تکلیف اور حرج کیا ہوگا کہیں چوٹ لگ گئی (بلکہ منڈانے میں تو استرا لگ جانے کا خوف بھی ہے ۱۲ کاتب) آمدنی گھٹ گئی سردی لگنے لگی گرمی لگنے لگی کیا ہو گیا ہاں یہ تو ہوا کہ بزعم تمہارے صورت اچھی نہ رہے گی سو اول تو یہ ضرور نہیں کہ داڑھی سے صورت بری معلوم ہونے لگتی داڑھی کوئی دم ہے کہ چہرہ پر بری معلوم ہو لاحول ولاقوۃ بلکہ واقعی اگر شریعت کی حد میں ہو تو چہرہ کی زینت ہے۔

ایک مٹھی داڑھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے

یوں کوئی ایڑی تک بڑھالے یہ اس کی ہمت ہے۔ اختیار ہے باقی شریعت نے مجبور صرف ایک مٹھی داڑھی رکھنے پر کیا ہے اور مٹھی داڑھی تو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور ہم کہتے ہیں کہ خوبصورت نہ بھی معلوم ہو تو کس کی نظر میں خوبصورت نہیں معلوم ہوتی صرف چند احمقوں کی نظر میں باقی جس کے ساتھ اصل تعلق ہے یعنی حق سبحانہ تعالیٰ انہیں تو خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بلاتشبیہ اگر کسی بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہو جائیں اور وہ عورت یوں کہے کہ تم داڑھی نہ منڈایا کرو مجھے تو داڑھی اچھی معلوم ہوتی ہے تو اگر وہ صاحب سچے عاشق ہیں تو خدا کی قسم اسی دن سے داڑھی منڈانا چھوڑ دیں گے۔ اب ان کے دوست احباب ہنستے ہیں کہ آئیے مولوی صاحب آئیے ملاں صاحب لیکن وہ عاشق صاحب بجائے متاثر ہونے کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ میاں تم کیا جانو اس داڑھی کی حقیقت تمہیں اچھی نہ معلوم ہوتی ہو لیکن اسے تو اچھی معلوم ہوتی ہے جس پر میں جان تک فدا

کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے اب کسی سے کیا مطلب اب تو میں نے یہ مذہب اختیار کرلیا:

دلا رامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے تو پھر تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو)

اب تو میری حالت اس نو خرید غلام کی سی ہے جس سے اس کے نئے آقا نے اس کا نام اور کھانے پہننے کے متعلق معمول پوچھا تھا اور اس نے اپنے آقا کے پوچھنے پر یہ جواب دیا تھا کہ اب تک جو کچھ بھی میرا نام ہو لیکن آج سے جو تم مجھے کہنے لگو وہی میرا نام ہے جو پلاؤ وہی میرا پانی ہے جو کھلاؤ وہی میری غذا ہے جو پہناؤ وہی میرا لباس ہے۔ اسی طرح اس بازاری عورت کے لیے وہ عاشق داڑھی پر ہنسنے والوں سے کہہ دے گا کہ میاں اسے تو پسند ہے تم بلا سے برا سمجھتے رہو تم سے مجھے لینا کیا ہے۔ حضرت یہی مذہب ہوتا ہے عاشق کا

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے لیکن ہم ننگ و ناموس کے خواہاں نہیں)

مگر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہے:

ساقیا برخیز و دردہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را

(اے ساقی جام چھوڑ کر اُٹھ جا اور گزرے ہوئے ایام کی یاد دل سے نکال دے)

یعنی جام محبت پینے کے بعد یہ مذہب نصیب ہوجاتا ہے اس سے ہی تمام شبہات، خدشات، تمام سوالات تمام اشکالات رخصت ہوجاتے ہیں اور نری قیل وقال سے کچھ نہیں ہوتا۔ آج کل قیل وقال اور بحث وجدال وہ بھی محض فضول ولاطائل کا ایک مستقل شغل ہوگیا ہے۔

جملہ شبہات کا شافی علاج

چنانچہ ایک بڑے تعلیم یافتہ فرماتے تھے کہ فروری میں روزے مقرر ہوتے تو بہت مناسب تھا، گرمی کے دنوں میں جو روزے آجاتے ہیں بڑی مصیبت آجاتی ہے۔ اللہ اکبر کچھ حد ہے ۱۶ گھنٹے تک پیاسا رہنا پڑتا ہے اس دشمن عقل نے یہ نہ سمجھا کہ فروری کے مہینہ میں تمام اقلیموں میں تو دن چھوٹا نہیں ہوتا۔ اب تو نری سختی سب کو بانٹ رکھی ہے۔ نمبروار بھگتو مگر اس سے بھی قطع نظر کرکے کہتے ہیں کہ ہم کو ضرورت ہی کیا اعتراض کرنے کی جو چاہا

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا اگر اس معترض کے قلب میں محبت ہوتی تو اعتراض کا اس میں ذرہ برابر تک نہ ہوتا۔ ایک مجمع تھا تعلیم یافتوں کا اس میں میں نے یہ مضمون بیان کیا تھا کہ خدا سے محبت پیدا کر لو سارے شبہات جاتے رہیں گے۔ خدا کی قسم یہی اصل علاج ہے شبہات کا کیونکہ قاطع وساوس صرف محبت ہے اور کوئی چیز نہیں' نہ دلائل ہیں نہ براہین ہیں نہ لیکچر ہیں نہ تقریر ہے نہ وعظ ہے۔ بس شبہات کی جڑ جو کٹتی ہے تو محبت ہی سے۔ فرض کرو ایک بازاری عورت پر کوئی جنٹلمین صاحب عاشق ہو گئے جن کے پاس کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ناک بھی ہے۔ اس نے ان کے لیے ایک ایسی پوشاک تجویز کی جس میں سوائے ناک کٹائی کے اور کچھ بھی نہیں یعنی اس نے کہا کہ میں جب ملوں گی جب اپنے یہ سب کپڑے اتار کر اور صرف ایک لنگوٹا باندھ کر ایک بازار سے دوسرے بازار تک ننگ دھڑنگ دس چکر لگا آؤ گے۔ اگر عاشق ہے تو اس سے بھی زیادہ پر آمادہ ہو جائے گا اور یہی نہیں بلکہ شبہ بھی نہ ہوگا حالانکہ شبہ تو ہونا چاہیے تھا کہ کیوں بی اس میں تمہارا کیا نفع میری تو رسوائی اور تمہارا کچھ نفع نہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے نماز نہ پڑھی تو اللہ تعالیٰ کا کیا بگڑا مگر یہاں کوئی نہیں بولتا۔ اتفاق سے ایک بڑے عاقل تھے بڑے فلسفی تھے آپ پوچھتے ہیں بی مجھے رسوا کرنے میں تمہارا کیا بھلا ہوگا۔ وہ کہتی ہے کہ خیر اگر تمہیں یہ رسوائی گوارا نہیں تو جا کر گھر بیٹھو اب خوشامدیں کر رہے ہیں کہ نہیں نہیں خفا مت ہو میں نے تو یوں ہی حکمت دریافت کر لی تھی ورنہ مجھے حکمت معلوم کر کے کیا لینا مجھے تو تمہاری رضامندی چاہیے۔ تو جناب اس مردار کے کہنے میں اول تو شبہ ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو اس سے فوراً رجوع کر کے عمل کرنا شروع کر دے گا تو وجہ فرق کی کیا۔ وجہ فرق کی یہ ہے کہ اس کم بخت سے محبت ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں بلکہ اگر کوئی دوسرا اس شخص کو مشورہ بھی دے کہ میاں یہ تو نہایت واہیات اور بیہودگی کا کام ہے اس کی حکمت اور مصلحت تو پوچھ لی ہوتی تو وہ یہی کہہ دے گا کہ میاں جاؤ یہ کوئی پوچھنے کا موقع ہے یہ تو فنا کا موقع ہے جو کہے کرنا چاہیے' حکمت کیا ہوتی۔ حکمت تو وہ جانے جس نے تجویز کی ہے ہمیں تو حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ ہائے ہائے یہ مذہب ہمارا خدا کے ساتھ کیوں نہیں۔ خلاصہ یہ کہ خدا کے ساتھ محبت نہیں ہے ورنہ کوئی حکم گراں نہ معلوم ہوتا

ساری کم ہمتی اسی سے ہے کہ محبت نہیں ہے۔ اگر وسوسے دور کرنے ہیں تو محبت پیدا کرلو پھر یہ شبہ پیدا نہ ہوگا کہ اگر ہم اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سپرد کردیں گے تو کام اٹکے گا اور تو ہر جگہ یہ سوال نہیں ہوسکتا مثلاً داڑھی رکھنے میں کون سا کام اٹکتا ہے۔ اگر کہیں کہیں یہ شبہ ہو بھی سکتا ہے کہ اگر ہم ایسا کریں گے روٹیاں نہ ملیں گی' تنگی پیش آئے گی تو اس شبہ کا ایک جواب تو یہ ہے کہ محبت پیدا کرلو' اگر محبت پیدا کرلو گے تو خدا کی قسم تمہارا یہ مذہب ہو جائے گا۔

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

(جان جیسی پیاری چیز بھی دینے پر تیار ہو جاؤ گے) حضرات اب اس سے تو بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

عاشقانہ جواب

کیرانہ میں ایک طالب علم اسی مشرب کے مولانا فتح محمد صاحب سے مثنوی شریف پڑھنے آئے تھے انہوں نے ایک سوال کا ایسا ہی جواب دیا تھا اور وہ عاشقانہ جواب ہے اور ایک اور بھی ہے جسے میں بعد کو عرض کروں گا۔ صرف اسی عاشقانہ جواب پر اکتفا نہ کروں گا کبھی کوئی یوں کہنے لگے کہ یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں' مولوی لوگ ہی ایسی ہمت کر سکتے ہیں۔ بہر حال مولوی صاحب نے اس طالب علم سے پوچھا کہ بھائی روٹیوں کی کیا فکر کرو گے۔ اس نے کہا اجی مولوی صاحب روٹیوں کی کیا فکر۔ اللہ تعالیٰ کی جان ہے اگر وہ اسے دنیا میں رکھنا چاہیں گے خود روٹیاں دیں گے اور اگر نہیں دیں گے اپنی جان لے لیں گے۔ یہ آخر کبھی نہ کبھی تو نکلے گی' اس کی کیا فکر چھوڑیئے اس قصہ کو۔ ہمت تو دیکھئے آپ مرنے پر تیار ہو گئے کہ کبھی نہ کبھی تو مریں ہی گے ابھی سہی۔ جیسے کسی ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے تھے اس نے کہا دریا میں' پوچھا دادا' کہاں دریا میں' کہا میاں تمہیں ڈر نہیں۔ معلوم ہوتا کہ اتنے تو تجربے ہو چکے ہیں پھر بھی تم یہیں نوکری کرتے ہو اس وقت تو اس نے صرف یہ کہہ کر ٹال دیا کہ صاحب کیا کریں باپ دادا سے یہی پیشہ چلا آتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اس نے اس سے پوچھا کہ آپ کے والد صاحب نے کہاں انتقال فرمایا تھا' کہا گھر میں' پوچھا دادا صاحب نے کہاں گھر میں' پوچھا پردادا صاحب نے' کہاں گھر میں' کہا پھر آپ کو ڈر نہیں

معلوم ہوتا کہ جس گھر میں آپ کے اتنے بزرگ مرتے چلے آرہے ہیں اسی میں آپ رہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ مرنا تو ہے ہی دریا میں مرے تب کیا اور گھر میں مرے تب کیا اور مصر و شام میں مرے تب کیا' تو اس طالب علم کا یہ مذہب تھا۔ صاحب کچھ استغناء میں اثر ہوتا ہے جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی ایک صاحب مولوی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جو یہ گفتگو سنی تو ان پر اثر ہو گیا' سمجھے کہ یہ تو بڑا اچھا آدمی ہے' ان کا جی چاہا کہ کچھ خدمت کروں' کہا کہ مولوی صاحب آج میرے یہاں آپ کی دعوت ہے' مولوی صاحب نے کہا اچھا بھائی مگر میں مکان پر نہ آؤں گا میرا حرج ہوگا' اگر کھلانا ہو تو کھانا یہیں بھیج دینا۔

اب آپ نے اس میں بھی نخرے شروع کیے حالانکہ دعوت کا عموماً یہ دستور ہے کہ مہمان خود میزبان کے گھر جا کر کھانا کھاتا ہے لیکن ان کے عذر کو بھی قبول کر لیا گیا کہ اچھا صاحب ہم یہیں کھانا حاضر کر دیں گے پھر تو جناب اس واقعہ کا قصبہ بھر میں چرچا ہو گیا کہ یہ طالب علم ایسے ہیں' بڑے سیر چشم ہیں پھر تو صبح بھی دعوت شام بھی دعوت اور دعوت کا کھانا عموماً روزمرہ کے کھانے سے اچھا ہوتا ہی ہے۔ غرض خوب دعوتیں اڑائیں جتنی مثنوی پڑھی یار دعوتیں ہی اڑاتے رہے۔ جب پڑھ چکے السلام علیکم کہہ کر یہ جا وہ جا۔ میں پوچھتا ہوں اس کو کہاں سے روٹیاں مل گئیں لیکن اس جواب کو جو آزاد ہوگا وہ تو قبول کر لے گا اور جو آزاد نہ ہوگا وہ کہے گا کہ واہ صاحب واہ اچھی رائے دی اور جو کوئی نہ پوچھے تو بھوکوں ہی مر جاؤ۔ جیسے ایک واعظ بیچارے یہ بیان کر رہے تھے کہ پل صراط بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ ایک فارسی صاحب بھی کہیں وعظ میں بیٹھے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ملا صاف بگو کہ راہ نیست۔ مولوی صاحب پھر صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہاں چلنے کا راستہ ہی نہیں اس ہیر پھیر سے کیا حاصل کہ تلوار سے بھی تیز بال سے بھی باریک۔ یوں کہو کہ وہاں چلنے کا راستہ ہی نہیں۔ اسی طرح میرے اس جواب کو سن کر آپ صاحبان دل میں کہتے ہوں گے کہ مولوی صاحب نے اچھی رائے دی۔ پھر سب کو زہر دے کر اور گلا گھونٹ کر ہی کیوں نہ ختم کر دو' ترس ترس کر مرنے سے تو یہی اچھا کہ ایک دم سے جان نکل جائے۔ اچھی رائے دی صاحب کہ تجارت اور کاروبار سب چھوڑ کر بیٹھ رہیو اور بس مر کر ہیو' کوئی نہ کوئی دفن

کرہی دے گا بھائی ہماری سمجھ میں تو یہ جواب آیا نہیں۔ سو دوسرا جواب اور بھی ہے مگر وہ بھی پسند آئے گا۔ وہ یہ کہ شان وشوکت کو چھوڑ و اور کوئی ایسا کام جو حلال ہو اس کو اپنا ذریعہ معاش بناؤ یہ کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔ دیکھو! حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بنایا کرتے تھے جو لوہار کا کام ہے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ ڈپٹی کلکٹر ہی ہو جاویں ملک التجار ہی ہو جاویں ملک زرہی سہی نجار تھے یعنی بڑھئی کا کام کیا کرتے تھے۔

مردوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام اور مستورات کو سیدۃ النساءؓ کی تقلید کی ضرورت

مردوں کو انبیاء علیہم السلام کی تقلید سے عار نہ آنی چاہیے اور عورتوں کو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تقلید کو اپنا فخر سمجھنا چاہیے جو باوجود اس کے کہ صاحبزادی تھیں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم شاہ دو عالم کی لیکن چکی پیسا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تھے۔ ایک روز حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ سنا ہے کچھ غلام لونڈی تقسیم ہونے کے لیے آئے ہیں تم بھی گھر کے کام کاج کے لیے کوئی لونڈی اپنے ابا سے مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دولت خانہ پر حاضر ہوئیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ رکھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا موجود تھیں ان سے کہہ کر چلی آئیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واپسی پر اطلاع ملی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مکان پر خود تشریف لائے اور آکر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس بیٹھ گئے، عشاء کے بعد کا وقت تھا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا لیٹی ہوئی تھیں، وہ اُٹھنے لگیں آپ نے فرمایا لیٹی رہو۔ آخر صاحبزادی تھیں بے تکلف لیٹی رہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیسے آئی تھیں، کیا کام تھا، اب وہ تو مارے شرم کے کچھ عرض نہ کر سکیں چپ رہیں۔ اس قدر شرماتی تھیں کہ دنیا کے نام لینے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو مقصد تھا عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لونڈی دوں یا اس سے بھی اچھی چیز دوں۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کے واسطے کیا اختیار کیا۔ حضرت

فاطمہ بولیں کہ حضرت اچھی چیز سب مانگتے ہیں میں بھی اچھی ہی چیز مانگتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوتے وقت سبحان اللہ الحمدللہ لا الہ الا اللہ ' اللہ اکبر ۳۳۔۳۳ بار پڑھ لیا کرو۔ بس اس پر راضی ہوگئیں۔ بھلا اب تو کسی عورت کو راضی کرلو کہ سونے کے کڑوں کا کیا کرو گی یہ تسبیح پڑھ لیا کرو۔

کہاں کی شان

بیوی صاحبہ یہی کہیں گی کہ واہ جی واہ میں تو سونے کے کڑے ہی لوں گی بھلا ان کو تو راضی کرلو۔ اللہ اکبر کیسی صاحبزادی تھیں اس بناء پر میں تو یہی کہتا ہوں عورتوں سے کہ چکی پیسو اور شان کو چھوڑو۔ کہاں کی شان یہ ہے جواب مگر اخیر درجہ میں ایک اور جواب بھی عرض کرتا ہوں جس میں شان بھی نہ جائے گی اور آمدنی بھی نہ گھٹے گی وہ یہ ہے کہ بھائی جو کچھ کمارہے ہو کماؤ اور جس حالت میں ہو اسی میں رہو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ گناہ کی اجازت دیتا ہوں بلکہ میں توبہ صادقہ کو چندے ملتوی کرتا ہوں تاکہ اگر کامل اصلاح نہ ہو اور نہ سہی تو گو درگو تو نہ رہے۔ کچھ تو تغیر کرو اگر دوا نہیں پیتے پرہیز ہی کرلو۔ اگر پرہیز بھی نہیں ہوتا تو دستوں کی دوا ہی کھالیا کرو۔

اصلاح کا آسان نسخہ

اور اگر اس کے کھانے سے بھی گریز ہے تو پھر اپنی ایسی تیسی میں جاؤ۔ بھائی اگر مریض ہو کم ہمت تو اس کی اتنی رعایت تو خیر طبیب مشفق کرسکتا ہے کہ دوا کے استعمال کو کچھ دن کے لیے ملتوی کردے اور فی الحال کوئی ایسی ہی تدبیر بتادے جس سے مرض نہ بڑھے لیکن اس تدبیر کے استعمال میں کچھ تو تغیر اپنی موجودہ حالت میں کرنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا فی الحال میں بھی ایک ایسی بات عرض کرتا ہوں کہ جس سے نہ آپ کی تجارت کا کچھ نقصان ہو نہ آپ کی آمدنی کچھ گھٹے' نہ آپ کی شان وشوکت میں کچھ فرق آوے اور گو اس سے صحت نہ ہوگی مگر مرض بھی نہ بڑھے گا پھر انشاء اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی وقت آپ کا کام بھی بن جاوے گا اور صحت بھی ہو جاوے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں ایک ایسا نمک دست آور بتائے دیتا ہوں کہ جس میں دنیا کا حرج تو مطلق نہیں اور دین کا نفع انشاء اللہ یقینی' گو کامل نہ سہی مگر عدم سے

وجود غنیمت ہے وہ نمک یہ ہے کہ دن بھر تو گو کھاتے رہو جیسا کھا رہے ہو لیکن سوتے وقت یہ کرو کہ مسجد میں نہیں بلکہ لیٹنے کی جگہ جہاں خلوت ہو بلکہ چراغ بھی گل کردو تا کہ کوئی دیکھے نہیں اور کرکری نہ ہو دو رکعت نفل نماز توبہ کی نیت سے پڑھ کر یہ دعا مانگو کہ اے اللہ! میں آپ کا سخت نافرمان بندہ ہوں' میں فرمانبرداری کا ارادہ کرتا ہوں مگر میرے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا اور آپ کے ارادہ سے سب کچھ ہوسکتا ہے' میں چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو مگر ہمت نہیں ہوتی۔ آپ ہی کے اختیار میں ہے میری اصلاح اے اللہ میں سخت نالائق ہوں سخت خبیث ہوں سخت گنہگار ہوں میں تو عاجز ہو رہا ہوں آپ ہی میری مدد فرمایئے۔ میرا قلب ضعیف ہے' گناہوں سے بچنے کی قوت نہیں آپ ہی قوت دیجئے' میرے پاس کوئی سامان نجات نہیں' آپ ہی غیب سے میری نجات کا سامان پیدا کر دیجئے۔ ایک دس بارہ منٹ تک خوب استغفار کرو اور یہ بھی کہو کہ اے اللہ! جو گناہ میں نے اب تک کیے ہوں انہیں تو اپنی رحمت سے معاف فرمادے۔ گو میں یہ نہیں کہتا کہ آئندہ ان گناہوں کو نہ کروں گا میں جانتا ہوں کہ آئندہ پھر کروں گا لیکن پھر معاف کرالوں گا۔ غرض اس طرح سے روزانہ اپنے گناہوں کی معافی اور عجز کا اقرار اور اپنی اصلاح کی دعا اور اپنی نالائقی کو خوب اپنی زبان سے کہہ لیا کرو کہ میں ایسا نالائق ہوں میں ایسا خبیث ہوں میں ایسا برا ہوں غرض خوب برا بھلا اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے سامنے کہا کرو۔ صرف دس منٹ روزانہ یہ کام کرلیا کرو۔ لو بھائی دوا بھی مت پیو بد پرہیزی بھی مت چھوڑو صرف اس تھوڑے سے نمک کا استعمال سوتے وقت کرلیا کرو۔ حضرت آپ دیکھیں گے کہ کچھ دن بعد غیب سے ایسا سامان ہوگا کہ ہمت بھی قوی ہو جائے گی شان میں بھی بٹہ نہ لگے گا' دشواریاں بھی پیش نہ آئیں گی۔ غرض غیب سے ایسا سامان ہو جاوے گی کہ آج آپ کے ذہن میں بھی نہیں ہے۔ اچھا اب یہ بھی کوئی مشکل طریقہ اصلاح کا ہے اس طریقہ پر کس کا اعتراض ہوسکتا ہے اس پر عمل کرنے کے بعد کوئی دکھلائے کہ اس میں یہ خرابی ہے یہ دشواری ہے میں تب جانوں۔ غرض کچھ تو کرو اس پر تو صبر نہیں ہوتا کہ اسلام کے سامنے نہ فانی ہیں نہ آرزو ہے فنا کی۔ بھائی اگر فنا نہیں ہوس تو ہو فنا کی یہ ہوس بھی انشاء اللہ خالی نہ جائے گی۔

روزانہ توبہ کا فائدہ

حضرت اور کچھ نہیں اتنا تو فائدہ ضرور ہوگا اگر روز کے روز معافی نہ چاہتے رہے تو جرائم بڑھتے چلے جائیں گے اور سزا قوی ہوتی چلی جائے گی اور اگر روز کے روز معافی چاہتے رہے تو گناہوں کا بوجھ تو ہلکا ہوتا رہے گا پھر جتنا رہ جائے گا وہ شاید مرتے وقت توبہ سے جاتا رہے۔ ایک عزیز خدانہ کرے دس جرموں کا مجرم ہو اور پیروی کرنے سے وہ نو جرموں سے بری ہوسکتا ہے گو ایک میں پھنس جانے کا خوف غالب ہو تو کیا کوئی عاقل یہ کہے گا کہ جب سزا ہی سے نہ بچا تو پھر ضرورت ہی کیا ہے پیروی کی یا جتنی تخفیف سزا میں ہوسکے گی اسی کو غنیمت سمجھے گا۔ اسی طرح اے صاحب جو تدبیر تعزیرات الٰہیہ سے بچنے کی آسانی کے ساتھ ہوسکے اس کو تو اختیار کیجئے اگر رہائی کی تدبیر نہیں کر سکتے تخفیف کی تو تدبیر آسان ہے اسی کو کیجئے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے میرا کہ اگر حق تعالیٰ سے اطاعت کا تعلق نہیں ہے تو معذرت ہی کا تعلق سہی' کچھ تو تعلق ہو۔ ایسی بھی غفلت کیا کہ فکر ہی نہیں کرتے سوچتے ہی نہیں کروٹ ہی نہیں لیتے' صاحب یہ حالت تو ہم سے نہیں دیکھی جاتی اسے تو بدلو کچھ تو تغیر اپنی حالت میں کرو۔

خلاصہ دستور العمل

خلاصہ دستور العمل کا یہ ہے کہ جو کام جی میں آوے اول سوچو۔ فوراً مت کرلیا کرو بلکہ سوچا کرو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز' اگر جائز ہو کرو' اگر ناجائز ہو اول چھوڑنے کا قصد کرو' اگر نفس کہے کہ اس کے چھوڑنے میں تکلیف ہے تو دیکھو کہ وہ تکلیف قابل برداشت ہے یا نہیں اگر قابل برداشت ہے سہہ لو اگر نہیں ہے تو خیر جہاں مبتلا ہو رہے ہو وہاں اتنا تو کرو کہ رات کو استغفار اور دعاء نجات کی کرو یہ ہوا خلاصہ دستور العمل کا اور یہ ہے اسلام کا پہلا سبق اس سے عمل کی توفیق ہوگی پھر عمل کی برکت سے معلوم حاصل ہوں گے پھر ان علوم سے اسلام کی تکمیل ہوجائے گی اور جب خلاصہ تقریر کا یہ ہوا کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ جائز ہے یا ناجائز تو اب ضرورت ہوگی تلاش احکام کی۔ پھر اس کی آسان صورت یہ ہے کہ ہر روز کچھ کچھ مسئلے جاننے والوں سے پوچھتے رہا کرو اسی طرح دروازے کھلتے کھلتے کھلنے شروع ہوجائیں گے۔ اس طور سے تھوڑے دنوں میں بہت دور نکل جاؤ گے اور خبر بھی نہ

ہوگی تھکو گے بھی نہیں۔ یہ جو مضمون میں نے بیان کیا ہے ظاہر میں معمولی سا ہے لیکن میں اسی پر فخر کرتا ہوں کہ ایسا مضمون قلب میں آیا جو کام کا سنوارنے والا ہے گو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی جگہ میں تنگی اور دشواری نہیں پیش آنے دی۔

اسلام کا سبق

تو صاحبو! اسلام کا سبق تو شروع کرو پھر انشاء اللہ ترقی ہوتے ہوتے اسلام حقیقی نصیب ہو جائے گا پھر دیکھو گے کہ دنیا ہی میں اس حدیث کے معنے سمجھ میں آ جاویں گے اور اس حدیث میں جو جنت کی کیفیت مذکور ہے وہ دنیا ہی میں نظر آ جائے گی۔ حدیث یہ ہے " **اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علٰی قلب بشر**"[1] یہ حدیث قدسی ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی کی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کے کان نے سنیں نہ کسی کے دل پر کبھی گزریں۔ صاحبو! میں کہتا ہوں دنیا ہی میں آپ کو اس کا نمونہ نظر آ جائے گا۔ جب آپ یہ وطیرہ اختیار کر لیں گے تو اس کے چند ہی روز بعد وہ کیفیت پیدا ہوگی کہ آپ دیکھ کر حیرت کریں گے کہ یہ تو کبھی ہمارے ذہن میں بھی نہ آئی تھی کبھی دیکھا سنا بھی نہ تھا واللہ وہ باطنی نعمتیں حاصل ہوں گی اور ہونے لگیں گی اس وقت آپ کہیں گے کہ بادشاہوں کی بھی زندگی اس زندگی کے سامنے ہیچ ہے۔ اس وقت نہ کوئی تکلیف تکلیف معلوم ہوگی نہ کوئی کلفت کلفت یہاں تک کہ موت جو سب میں ڈراؤنی چیز ہے یہ بھی محبوب معلوم ہونے لگے گی۔ جیسا کہ ان کو معلوم ہوئی جن کے منہ سے یہ نکلا:

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

(وہ دن بہت اچھا ہے کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے پاس پہنچ جاؤں)

موت کی تمنا کرتے ہیں کہ کیا ہی خوشی کا دن وہ ہوگا کہ اس منزل ویراں یعنی دنیا سے محبوب حقیقی کی طرف روانہ ہوں گے۔ اس وقت اگر کوئی کلفت یا بیماری بھی پیش آوے گی تو

---

[1] (مسند احمد ۲: ۴۳۸، الدر المنثور ۵: ۱۸۶۰)

وہ ایسی معلوم ہوگی جیسے آپ کسی محبوب پر عاشق ہو گئے ہوں اور وہ آپ کو منہ بھی نہ لگاتا ہو اتفاق سے مدتوں بعد اس کو رحم آ گیا اور وہ خود ہی آیا آپ کو تلاش کرتا ہوا آ کر پیچھے سے دفعتہً بے خبری میں ایسے زور سے دبایا کہ آپ کی ہڈی پسلی بھی ٹوٹنے لگیں جب تک خبر نہیں تھی کہ کون ہے اس وقت تو نہایت تکلیف محسوس ہو رہی تھی لیکن جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہ محبوب ہے جو کبھی منہ بھی نہ لگاتا تھا۔ آج یہ میری قسمت کہ خود آ کر ہم بغل ہو رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کیا اب بھی آپ کو وہ تکلیف محسوس ہوگی جو پہلے ہو رہی تھی کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی تھیں۔ وہ محبوب قوی ہے تم ضعیف ہو اس کے زور سے دبانے سے یہ تو ضرور ہے کہ ہڈی پسلی ٹوٹی جاتی ہیں مگر ذرا دل میں سوچ کر دیکھو کہ وہ تکلیف کیا اب بھی تکلیف ہے یا راحت ہے' بدن کو تو بیشک تکلیف ہے لیکن دل کو وہ راحت پہنچ رہی ہے کہ روئیں روئیں میں گویا جان آ رہی ہے۔ اب وہ محبوب کہتا ہے کہ اگر تمہیں میرے دبانے سے تکلیف ہو رہی ہو تو میں تم کو چھوڑ کر تمہارے اس رقیب کو اسی طرح دبانے لگ جاؤں کیونکہ یہ رقیب بھی اس تمنا میں ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھے بغل میں لے لو' اس وقت یہ عاشق کہے گا جو حضرت عراقی کہتے ہیں:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے' دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر چلے)

اور یہ کہے گا اس وقت

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے دل ایسے یار پر قربان جو میرے دل کو رنجیدہ کرے)

اے میری جان تم کہتے ہو تکلیف میں کہتا ہوں تمہاری تکلیف بھی مجھے راحت ہے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

کیونکہ عاشق کا یہ مذہب ہوتا ہے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں تو آپ کی عطا اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہوں۔ دل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں)

پھر تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تکلیفیں تو اب تکلیف نظر آ رہی ہیں پھر وہ تکلیفیں بھی راحت ہو جائیں گی۔ اس وقت وہ درجہ حاصل ہوگا لیکن چونکہ وہ درجہ ابھی حاصل نہیں ہے۔

تخم پاشی کے بعد آبپاشی کی ضرورت

اس لیے سہل کر دیا ہے میں نے راستہ کی ایسی بات بتائی ہے جس میں تکلیف ہی نہ ہو جس میں سہولت ہی سہولت ہو۔ یعنی دن بھر گناہ ہونے کے بعد رات کو حق تعالیٰ سے دعا اور استغفار کر لیا کرو۔ جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا مگر ایک چیز کی اور ضرورت ہوگی وہ یہ ہے کہ میں نے اب تک تخم پاشی یعنی بیج ڈالنے کی ترکیب بتائی ہے میں نے ایک چھوٹا سا بیج ایسا بتایا ہے جس کی کاشت بہت آسان ہے لیکن جیسا کہ تخم پاشی کے بعد آب پاشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اگر پانی نہ دو وہ بیج پھوٹتا اور بڑھتا نہیں اسی طرح اس میں بھی ایک چیز کی اور ضرورت ہے اور وہ بھی آسان ہے۔ یعنی اللہ والوں کی صحبت خدا کے ان مقبول بندوں کی صحبت جن کو یہ درجہ نصیب ہو چکا ہے یہ آب پاشی ہے اسی تخم پاشی کے بعد مگر اس میں جانچ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ہر شخص کو دیکھ کر عاشق نہ ہو جانا یعنی لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ مذاق بگڑا ہوا ہے آج کل بہت سے سیاح پھرتے ہیں اور لوگوں کو پھانستے پھرتے ہیں اور لوگوں کی بھی یہ حالت ہے:

لختے بر داز دل گزرد ہر کہ ز پیشم — من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

(میرے سامنے سے ہر گزرنے والا دل کا ایک ٹکڑا لے جا رہا ہے' میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں)

ہر شخص کے معتقد ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہ چاہیے۔ ہر شخص اللہ والا نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ پہچان بھی ہے۔

علامات شیخ کامل

اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ سب سے اول دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت کا بھی پابند ہے دوسرے یہ کہ دنیا کا لالچ تو اس میں نہیں' یہ پہچانیں میں اسی لیے بتلائے دیتا ہوں کہ دھوکہ میں نہ آویں رہزن کو رہبر نہ سمجھ لیں۔ تیسری بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس کی صحبت میں یہ دیکھے کہ دنیا کی محبت کتنی گھٹی حق تعالیٰ کی محبت کتنی بڑھی۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے پاس رہنے والوں میں سے اکثر کی حالت باامتیاز ترک معاصی وتقویٰ واہتمام حلال وحرام کے کیسی ہے۔ پانچویں علامت یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو روک ٹوک بھی کرتا ہو۔ چھٹی علامت یہ ہے کہ بہ ضرورت کے موافق علم دین رکھتا ہو اور علماء سے محبت رکھتا ہو۔ ساتویں علامت یہ ہے کہ اہل علم وصلاح بہ نسبت عوام کے اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اگر یہ علامتیں موجود ہیں تب تو وہ صحبت کے قابل ہے ورنہ:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہ ہر دستے نباید داد دست

(یعنی بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان زمین پر بستے ہیں اس لیے ہر کس وناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ بنے)

اور اس زمانے میں بالخصوص اس شخص کے ظاہری اعمال کے صالح ہونے پر نظر کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ بعض بدعقیدہ لوگ کہتے ہیں کہ بس صاحب اہل باطن ہونا چاہیے نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے صرف خدا کی یاد اپنے قلب کے اندر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس دھوکہ میں ہرگز نہ آنا اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گر انارے میخری خنداں بخر   تا دہد خندہ اش زدانہ اوخبر

آہ کیا عمدہ طریق تعلیم فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو وہ تو بڑے عارف ہیں۔ کہتے ہیں کہ انار خریدو تو بند محض نہ خریدو بلکہ کھلا ہوا خریدو۔

تا مبارک خنداں آں لالہ بود   کہ زخندہ او سواد دل نمود

یعنی ایک خندہ تو ہے انار کا جس سے اس کا نفیس ہونا معلوم ہوتا ہے اسی طرح اعمال ظاہری کے صالح ہونے سے معلوم ہوتا ہے ہاں یہ صاحب باطن ہے کیونکہ اعمال صالحہ کا

صدور اعتدال و استقامت کے ساتھ بدون صلاح منشا یعنی باطن کے نہیں ہوسکتا اور ایک خندہ ہے لالہ کا اوپر ہی سے اندر کی سیاہی نظر آتی ہے۔ اسی طرح اعمال فاسدہ سے باطن کی سیاہی پر استدلال ہوتا ہے۔ غرض خود اس کے اعمال بھی درست ہوں اور اس کی صحبت میں بھی یہ اثر ہو کہ دوسروں کے اعمال بھی درست ہو جائیں۔ اس شخص کی صحبت اکسیر اعظم ہے اور یہ جو میں نے اہل اللہ کی صحبت کو پانی سے تشبیہ دی ہے اس میں ایک اور بھی علمی فائدہ ہے وہ یہ کہ بعض لوگ فقط صحبت پر اکتفا کرتے ہیں خود عمل کچھ نہیں کرتے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے کھیت کے اندر سمندر کا سمندر کھینچ لے اور سارا دریا بہا لائے لیکن بیج نہ ڈالے تو اس میں کون سی چیز نکلے گی، سمندر کے اندر بیج تھوڑا ہی موجود ہے۔ مطلب یہ کہ بیج تو ہو عمل اور پانی ہو صحبت اس وقت یہ حالت ہوگی جس کو حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے: "الم تر ان اللّٰہ انزل من السمآء مآء فتصبح الارض مخضرۃ الآیۃ" اور آپ دیکھیں گے کہ انشاء اللہ اس چھوٹے سے بیج سے وہ درخت نکلے گا کہ سارے عالم پر چھا جائے گا۔

صحبت اہل اللہ کے دو درجے

پھر اس صحبت کے دو درجے ہیں اگر اہل حق کی صحبت حسیہ بھی میسر ہو یہ تو بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں مولانا

صحبت نیکاں اگر یک ساعت ست بہتر از صد سالہ زہد و طاعت ست

(نیک لوگوں کی ایک گھڑی کی صحبت سو سال کے زہد و طاعت سے بہتر ہے)

اور اسی طرح اہل حق کی صحبت کے مقابلہ میں اہل باطل کی صحبت کی یہ حالت ہے:

تا توانی دور شو از یار بد یار بد بدتر بود از مار بد

(یعنی حتی الوسع برے دوست سے دور رہو یار بد سانپ سے بھی بدتر ہے) کیوں

مار بد تنہا ہمیں برجاں زند یار بد برجان و بر ایماں زند

(زہریلا سانپ تو جان ہی کو مارتا ہے مگر برا دوست ایمان اور جان دونوں کو ختم کر دیتا ہے)

اور اگر اہل حق کی صحبت حسیہ میسر نہ ہو کیونکہ ہر شہر میں ایسے لوگ موجود نہیں ہوتے پھر دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے خط و کتابت رکھو مگر خالی یہی نہیں کہ نوٹ بھیجو یا روپیہ بھیجو یا

خیریت منگاؤ یا بیٹے کے واسطے تعویذ گنڈے منگاؤ خیر یہ بھی سہی کبھی کبھی اگر دوسرے کام سے فرصت ہو لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ جب لکھو اپنی بیماریاں لکھو اور اپنے معمولات لکھو کہ مجھ میں یہ یہ عیب ہیں یہ یہ کررہا ہوں اب آئندہ میں کیا کروں جیسے اگر طبیب کے پاس ہو تب تو سبحان اللہ اور اگر دور ہو تو خط میں جو حال ہو وہ لکھو اور جو نسخہ وہ تجویز کر کے بھیجے اسے برتو' برتنے کے بعد پھر حال لکھو۔

حقوق شیخ

غرض دو چیزوں کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھو اطلاع اور اتباع یعنی احوال کی اطلاع اور اوامر کا اتباع۔ اسی طرح اتباع کے بعد پھر اطلاع پھر اس اطلاع کے بعد اتباع پھر اطلاع پھر اتباع۔ غرض

اندریں رہ می تراش و می خراش　　　تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس راستہ میں خوب کوشش کر آخر دم تک بے کار مت رہ)

یہ تو ساری عمر کا دھندا ہے۔ جب بیماری ساری عمر کی ہے تو علاج ساری عمر کا کیوں نہ ہوگا۔ گولشتم پشتم ہی سہی حتیٰ کہ دو مہینے ہی میں ایک خط لکھو مگر لکھو ضرور اور یہ لکھتے ہوئے شرماؤ نہیں کہ وظیفہ جو بتایا تھا وہ چھوٹ گیا تھا یا مطالعہ کتب جو تجویز کیا تھا اسے نباہا نہیں۔ یہاں تک کہ فرض نماز بھی فرض کرو قضا ہونے لگی ہو تب بھی شرماؤ نہیں بلکہ اب پھر پڑھنا شروع کردو اور اطلاع کردو شرمانا اس رستہ میں ہرگز نہیں چاہیے۔ خواہ کیسی ہی گندی حالت کیوں نہ ہو جائے اس کی بھی اطلاع کردو۔ ایک دریا تھا اس کے کنارے کے پاس سے ایک ناپاک آدمی گزرا' دریا نے اس سے کہا کہ آ میں تجھے پاک کردوں' اس نے کہا تو صاف وشفاف اور میں پلید و ناپاک میرا منہ کیا کہ میں تیرے پاس آؤں' پاک ہو کر تیرے پاس آؤں گا' دریا نے کہا بچہ جی پاک کروں گا بھی میں ہی اگر تم مجھ سے شرماؤ گے تو ساری عمر ناپاک ہی رہو گے۔ بس ایک دفعہ بے حیا ہو کر آنکھیں بند کر کے میرے اندر کود پڑو مجھ میں ایک موج اُٹھے گی اور تمہارے سر پر کو ہو کر اُتر جائے گی اور تمہیں ایک دم میں پاک صاف کردے گی تو اہل اللہ سے اپنا کچا چٹھا کہہ دو بہت سے لوگ اس لیے نہیں کہتے کہ ہماری

شان گھٹ جاوے گی۔ ارے ان کے نزدیک تیری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاوے گی بعضے ڈرتے ہیں کہ خفا ہوں گے ارے ان کی خفگی بھی رحمت ہے یہ ساری تکبر کی باتیں ہیں ارے وہ پھانسی بھی دیدیں گے تو اس میں بھی تیری بہتری ہی ہوگی اس واسطے کہ

ہمچو اسماعیل پیشش سر بنہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح اس کے سامنے اپنا سر جھکا دے' ہنستے کھیلتے اس کی تلوار کے سامنے جان دے دے)

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست نائب ست او دست او دست خداست

(جو جان دینے والا ہے وہ اگر مار ڈالے تو جائز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لیے یہ فعل جائز ہے تو کبھی خود کرتے ہیں کبھی نائب سے کراتے ہیں)

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست نائب ست او دست او دست خداست

تو اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ غرض خفگی وغیرہ کا بالکل خیال نہ کرو۔ بس اس طرح سے تعلق رکھو کہ اگر اس کی طرف سے خفگی ہو نکال دے پھر بھی تعلق قطع نہ کرؤ وہ نکال دے تو تم مت نکلو اس وقت تو نکل جاؤ مگر پھر آ جاؤ پھر نکال دے پھر نکل جاؤ پھر آ جاؤ' پھر نکل جاؤ' پھر آ جاؤ' پھر نکل جاؤ' پھر آ جاؤ' غرض اسے چھوڑ و مت وہ قصائی نہیں ہے وہ اگر سختی بھی کرتا ہے تو محض تمہاری مصلحت سے کیونکہ

درشتی و نرمی بہم در بہ است چو رگ زن کہ جراح و مرہم بہ است

(سختی اور نرمی ساتھ ساتھ اچھی ہوتی ہیں جس طرح فصد کھولنے والا کہ نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے)

سیر کی روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام میرے ساتھ اس طرح رہو جس طرح بچہ ماں کے ساتھ رہتا ہے انہوں نے تفسیر پوچھی ارشاد ہوا کہ بچہ کو ماں مارتی ہے مگر وہ بچہ پھر اسی سے چمٹتا ہے مگر یہ علاقہ صرف اس سے رکھو جو واقعی اہل اللہ ہو لیکن چونکہ یہاں سے ہر روز تو خط جاتا نہیں اور وہاں سے ہر روز خط آتا نہیں پھر اس درمیان میں کیا کرو یہ کرو کہ حکایات اور ملفوظات اہل تقویٰ کے مطالعہ میں رکھو۔ بس خلاصہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہو۔

ضرورت مطالعہ کتب اور اصلاحی خط و کتابت

اگر صحبت میسر نہ ہو سکے تو خط و کتابت کے ساتھ مطالعہ کتب کا بہت غور سے کرو یہ اس کا بدل ہے:

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب   بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

(چونکہ موسم گل ختم ہو گیا اور چمن اجڑ گیا۔ گلاب تو رہا نہیں جس سے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے ہی خوشبو حاصل کرو)

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش جز چراغ

(چونکہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اس لیے اس کی جگہ اب چراغ سے ہی کام لو)

اسی طرح اگر اس کی مفارقت دنیا سے ہو جائے یا ہم سے ہو جائے یوں ہی کرنا چاہیے:

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی اگر آفتاب نہ ہو تو میاں چراغ ہی جلالو کیونکہ ہر جگہ تو آفتاب ہر وقت نہیں رہ سکتا تو خیر اس کا بدل سہی یہ نہ کرو کہ کھاؤں گا گھی سے نہیں جاؤں گا جی سے۔ مطالعہ کتب کی نسبت فرماتے ہیں:

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست   صراحی مے ناب و سفینہ غزل ست

اصلاح باطن کا آسان طریقہ

نیز اگر شیخ کی صحبت میسر نہ ہو تو پیر بھائی بھی غنیمت ہے اس تعلق کے لیے یہ ضرور نہیں کہ مرید ہی ہو جاؤ بس اپنے کو سپرد کر دو کیونکہ غلام بنے کسی کے صحبت اہل اللہ اور ان کے بجائے ان کے ملفوظات کے متعلق عارف شیرازی کی رائے مجھ کو بہت ہی پسند آئی۔ فرماتے ہیں:

مقام امن و مئے بے غش و رفیق شفیق   گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(یعنی اطمینان کی جگہ اور ذکر و شغل اور کسی محقق اور مشفق شیخ کی صحبت ہمیشہ میسر رہے تو کیا بات ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر)

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است   صراحی مے ناب و سفینہ غزل ست

صراحی مے ناب ذکر اللہ ہے اور سفینہ غزل ہو یہ ملفوظات ہیں۔ بزرگوں کے، حضرات میں نے یہ ایک دستور العمل مختصر سا تجویز کر دیا ہے جو کسی پر بھی دشوار نہیں اور اگر

اس پر بھی عمل نہ کیا تو پھر میں یہ کہوں گا:

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

خوب سمجھ لیجئے حجت اللہ ختم ہو چکی ہے اب آپ کے پاس کوئی عذر نہیں رہا ہے خدا کے سامنے یہاں تک تو آپ کو رخصت دے دی گئی کہ اگر عمل کی طرف توجہ نہیں ہے تو اس بے توجہی عمل کا اقرار اور توجہ پیدا ہونے کی دعا تو کر لیا کرو۔ یہ اخیر بات ہے اب اس سے آگے اور کیا چاہتے ہو۔ غرض یہ ہے اسلام کی تفسیر اور اس کی تکمیل کی تیسیر۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمت قویہ اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ (پھر ہاتھ اٹھا کر اس طرح دعا شروع کی "**اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضٰی**" پھر آہستہ آہستہ دعا مانگتے رہے بعد ختم دعا احقر سے فرمایا ۱۲ کاتب) اس بیان کا نام ملت ابراہیم مناسب ہے کیونکہ مولوی صاحب (یعنی خطیب جامع مسجد مولوی محمد ابراہیم صاحب راندیری محرک سفر و وعظ ۱۲ کاتب) کا یہی نام ہے (اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ اتوار کے دن آٹھ بجے دن کو مدرسہ میں وعظ ہوگا)

مختصر کیفیت وعظ

الحمدللہ رنگون کا یہ پہلا وعظ جو نہایت زور وشور کے ساتھ اڑھائی گھنٹہ تک ہوتا رہا ختم ہوا۔ بفضلہ تعالیٰ بہت زیادہ مجمع تھا جس کا تخمینہ زائد از دو ہزار کیا گیا۔ سب لوگ نہایت متاثر تھے اور نہایت سکون کے ساتھ سنتے رہے بعد وعظ بے حد اشتیاق کے ساتھ لوگوں نے مصافحہ کیا ایک دوسرے پر گرتا تھا بڑی مشکل سے وار آتا تھا۔ حضرت نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے تھے اور لوگ تھے کہ مشتاقانہ بڑھ بڑھ کر چوم رہے تھے اور پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے ایسے موقع پر حضرت پر ایک عجیب حالت انکسار اور تواضع کی طاری ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت دوران مصافحہ میں ہر شخص کی طرف نظر توجہ بھی ڈالتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہتا۔ غرض عجیب دلفریب منظر ہوتا ہے اور اس وقت حضرت پر ایک عجیب شان محبوبیت برتی ہے۔ (ختم شد)

تمت بالخیر

تین نایاب مواعظ

یہ مواعظ پہلی مرتبہ شائع ہورہے ہیں۔ جو رسالہ "احوال وآثار" سے نقل کئے جارہے ہیں۔ جن کو حضرت مولانا ناظر حسن فاروقی تھانوی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا تھا۔

پہلا وعظ

(جو ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ کو کیرانہ میں ہوا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یایھا الذین امنوا لاتلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ ومن یفعل ذٰلک فاولئک ھم الخسرون. (المنافقون: ۹)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پاویں اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔''

یہاں سب سے پہلے جاننا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ہم لوگوں کے حال پر اللہ جل جلالہ و عم نوالہ کی بہت بڑی عنایت اور بہت بڑی شفقت اور بہت بڑی مہربانی ہے کہ جو کام ہمارے کرنے کے تھے خود کرتے ہیں۔ ''سبقت رحمتی علی غضبی'' کا مضمون ہے۔ اس تقریر سے کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ صاحب جو کام ہمارے کرنے کے تھے اللہ تعالیٰ نے خود کیے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع اور فائدہ ہوگا۔ تب تو اللہ تعالیٰ نے خود کیے۔ حدیث قدسی ہے اس سے خوب پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں کہ جتنے مسلمان ہیں وہ ہماری اطاعت کریں' تب بھی ہمارا ملک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں بڑھ سکتا ہے۔ ایسے ہی برعکس اس کے' عین تمام کافر تو ہیں ہی کہ وہ ہماری اطاعت نہیں کرتے ہیں۔ اگر تمام مسلمان بھی ایسے ہی ہو جائیں کہ وہ ہماری اطاعت نہ کریں' تب بھی ہمارے ملک میں ایک مچھر کے پر کے برابر نہیں گھٹ سکتا ہے۔ اس حدیث سے خوب اور صاف طور سے معلوم

ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع اور فائدہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بطور شفقت اور رحمت کے عنایت کردیئے ہیں کہ یہ کہاں کریں گے ہم ہی کردیں گے۔ واقع میں ان کاموں کا کرنا ہم ہی کو مناسب اور لائق تھا کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں اگر کوئی کسی کا عاشق ہوتا ہے کیسی کیسی خاطریں ولداری اور ناز برداریاں کرتا ہے اس معشوق کی اور ہر وقت اس کا تردد رہتا ہے کہ شاید کہ ناراض تو نہیں ہوگیا' کہیں خفا تو نہیں ہوگیا اور ان سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ اس کے بغیر دل کو راحت اور چین حاصل نہیں ہوتی ہے اگر وہ معشوق کچھ کہہ دیتا ہے تو اس کو بہت غنیمت سمجھا کرتا ہے کہ بڑے عنایت فرما اور کرم فرما ہیں کہ جو کام اپنی طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں اس کو کہہ دیتے ہیں۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخر (الفتح: ۲)

''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔''

کوئی حاجت نہیں ہے کہ اس میں تاویل کی جائے کہ صاحب! تقدم سے وہ لغزشیں مراد ہیں جو کہ جاہلیت میں ہوئی تھیں آپ سے اور تاخیر سے وہ مراد ہیں جو کہ بعد رسالت ہوئی ہیں یا ابھی تک نہیں ہوئیں' وہ سب معاف کردیں۔

کوئی حاجت اس تاویل کی نہیں ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کے بہت بڑے عاشق تھے اور عاشق کی کیفیت ذکر کرچکا ہوں' پس تو اسی طرح سے آپ کے دل مبارک میں خیال گزرتے تھے' اسی واسطے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وماتاخر

اتنا فرمادینا اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کا آپ کے قلب کو راحت دے دیتا اور رہا یہ امر کہ ''ذنبک'' کیوں کہا' اس لیے کہ جب گناہ نہیں تھا پھر کیا حاجت تھی اس کی' وجہ یہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے فرمادیا چونکہ آپ اس کو سمجھے ہوئے تھے گناہ' اس واسطے اللہ تعالیٰ نے ''ذنبک'' لفظ فرمایا' یا یہ کہا جائے کہ آپ کے گناہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی اُمت کے گناہ مقصود تھے' وہ بھی معاف کیے۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت بدلی یا آندھیاں وغیرہ آتی تھیں تو آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہوجاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرمایا کرتی تھیں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ

وسلم) کیا حال ہے؟ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا کرتے تھے اے عائشہؓ تو نہیں جانتی ہے' کیا وجہ تھی' یہی وجہ تھی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پورے عاشق' اللہ جل شانہ کے تھے تو بوجہ خوف کے آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ شاید کہ کہیں عذاب نہ ہو' جیسا کہ امم سابقہ (پچھلی اُمتوں) پر آیا تھا حالانکہ حق تعالیٰ قرآن میں فرما چکے تھے۔

وما کان اللّٰہ لیعذبھم وانت فیھم (الانفال: ۲۴)

ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دیں۔"

آیت موجود ہے اس سے یہ حال ہو جاتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کامل عاشق تھے۔ واقع میں اللہ جل جلالہ وعم نوالہ اگر خود نہ فرماتے تو سر پکڑ کر بیٹھے رہتے۔ تب بھی ہم کو معلوم نہ ہوتا۔ اب آگے اللہ میاں ان کاموں کو ارشاد فرماتے ہیں جو ہمارے کرنے کے تھے' خود کیے ہیں۔ فرماتے ہیں: "یایھا الذین اٰمنوا" (ترجمہ: اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو)

اب دیکھنا چاہیے کہ اللہ جل شانہ کیسے پیارے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ کلمہ "یا" کے ساتھ اللہ اللہ! یہ کلمہ ہے تو چھوٹا سا مگر بڑی عنایت اور شفقت اور مہربانی کا ہے کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر حاکم بالا کسی ادنیٰ ملازم کو بلا کر اس سے گفتگو کرے تو وہ اس کو اپنے فخر کا باعث' سرفرازی کا باعث اور امتیاز کا باعث سمجھا کرتا ہے اور وجہ اس "یا" کے ساتھ خطاب کرنے کی یہ ہے کہ انسان جو ہے اس کے درمیان یہی نسبت ہے۔

یہی تو وجہ ہے کہ جب اللہ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا! تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ کہا عصا ہے' ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور پتے بکریوں کے واسطے جھاڑتا ہوں اور دوسرے منافع ہیں۔ اب ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بے ادبی کی کیونکہ جس بات کا سوال کیا گیا تھا صرف اسی کا مختصر جواب دینا چاہیے تھا' یہ الفاظ کیوں بڑھائے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عاشق تھے۔ انہوں نے جس وقت کلمہ "یا" کی آواز سنی مدہوش ہو گئے کہ اس وقت محبوب خود ہی حال دریافت کر رہا ہے۔ پس نہ رہ سکے' سب حال کہہ دیا۔ یہی وجہ ہے اس کی۔ قرآن شریف کی وہ آیت:

انّا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال (الاحزاب: ۷۲)

ترجمہ: "ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔"

دیکھئے! اس آیت میں کہیں یہ مذکور نہیں ہے کہ صاحب' انسان پر بھی ہم نے یہ امانت پیش کی مگر پھر بھی انسان نے جو اٹھالی اس کی یہی وجہ تھی کہ جس وقت اللہ جل شانہ نے پیش کی آسمانوں پر' زمینوں پر اور پہاڑوں پر۔ یہ حضرت بھی وہاں کھڑے تھے' کہا لایئے میں اٹھالوں۔ تو اوروں میں خطاب کی لذت نہ تھی' اسی واسطے انہوں نے نہ اٹھائی اور انسان نے غنیمت سمجھا کہ ان (حق تعالیٰ شانہ) سے اسی طرح باتیں ہوا کریں گی اور تو کسی طرح ان سے باتیں ہو نہیں سکتی تھیں۔ ضرور (ہے) کہ جب ان سے امانت رکھائیں گے اسکے بارے میں کچھ کہتے رہیں گے' اسکی مثال ایسی ہے جیسا کہ مثلاً کوئی شخص بازار جائے اور جا کر (ایک) گٹھا لکڑی کا خرید لے اور ایک شخص کے سر پر رکھوا کر گھر لائے تو ضروری ہے کہ راہ میں اس سے باتیں کرے گا۔ کہے گا اس کو اچھی طرح سے رکھئے' آگے کو اور پیچھے کو کر لے' دیکھ کھل نہ جائے۔

پیارا خطاب کر کے تھوڑا سا انتظار دلایا' وجہ انتظار دینے کی یہ ہے کہ جو چیز بغیر محنت اور مشقت کی حاصل ہو جاتی ہے اس کی کچھ قدر اور وقعت نہیں ہوتی اور دیکھئے بہت انتظار (بھی) نہیں دلایا تا کہ وہ مضمون صادق نہ آ جائے: "الانتظار اشد من الموت" (انتظار موت سے بھی سخت ہے)

اس واسطے تھوڑا سا انتظار دلایا اور (اس لفظ سے) خطاب کے بعد فرماتے ہیں: امنوا! یعنی جو کچھ ہم کہیں گے وہ ضرور کریں گے' ایسی بات نہیں جو وہ ہمارے کہنے کو ڈال دیں اور نہ مانیں بلکہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ ضرور کریں گے۔ آگے فرماتے ہیں:

لاتلکھکم اموالکم ولا اولادکم

ترجمہ: "نہ غفلت میں ڈالیں تم لوگوں کو مال تمہارے اور اولاد تمہاری"

دیکھئے! اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کی بہت بڑی شفقت اور رحمت ہے اور یہ نہیں فرمایا: "لاتلھکم الاموال والاولاد" اس واسطے اگر ایسے فرماتے تو لوگ سن کر گھبرا جاتے کہ مال اور اولاد کا رکھنا اچھا نہیں ہے' اس سب بکھیڑے (کو چھوڑو) اور علیحدہ کرو حالانکہ مال کا اور اولاد کا ہونا فی نفسہ بری چیز نہیں۔ اولاد کے واسطے اللہ جل جلالہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ارشاد فرماتے ہیں:

ولقد ارسلنا رسلاً من قبلک وجعلنا لھم ازواجاً وّ ذریة (الرعد:۳۸)

ترجمہ: ''اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے۔''

یعنی جتنے آپ سے پہلے نبی گزرے ہیں سب کے بیبیاں تھیں اور مال کے واسطے حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو بھیجا کہ جاؤ فلاں شخص کو بلالاؤ اور کہو اپنے ہتھیار لگا کر جاؤ' جب وہ ہتھیار لگا کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تو فرمایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' میں چاہتا ہوں کہ میں تم کو فلاں جگہ بھیجوں' جب تم وہاں سے مال غنیمت لے کر لوٹو تو میں تم کو اس میں سے حصہ دوں۔ انہوں نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے ہجرت اس واسطے نہیں کی کہ مال اور دولت حاصل کریں بلکہ محض رضا مندی خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ اگر مال اچھا ہو اور مرد صالح ہو' کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال ہونا فی نفسہ بری بات نہیں ہے۔ اوپر کے لفظوں سے یعنی ''یایها الذین آمنوا'' سے اشارہ ہو گیا۔ ایسے امر کی طرف کہ اللہ تعالیٰ ایسا کوئی امر ارشاد فرماتے ہیں کہ جس سے دل کو چین اور راحت حاصل ہو۔ وہ کیا ہے' ذکر اللہ ہے اس واسطے تعلیم فرمایا دیکھو تمہاری اولاد اس سے کہیں غافل نہ کر دیں۔

ذکر اللہ کی یہ تفصیل ہو سکتی ہے کہ جتنے منہیات (بری باتیں) تھیں ان سے بچنا اور جتنے امر بالمعروف ہیں ان کو بجالانا۔ آگے فرماتے ہیں:

ومن یفعل ذٰلک فاولئک هم الخسرون۔ (المنافقون: ۹)

ترجمہ: ''اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔''

دیکھئے اس موقع پر یہ نہیں فرمایا:

فان تفعلوا فاولئک هم الخسرون

واقع میں موقع محل تو یہی تھا کہ ''فان تفعلوا'' فرماتے مگر نہیں فرمایا اس لیے کہ اوپر ایسے لفظوں سے خطاب کر چکے تھے کہ جس سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہمارے خلاف ہرگز نہیں کریں گے۔ اگر ''فان تفعلوا'' فرماتے تو معلوم ہوتا کہ خلاف ضرور ہی کریں گے۔ اس واسطے قصہ کے طور پر فرمایا کہ جو شخص کرے گا اسی کا نقصان ہے' ہمارا کوئی نفع اور نقصان نہیں ہے۔

دوسرا وعظ

(یہ وعظ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ ۱۸ جون ۱۸۹۵ء کو کیرانہ میں فرمایا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الم نجعل الارض مھداً والجبال اوتاداً وخلقنکم ازواجاً وجعلنا نومکم سباتاً وجعلنا الليل لباساً وجعلنا النهار معاشاً. (النباء: ۶-۸)

ترجمہ: ''کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا اور ہم ہی نے تم کو جوڑا بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا۔'' اس سے پہلے اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے کافروں کو جواب مجملاً ارشاد فرمایا تھا کما نہ ''کلا سوف تعلمون'' قریب ہے کہ تم جان لوگے'' کیونکہ وہ قیامت کا انکار کررہے تھے' اس واسطے فرمایا' گھبراؤ مت' جان جاؤ گے۔ اب تفصیلاً ارشاد فرماتے ہیں: **الم نجعل الارض مھداً والجبال اوتاداً** اس میں دو تقریریں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہا جائے کہ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے اس آیت میں ان کو بالدلائل جواب دیا ہے یا یہ کہا جائے کہ اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے اس آیت میں اپنی نعمتیں جمع کردی ہیں۔ ان سے ان کو جواب دیا تو اول صورت یہ معنی ہوتے ہیں:

الم نجعل الارض مھداً ترجمہ: ''کیا نہیں کیا ہم نے زمین کو بچھونا۔''

بچھونے کی کیا صفت ہے۔ وہ یہی کہ نہ تو بہت نرم ہو اور نہ بہت سخت ہو۔ اس واسطے کہ اگر بہت نرم ہوگا تب بھی اس سے نفع حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ نرم کی مثال تو ایسے ہے جیسے کہ روئی کہ اگر بہت سا ڈھیر لگادیا جائے اور اس میں کوئی شخص لیٹے تو غرق ہوجائے گا تو زمین کو اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے ایسا نرم نہیں بنایا' ایسا بنادیتے تو اس میں نفع نہیں ہوسکتا تھا اور سخت کی مثال جیسے کہ لوہا' اگر ایسی سخت بنادیتے تب بھی نفع حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ وجہ نرم بنانے کی یہ ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ وہ چارپائی اور تخت وغیرہ کو جانتے بھی نہیں' ہمیشہ زمین پر سویا کرتے ہیں۔

بشر حافی ایک بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ تشریف لے جارہے تھے' انہوں نے سنا ایک قاری کو وہ پڑھ رہا ہے: **والارض فرشنھا فنعم المھدون۔** (الذاریات: ۵۱)

ترجمہ: ''اور ہم نے زمین کو فرش بنایا' سو ہم اچھے بچھانے والے ہیں۔''

انہوں نے اس کو سن کر فرمایا کہ دنیا کے جو امراء ہیں ان کے فرش فروش پر ہم جوتیاں لے کر نہیں جاتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا ایسا فرش ہے کہ ہم اس پر جوتیاں لیے پھرتے ہیں۔ اسی روز سے انہوں نے جوتیاں پیر مبارک سے دور کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو قاعدہ یہی ہے جو ان کا ہو رہتا ہے وہ اس کے ہو جاتے ہیں۔ تمام چرند و پرند کو حکم دیا کہ راہ میں کوئی بیٹ نہ کرے ہمارے بندہ کا پیر آلودہ ہو جائے گا۔ تب راہ میں کوچہ میں جانوروں نے بیٹ کا کرنا موقوف کر دیا۔ ان کے زمانے میں ایک اور بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک روز بیٹ پڑی ہوئی دیکھی' کہا شاید کہ بزرگ (بشر حافی) کا انتقال ہو گیا ہے۔ لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ واقعتاً انتقال ہو گیا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے (زمین) نرم بنائی۔ یہ صفت ہے بچھونے کی۔

آگے فرماتے ہیں: والجبال اوتاداً ترجمہ: ''کیا نہیں کیا ہم نے پہاڑوں کو اوتاد۔''

یعنی جب کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بنایا تھا اس وقت یہ ڈولتی تھی اور ہلتی تھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑوں کو پیدا کیا۔ تب یہ ڈولنے اور ہلنے سے باز آئی۔ جیسا کہ کوئی شے ہلتی ہو اس پر میخ ٹھونک دیتے ہیں تو وہ ہلنے سے باز آ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ نے پہاڑوں کو میخیں بنا دیا ہے۔

اور دیکھئے! یہ نہیں ہے کہ فقط پہاڑوں کو بنا دیا' نہیں بلکہ ان کے درمیان میں معدنیات اور کانیں ہر قسم کی چیزیں رکھیں۔ اس کے بعد جو اس زمانہ میں انبیاء علیہم السلام تھے ان کو وحی کی' ان پہاڑوں کے درمیان سے چاندی نکلوا کر اس کو ڈھلواؤ بعد کو اس کا سکہ بناؤ اور ایسا روپیہ بناؤ علیٰ ہذا القیاس! تانبہ اور سیسہ کی وحی کی۔ ان میں سے نکلوا کر اس کا پیسہ اور اشرفیاں بنائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ سبحانہ ان کو وحی نہ کرتے تو بڑی مشکل پیش آتی۔ ایسا ہوتا مثلاً کہ ایک شخص کپڑا بنتا ہے اور دوسرا کھیتی کرتا ہے۔ اب یہ کھیتی کرنے والا اس کے پاس جاتا اور کہتا کہ میں گیہوں لے چکا ہوں اب مجھ کو جوتے کی حاجت ہے۔ وہ اس تلاش میں مر جاتا' جوتا اس کو کہیں نہیں ملتا' اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے وحی کر کے اس کو معلوم کرا دیا' ایسا کرو جبکہ روپیہ پیسہ تیار ہو گیا اور اب یہ اس کپڑے والے کے پاس گیا اور کہا کہ یہ روپیہ لے لے اور کپڑے دے دے' اس نے ان سے لے لیا' اگرچہ اس کو اس کی حاجت نہ تھی مگر دیگر پہر (وقت) اور کام آ جائے گا ان سے لے کر جوتا خریدا یا اس کو اٹھا کر رکھ لیا' غور کرنے کا مقام ہے کتنی بڑی اللہ جل شانہ کی شفقت اور رحمت ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

وخلقنکم ازواجاً۔ (النباء:۸) ترجمہ: ''اور ہم نے تم کو جوڑا بنایا۔''

تمہارے توالد اور تناسل کیلئے کیا عمدہ انتظام کر دیا ہے۔ دیکھئے! یہ نکاح کرنا ایسی سنت ہے کہ جتنے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں سب اس کو بجا لائے۔ سوائے یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے۔ ان دونوں صاحبوں نے نکاح نہیں کیا کیونکہ یحییٰ علیہ السلام پر مقام خوف کا غالب تھا اور عیسیٰ علیہ السلام

پر مقام تجرید کا غالب تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ جس شخص کی ایسی حالت ہو تو وہ نہ کرے' کوئی حرج نہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے اور آ کر شادی کریں گے اور اولاد ہوگی۔ اس میں اشارہ اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف کر دیا ہے کہ جو شخص ایسا ہو کہ اس پر اول میں ایسی حالت ہو اور وہ نکاح نہ کر سکے۔ اگر بعد میں کرے گا کچھ حرج نہیں اور یحییٰ علیہ السلام کا بالکل ہو گا ہی نہیں۔

نبی جو ہوتا ہے اس کے قول اور فعل دونوں کا اتباع ہوتا ہے اور شیخ جو ہوتا ہے اس کے قول کا اتباع ہوتا ہے' فعل کا اتباع نہیں ہوتا۔ اس کی حالت سمجھ میں نہیں آ سکتی ہے ان پر مقام ہر طرح منکشف ہوتے ہیں اور عام لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ شریعت کے خلاف ہے حالانکہ وہ شریعت کے خلاف نہیں ہوتے۔ بس یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کی حالت نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں اگر شیخ کہہ دے کہ میرا اتباع کرو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے وہ بھی (اتباع) قولی ہوگا' فعلی نہیں ہوگا۔ پس یہ دونوں باتیں سمجھ میں آ گئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع قول و فعل دونوں میں ہوتا ہے اور شیخ کا فقط قول میں ہوتا ہے۔

اگر کسی دلیل قطعی سے معلوم ہوا کہ یہ فعل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مختص ہے تو البتہ اس فعل میں اتباع نہیں کریں گے۔ جیسا کہ نو بیویوں کا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔ اب کوئی شخص نو بیویاں نہیں رکھ سکتا کیونکہ کلام اللہ میں مذکور ہے:

مثنٰی وثُلٰث ورُبع فان خفتم الا تعدلوا فواحدة. (النساء: ۴)

ترجمہ: "دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے' پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو۔" اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا اگر چاہیں دو کرنی یا تین کرنی یا چار کرنی مگر کب ہے جب کہ عدل کر سکیں' اگر عدل نہ کر سکیں "**فواحدة**" یعنی بس ایک۔ اس زمانہ میں تو عدل ہونا بہت مشکل ہے۔ عدل بدون تین چیزوں کے نہیں ہو سکتا۔

اول تو مال وافر ہونا چاہیے تاکہ سب کو علیحدہ علیحدہ دے۔ اس واسطے کہ اگر مال وافر نہیں ہوتا ہے تو بڑی خرابی ہوتی ہے۔ لڑائی جھگڑا ہوتا ہے' دوسرے انتظام بھی ہونا چاہیے۔ (تیسری شرط ناقل وعظ نے درج نہیں کی' جگہ سادہ چھوڑ رکھی ہے۔ نور)

پس معلوم ہوا کہ نکاح دین کے کاموں میں سے ہے۔ جیسا کہ دین کے اور کام کرتے ہو۔ ایسے ہی اس کو بھی کرنا چاہیے۔ اس زمانہ میں لوگوں نے بہت بری بری فحش باتیں نکالی ہیں' ناچ بھی ہوا اور رنگ بھی ہوا اور انگریزی باجہ وغیرہ بھی آئے۔ (اس کے بعد) کیا ہوتا ہے' یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے پاس روپیہ ہے تو اس کو ختم کر دیں گے ورنہ جائیداد (رہن کر کے) قرض لے کر صرف کریں گے۔ کل کو پھر جائیداد وغیرہ تو سب نیلام ہو جائیں گے یہ حضرت قرض دیتے دیتے اور

مفلس ہوجائیں گے۔ یہ تو (ظاہری) تباہی ان کی ہوجائے گی اور اس امر کو بوجہ نہ کرنے امر شرع کے طور پر توشہ اور دلہن سے اولاد بری پیدا ہوگی اور ماں باپ کے حق کو کچھ نہ سمجھیں گے اور ان کی اطاعت نہ کریں گے یا دونوں میں نااتفاقی ہوجائے گی، رنڈیوں وغیرہ میں جائے گا، بیوی صاحبہ کسی درویش کے پاس جاتی ہیں کہ صاحب تعویذ لکھ دو کہ مجھ سے محبت ہوجائے یہ سب باعث شرع کے حکم پر عمل نہ کرنے کا ہے۔ اگر اس کو ایسے ہی کرتے ہو تو نماز بھی ایسی پڑھنی چاہیے کہ گلے میں ڈھول پڑا ہو اور مجرا ہو رہا ہو (یہ فقرہ طنز کے طور پر فرمایا ہے۔نور) نکاح بے چارے نے کیا خطا کی کہ اس کو دین کے کاموں کی طرح نہ کیا جائے اور ان خرابیوں میں مبتلا ہوا جائے۔

آگے فرماتے ہیں: وجعلنا نومکم سباتاً (النباء: ۹)

ترجمہ: ''اور ہم نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا۔''

دیکھئے سونا (نیند) اللہ تعالیٰ نے کیسی اچھی چیز بنادی ہے۔ اگر مثلاً کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ ایک وقت نہیں سویا تو اس کے سامنے عمدہ عمدہ کھانے رکھے ہوں تو اس کو کچھ بھی لذت حاصل نہیں ہوگی کیونکہ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار ہوگا۔ علاوہ اس کے ایک اور بڑی بات ہے اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ سونے سے ان کے مقامات طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب سلمہ فرماتے تھے کہ ایک بزرگ تھے وہ سویا بہت کرتے تھے، جہاں فرض اور سنتیں پڑھ چکے تکیہ لیا اور لیٹ رہے اور فرماتے تھے کہ یہ بڑے عارف تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس قسم کے ہوں اور ان کی حالت سمجھ میں نہ آتی ہو ان پر اعتراض نہ کرنا چاہیے، آدمی کا پہچاننا بہت مشکل ہے۔ آگے فرماتے ہیں: وجعلنا اللیل لباساً (النباء: ۱۰) ترجمہ: ''اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا۔'' اس کے لباس کرنے کے بہت فائدے ہیں۔ یعنی جب کہ رات آتی ہے سب کا حال پوشیدہ ہوجاتا ہے جو گناہ کرتے ہیں ان کے گناہ بھی لیل (رات) پوشیدہ کرلیتی ہے اور جو عبادت کرتے ہیں وہ بھی لیل پوشیدہ کرلیتی ہے۔

دوسرے یہ امر ہے اگر دن ہی دن رہتا تو بڑی تکلیف ہوتی، سوتے کس وقت، دیکھئے دن کو اگر کوئی شخص سونا چاہتا ہے تو انتظام ضرور کرنا پڑتا ہے، اندھیری جگہ ہو یا پردہ ڈالا ہوا ہو، وجہ دن کو نیند نہ آنے کی یہ ہے کہ جب دو نور ہوتے ہیں، ایک نور دوسرے نور کی طرف رجحان کیا کرتا ہے کیونکہ روح بھی ایک نور ہے اور آفتاب بھی نور ہے۔ پس تو روح جو ہے وہ رجحان کیا کرتی ہے آفتاب کی طرف۔ اگر پردہ وغیرہ ڈال کر اندھیرا کرلیتے ہیں تو بہت جلدی نیند آجاتی ہے۔ جب اندھیرا ہو روح اپنے قلعہ میں پہنچی اور تیسرے یہ امر اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کے جو عاشق ہیں، رات کو ان کا وقت باتوں کا بنادیا۔ اس واسطے کہ اگر وہ بیٹھ کر کچھ کریں گے تو لوگ ان کو مکار اور ریا کار سمجھیں گے، اس واسطے ان کا وقت علیحدہ مقرر فرمادیا؟

چاہے مراقبہ کریں چاہے تہجد کی نماز پڑھیں یا اپنا ذکر و شغل کریں، دیکھئے اتنے فائدے ہیں۔
آگے فرماتے ہیں: وجعلنا النهار معاشاً ترجمہ: ''اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا۔''
اگر مثلاً رات ہی رات رہتی طبیعت گھبرا جاتی اور دوسری بات یہ کہ کماتے کس وقت۔ اس واسطے فرماتے ہیں ہم نے دن میں تمہارا (ذریعہ) معاش بنادیا ہے تاکہ تم کھیتی وغیرہ کرو۔
یہ تقریر ہوئی جواب میں جب یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب بالدلائل دیئے ہیں۔ یعنی تم قیامت کا انکار کرتے ہو کیا نہیں بنادیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں، یعنی جب کہ ہم نے ایسے بڑے بڑے کام کیے تو کیا قیام کے کرنے پر ہم قادر نہیں ہیں۔
دوسری تقریر یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے اپنی نعمتوں کو جمع کردیا ہے۔ اس صورت میں یہ کہیں گے کہ: الم نجعل الارض مهٰداً ترجمہ: ''کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا'' دیکھو! کتنی بڑی ہماری نعمت ہے اور دوسری یہ کہ ہم نے پہاڑوں کو میخ بنادیا۔ اب دیکھئے! اگر اللہ جل جلالہ وعم نوالہ پہاڑوں کو میخیں نہ بناتے تو بڑی دقت اور تباہی پیش آتی۔ اس واسطے کہ جو شخص جہاز میں بیٹھ چکا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ جب موج آتی ہے سمندر میں تو گھڑی میں اِدھر گھڑی میں اُدھر، کوئی کام ایسے میں نہیں ہوسکتا تو ایسے ہی اگر اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو میخیں نہ بناتا تو مخلوق کوئی کام نہیں کرسکتی تھی، نہ کھیتی ہوتی نہ اور پیشہ ہوتا، دیکھئے یہ بھی بڑی نعمت ہے۔
اللہ تعالیٰ آگے فرماتے ہیں: وخلقنكم ازواجاً (النباء: ۸)
ترجمہ: ''اور ہم ہی نے تم کو جوڑا بنایا۔'' یعنی ہم نے تمہاری بقاء اور تولید کا بھی انتظام کردیا ہے۔ اگر اس کا انتظام نہ فرماتے تو دنیا چل نہیں سکتی تھی۔ آگے فرماتے ہیں: وجعلنا نومكم سباتاً ترجمہ: ''اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا'' اب یہاں سے اشیائے ستہ ضروریہ میں سے بعض اشیاء کو بیان فرماتے ہیں۔ ہر چند کہ ضروری تو سب ہی تھیں مگر یہ سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے بقاء تولید کا تو علیحدہ انتظام فرمایا اور بقاء شخصیت کا علیحدہ انتظام فرمایا اور اسی میں سے یہ بھی ہے۔ یعنی بقاء شخصیت سے اور ''کیا ہم نے سونے کو راحت''
وجعلنا نومكم سباتاً ترجمہ: ''اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا'' آگے فرماتے ہیں کہ ہم نے فقط لیل ہی نہیں رکھی بلکہ دن بنادیا تاکہ اس میں معاش حاصل کرو۔ دیکھو! ہم نے ایسی ایسی نعمتیں پیدا کیں کیا ہم قیامت پر قادر نہیں ہیں بلکہ ضرور ہوں گے۔

تیسرا وعظ

(جو ۱۰ شوال ۱۳۱۵ھ کو کیرانہ میں ہوا)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بٰرکنا حولہ لنریہ من اٰیٰتنا ،انہ ھوالسمیع البصیر۔ (بنی اسرائیل:۱)

ترجمہ:"وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ کو شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلادیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں۔" یہ جو آیتیں میں نے پڑھی ہیں یہ آیتیں سورۃ بنی اسرائیل کی ہیں۔اس پہلی آیت میں اللہ جل جلالہ وعم نوالہ اپنی الوہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عبد ہونے کو ارشاد فرماتے ہیں۔دیکھئے کیا اچھا عنوان رکھا۔فرماتے ہیں: **سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ**

واقعی اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کا یہی کمال ہے کہ عبد نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی کمال ہے کہ عبد تھے۔آج کل کے تمام لوگ تو مبتلا ہیں ہی بلکہ جاہل صوفیاء بھی مبتلا ہیں۔اس امر میں اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کے ساتھ معاملہ اجیروں کا سا کرتے ہیں۔یعنی اگر نماز پڑھیں گے تو ثواب ملے گا ورنہ جہنم میں جائیں گے۔ایسے ہی اگر روزہ رکھیں گے تو ثواب ملے گا ورنہ جہنم میں جائیں گے۔ اجیروں کے درمیان میں اور عبد کے درمیان میں فرق ہے۔اجیر بخدمت معینہ ہوتے ہیں اور عبد کی خدمت معین نہیں ہوتی ہے۔دیکھئے کلام میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون

ترجمہ:"اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔"

یہاں پر "الا" نہیں فرمایا بلکہ "الا لیعبدون" فرمایا۔وجہ اس کی یہ ہے کہ عبد میں اور اجیر میں فرق ہے۔اجیر کی خدمت تو معین ہوتی ہے اور عبد کی کوئی خدمت معین نہیں ہوتی۔

پھر اجیروں میں بھی دو قسمیں ہیں۔ایک تو مثلاً دھوبی اگر کپڑا دھولایا تو اس کو ان کپڑوں کی اجرت دے دو گے اور اگر نہ لائے دھو کے تو اس کو اجرت نہیں دو گے اس کو مشترکہ کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مثلاً آپ نے کوئی شخص نوکر رکھا کپڑا سلوانے کے واسطے اور اس کی کچھ اجرت مقرر کردی۔اب اگر آپ اس سے کہیں گے کھانا پکاو۔ نہ وہ کبھی نہیں پکاوے گا۔ایسے ہی اگر آپ اس سے کہیں

کہ بستہ کچہری لے چل تو وہ کبھی نہیں لے جاوے گا اور کہے گا میں نے فقط کپڑا آپ کے سینے کی ملازمت کی ہے تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ وہ خدمت معینہ کر سکتا ہے اس کو اس کی اجرت ملے گی۔ اگر نہ آئے کپڑا سینے تو اجرت بھی نہیں ملے گی بخلاف غلام کے کہ اس کے جو کہے وہی کرے گا۔ اگر کہا اس سے کپڑا سیو، بہت اچھا اگر کہا اس سے کھانا پکا تو بہت اچھا۔ اگر کہے بستہ کچہری لے چل بہت اچھا یہاں تک کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ پاخانہ پھینک دے، پھینک دے گا۔ اگر نہ پھینکے تو سمجھ لینا عبودیت ناقص ہے اس کو بدل دینا چاہیے اور رکھنا نہ چاہیے اگر مولیٰ اس کو کچھ دے دے تو فقط اس کا تلطف ہے اور احسان ہے اور مہربانی ہے اس واسطے کہ غلام کا مولیٰ پر کچھ حق تو تھا ہی نہیں بخلاف اس اجیر کے اس کو اس کی اجرت ملے گی۔ یہاں سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا مرتبہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں۔

دو چیزیں تھیں ایک شقی دوسرے سعید۔ شقی تو اس کو کہتے ہیں ایک چیز بنائی ایک موضع ایک محل کے واسطے، وہ چیز اس موضع اور محل میں نہ صرف ہو بلکہ دوسرے میں صرف ہوئی اس کو شقی کہتے ہیں اور سعید اس کو کہتے ہیں۔ مثلاً ایک چیز بنائی ایک موضع اور ایک محل کے واسطے وہ چیز اس میں یعنی اس موضع اور محل میں صرف ہوئی، اس کو سعید کہتے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ آپ کتنے بڑے سعید ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس موقع اور محل کے واسطے بنایا آپ اس ہی میں صرف ہوئے۔ دیکھئے آپ نے شریعت کیسی (جامع اور عجیب و غریب) بنائی ہے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں ایک شخص تھا، وہ بہت عبادت کرتا تھا، دن رات نوافل کثرت سے پڑھتا تھا۔ ایک روز اس کی والدہ کا جی چاہا کہ میں اپنے لڑکے کو جا کر دیکھوں، وہ وہاں گئی، دیکھا کہ دروازہ بند ہے آوازیں دیں، وہ اس وقت نماز نوافل پڑھ رہا تھا، اس نے جی میں سوچا کہ جواب دوں یا نہ دوں، خیر جی میں یہ خیال کر کے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے، کچھ جواب نہ دیا، والدہ نے یہ بددعا دے کر کہ اللہ تعالیٰ تم کو رسوا کرے چلی گئیں جہاں پر وہ عبادت کیا کرتا تھا وہاں ایک عورت فاحشہ رہتی تھی اور ایک شخص اس عابد کا دشمن تھا، اس فاحشہ عورت کے اس سے لڑکا پیدا ہوا تو اس شخص نے اس عورت سے کہا کہ اس لڑکے کو فلاں بزرگ کی طرف منسوب کر دے اور کچھ دیتا گیا۔ اس نے لوگوں سے بھی کہا کہ لڑکا اس فلاں عابد کا ہے، لوگوں نے یہ بات سن کر ان پر چڑھائی کی اور جا کر اس کے مکان کو بالکل توڑ ڈالا اور ان کو پکڑا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ تو مجھے بچا، اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے کو زبان دی۔ اس نے کہا میں فلاں شخص کا ہوں، خیر اس کے بعد آپ فرماتے ہیں اگر وہ علم رکھتا ہوتا تو نماز نفل توڑ کر بولتا، کچھ حرج اور مضائقہ نہیں تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ان کی یہ کرامت دیکھ کر ان کا مکان اسی جگہ بنا دیا اور کہا آپ اس میں عبادت کیا کریں، اب آپ سے کوئی تعارض نہ کرے گا۔ اسی طرح سے حضور (صلی اللہ علیہ

وسلم) نے بہت سے قانون اور قاعدے بتائے ہیں۔ باعتبار شریعت کے اور باعتبار طبابت کے اور باعتبار مصالحت کے اور باعتبار بادشاہت کے کتب احادیث سے بخوبی معلوم ہوتے ہیں۔

اب آگے فرماتے ہیں: لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے لیلاً فرمایا ہے نہاراً نہیں فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ اوپر اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو بیان فرمایا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مقام عبدیت ہے۔ اب منظور ہوئی یہ بات کہ اس مقام کا اظہار ہو ساتھ ہی اس کے یہ بھی منظور ہوا کہ اخفاء بھی رہے اس واسطے لیلاً فرمایا' اس کے اندر اظہار بھی ہوا کسی قدر اور اخفاء بھی رہا۔ یہ وجہ ہے اس کے ارشاد فرمانے کی۔ آگے فرماتے ہیں: من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ

لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ کا عرش پر جانا کلام اللہ میں مذکور نہیں ہے' کلام اللہ میں اتنا ہے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے گئے۔ عرش پر جانا حدیثوں میں مذکور ہے۔ میری رائے میں یہ بات آتی ہے کہ اقصیٰ سے مراد لے لیا جاوے عرش یعنی اب کلام اللہ میں ابتداء اور انتہا مذکور ہوگئی۔ رہا یہ کہ مسجد اقصیٰ کا جانا وہ حدیثوں میں مذکور ہے' کلام اللہ میں مذکور نہیں ہے۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ صاحب! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: الذی بٰرکنا حولہ

مسجد اقصیٰ کے چہار طرف برکات ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے مزارات ہیں اور ہر طرح کی رونق ہے۔ اگر مسجد اقصیٰ سے مراد عرش لیا جاوے تو وہاں پر برکات کہاں ہیں (لیکن) وہاں پر بھی مسجد ہے اور برکت ہے۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ:

وتری الملٰئکۃ حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم

ترجمہ: ''اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوں گے اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے ہوں گے۔'' اور یہ سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ''القرآن یفسر بعضہ بعضاً'' اب کوئی قباحت لازم نہیں آئے گی۔ آگے فرماتے ہیں: لنریہ من ایاتنا

لنریہ کے اندر لام غایت کا ہے یعنی اس واسطے لے گئے تاکہ دکھلا دیویں حضورؐ کو اپنی آیات میں سے۔ من ایاتنا اور من تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے اور من بیانیہ بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی یا تو سب نشانیاں آپ کو دکھانے کے واسطے لے گئے تھے یا بعض دکھلانے کے واسطے جو آپ کے متعلق تھیں۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں: انّہ ھو السمیع البصیر

مفسرین نے کہا ہے کہ ھو کا مرجع سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میری رائے میں یہ آتا ہے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ معنی یہ ہیں بیشک وہی اللہ تعالیٰ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔